7 قدیم عشق

شاہدہ لطیف

تاریخی رومانی کہانیوں سے 7 دلچسپ کہانیوں کا انتخاب......جن کی بدولت ملکوں اور سلطنتوں کے جغرافیے تبدیل ہو گئے

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

7 قدیم عشق

شاہدہ لطیف

علم و عرفان پبلشرز
40-الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور
فون 042-7352332-7232336

PDF BY MANZOOR

نوٹ:

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق پبلشرز (علم و عرفان پبلشرز) محفوظ ہیں۔

ادارہ نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو kitaabghar.net پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کیلئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

PDF BY MANZOOR

فہرست

صفحہ نمبر		نمبر شمار
04	اپنی بات	
05	بنت عتبہ	۱۔
48	ملکہ خیزراں	۲۔
64	اُم سلمٰی	۳۔
91	شہزادی فلپائن	۴۔
130	سلطنت بیگم	۵۔
167	شہزادی ارمانوس	۶۔
233	ملکوتی	۷۔

PDF BY MANZOOR

اپنی بات

علم وعرفان پبلشرز کے چیف ایگزیکٹو گل فراز احمد رانجھ نے کہا" اصلاحی شاعری چھوڑ یئے اس وقت لوگوں کو صرف محبت کی ضرورت ہے، رومانوی کہانیاں اور صرف رومانس لکھیئے۔"

ہم نے کہا"تصوراتی کہانیاں؟" تو انہوں نے کہا" ہماری تاریخ عالم بھری پڑی ہے رومانوی سچی داستانوں سے، آپ تو ویسے بھی شہزادیوں میں دلچسپی رکھتی ہیں، ابھی آپ کا پیرس کا منظوم سفرنامہ آیا ہے،"برف کی شہزادی"۔

اور ہم سمجھ گئے کہ گل فراز صاحب ان تاریخی رومانس کو کھنگالنے کا کہہ رہے ہیں جن کی وجہ سے جغرافیے تبدیل ہو گئے۔ یہ تو ویسے بھی آسان بات ہے بہ نسبت اس کے کہ ہم تصوراتی خواب وخیال کی باتیں گھڑیں اور ماورائی کریکٹر تخلیق کریں۔

اور پھر جب ہم نے تاریخ اسلام کے اوراق پلٹے تو ہمیں اندازہ ہوا یہ تو ایک ٹکٹ میں سومزے والی بات ہوگئی۔ اس طرح جب ہم کسی حقیقی محبت کو فوکس کریں گے تو ایک طرف داستانوں، کہانیوں اور ناولوں کے شائقین ان سچے رومانس میں زیادہ لذت محسوس کریں گے تو دوسری طرف ہم انہیں اپنے تاریخ اسلام کے معرکۃ الاراء کارناموں سے روشناس کرا کے ان کے اسلامی تشخص کو ابھار کر ان میں جوش و جذبہ اور ولولہ تازہ پیدا کر سکیں گے۔

اب یہ فیصلہ قارئین کرام کا ہے کہ ہم اس میں کہاں تک کامیاب ہوئے ہیں۔

قلم اس کی عطا ہے جس نے دی الفاظ میں طاقت
مجھے لکھنے کی نعمت سے شناسائی عطا کی ہے

شاہدہ لطیف

092-51-2873033

0300-8565050

PDF BY MANZOOR

بنتِ عتبہ......ایک تعارف

بنت عتبہ ایک چلبلی حسینہ ایک ایسی حسینہ جو اپنے حسن کی وجہ سے مدینہ شریف میں بہت زیادہ مشہور تھی وہ نہ صرف حسن و جمال کا لاجواب پرتو تھی بلکہ اللہ تعالیٰ عزوجل نے اسے بہادری کے جوہر لازوال اور حسن شجاعت کے ان دیکھے تیروں سے بھی نوازا تھا۔ جس کے حسن کے سامنے بڑے بڑے شاہسواروں کے دل اور ہاتھ کانپ اٹھتے تھے جس کی ایک نظر دل کا سکون چھیننے کے لئے ہمہ وقت تیار رہتی تھی جس کی نگاہ الفت کے ہر چھوٹے بڑے بچے اور بوڑھے کا دل تڑپاتا تھا اور اگر وہ کسی سے دو بول بول لیتی تھی تو اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل کوئی چرا کر لے گیا ہے۔

میدان حسن کے علاوہ وہ ایک گھرداری کی بھی شہسوار تھی اور گھریلو کام کاج میں اس جیسی مہارت رکھنے والی کوئی عورت نہ تھی۔ بچپن سے الھڑ جوانی تک وہ ایک منہ زور گھوڑی کی مانند آزادانہ قلانچیں بھرتی رہی تھی اور اس کی شوخ و شنگ طنزیہ باتوں کے سامنے کسی میں یہ جرأت نہ تھی کہ وہ ان باتوں کا جواب ہی دے جائے بلکہ اس کی آواز میں کپکپاہٹ اور لڑکھڑاہٹ اس طرح پیدا ہو جاتی تھی کہ وہ باوصف زور بیان کے گونگوں کی مانند اس کا حسین چہرہ دیکھتا رہ جاتا۔

خلیفہ دوم کے زمانہ میں اس کا تایا جو کہ میدان دمشق میں سالار اعظم تھا اس کے بہادری کے کارنامے سن کر اس کے دل میں بھی اپنی بہادری کے جوہر دکھلانے کا شوق چرایا اور اسی شوق نے اس کے جذبہ جہاد کو وہ مہمیز بخشی کہ وہ اٹھتے بیٹھتے میدان جنگ میں پہنچنے کی شدید آرزو میں تڑپنے لگی اور والدین کو مجبور کرنے لگی کہ اسے خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے میدان جہاد میں کودنے کی فوری اجازت لے کر دی جائے گو کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ عورتوں کے کھلے انداز میں میدان جنگ میں جانے اور عام فوجیوں کے ساتھ گھل مل جانے کے سخت مخالف تھے لیکن اس حسینہ کے پرزور جذبوں کے سامنے انہیں بھی ہتھیار پھینکنے پڑے اور وہ اس کو بخوشی جہاد پر جانے اور لڑائی میں حصہ لینے پر مجبور ہو گئے۔

عتبہ کی بیٹی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ اس وقت نہ رہا جب اسے میدان جنگ میں اپنے والدین کے ہمراہ جانے کی اجازت مل گئی اور اس طرح دمشق کی مسلم فوجی چھاؤنی میں اپنے تایا کے پاس پہنچ گئی جہاں اس کی ملاقات ایک عرب شہسوار ابان بن سعید سے ہوئی اور پہلی ہی نظر میں دونوں ایک دوسرے پر فدا ہو گئے اور نظر الفت کے ایسے تیر دونوں کے دلوں میں کھبے کہ وہ ایک دوسرے کے بغیر جینا حرام سمجھنے لگے ایک طرف ان کی یہ حالت تھی تو دوسری طرف اسلامی روایات اور میدان جنگ کے بھی بہت کچھ تقاضے تھے جو ان کی ناتمام آرزو ملاپ کی تکمیل میں رکاوٹ تھے لیکن تائید ایزدی سے وہ دونوں شریک زندگی بن گئے۔ لیکن یہ ملاپ زیادہ عرصہ نہ رہ سکا اور مختصر عرصہ کے اندر ہی میدان جنگ کی تپتی بھٹی میں جھلس گیا اور بنت عتبہ کا محبوب اور پیارا شوہر اس آگ کی مانند رہا کہ جام شہادت نوش فرما گیا لیکن اسے ایک ایسا اعزاز عطا کر گیا کہ جس کی یاد رہتی زندگی تک اس کے سینہ میں تازہ رہی اور یہ اعزاز اس ''شہید'' لقب کا تھا جو اس کے پیارے محبوب نے دمشق کی فتح میں خون نچھاور کر کے حاصل کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

بنتِ عتبہ

کتاب گھر کی پیشکش http://kitaabghar.com

عتبہ بن ابی ربیعہ t مدینہ شریف کے ایک انصاری گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور عمر کے اس حصے میں تھے جب انسان کی عمر اس کو اپنی ذمہ داریوں کے نبھانے پر مجبور کرتی ہے ایک طرف ان پر کئی ذمہ داریاں تھیں تو دوسری طرف ان کی اکلوتی بیٹی جوان ہو چکی تھی اور زندگی کے اس حصے میں تھی کہ جب ذرا سی بھی لغزش انسان کو راہ حق سے بھٹکا دیتی ہے وہ رات دن اسی فکر میں رہتے تھے اسی لئے ان کی اس فکر کو دیکھتے ہوئے خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیق t نے ان کو شام کے محاذ پر بھیجنے سے انکار کر دیا جس کی وجہ سے ان کے اندر ایک عجیب سی افسوسناکی پھیل گئی تھی ان کی اب تک کی زندگی مسلسل جہاد میں گزری تھی کیونکہ جب سے انہوں نے اسلام قبول کیا تھا اور حضور نبی کریم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرتے ہوئے انہوں نے قسم کھائی تھی کہ جب تک ان کی جان میں جان ہے وہ راہ حق سے منہ نہ موڑیں گے اور کفار کے خلاف جہاد کرتے رہیں گے۔ اب یہی خلش انہیں کھا رہی تھی کہ اگر انہیں جہاد میں شرکت کی اجازت نہ ملی تو ان کا حضور رسول کریم ﷺ سے کیا ہوا عہد ٹوٹ جائے گا اور وہ روز آخر کو حضور نبی کریم ﷺ اور اللہ تعالیٰ کے حضور شرمندہ ہو جائیں گے کیونکہ خلیفہ وقت نے بڑی سختی سے انہیں کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ اپنی جوان بیٹی کے فرض سے سبکدوش نہ ہونگے اس وقت تک انہیں کسی بھی صورت میدانِ جنگ میں جانے اور لڑنے کی اجازت نہ دی جائے گی اور یہی فکر انہیں غم میں مبتلا کئے بیٹھی تھی کہ ان کا اب کیا ہوگا کیونکہ بنتِ عتبہ کے لئے ابھی تک کوئی رشتہ نہیں آیا تھا اور مستقل قریب میں بھی آنے کا امکان نہ تھا۔

حضور رسول کریم ﷺ کے دست مبارک پر بیعت کرنے اور اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ ایک رنگین مزاج نوجوان تھے لیکن ان کی رنگینی میں بھی پاکیزگی کا عنصر ہوتا تھا اس کی وجہ انصار کے گروہ خزرج سے ان کا تعلق تھا جو اپنی شرافت' پاکیزگی اور پارسائی کی وجہ سے پورے مدینہ میں سرفہرست تھا۔

ان کی اپنی شادی محبت کا شاخسانہ تھی اور ان کی محبوب بیوی کا نام ریا بنت قطریق سلمٰی انصاری r تھا جن کے بطن سے ان کی ایک ہی صاحب زادی بنتِ عتبہ (ثمن) ہوئی تھی۔

ان کا زیادہ تر وقت مختلف محاذوں پر جہاد کرتے گزرا تھا اس لئے وہ اب بھی میدان جنگ کو گھر پر ترجیح دیتے تھے چونکہ بہت بہادر جوان تھے اس لئے انہوں نے اپنی بیٹی کو بھی ہر قسم کی جنگی تربیت دی تھی جس کی وجہ سے وہ بھی فن جنگ میں اور بالخصوص تیراندازی میں بے حد مہارت حاصل کر چکی تھی۔

جہاد کا زمانہ، ہجری کا تیرھواں سال۔ عتبہ کی تیرانداز بیٹی کا سن بھی تیرہ سال تھا۔ اُٹھتی جوانی، ارمانوں اور آرزوؤں بھرا دل لیکن سپاہی زادی تھی۔ جوانی کی تمام اُمنگوں کے باوجود بنت عتبہ کی سب سے بڑی تمنا جہاد تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ میدان جنگ ہو۔ سامنے کفار کا لشکر ہو اور اُس

کے ہاتھ میں تیر کمان۔ اُس کا تیر اندازی کا شوق جنون کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔

ایک دن باپ سے بولی۔

''بابا۔ مدینہ میں جہاد لٹ رہا ہے۔ ہماری جھولی کیوں خالی ہے؟ خلیفہ محترم سے اجازت کیوں نہیں لیتے۔''

عتبہ نے محبت سے بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''بیٹی۔ کیا تم مجھے غافل سمجھتی ہو لیکن شاید یہ نعمت ہماری قسمت میں نہیں۔''

''کیوں؟'' بنت عتبہ ٹھنک کے بولی۔ ''کیا آپ ایک بہترین شمشیر زن نہیں اور میں۔ میرا ہر تیر تو نشانے کو خود ڈھونڈ لیتا ہے۔''

''اچھا اتنا گھمنڈ ہے اپنی تیر اندازی پر'' عتبہ ہنسے۔ ''موقعہ ملا تو ضرور تمہارے جوہر دیکھیں گے۔''

''بابا۔ یہی تو بہترین موقعہ ہے۔'' بنت عتبہ نے اپنی عقلمندی بگھاری۔ ''جنگ ختم ہوگئی تو ہم کیا کریں گے؟''

عتبہ سنجیدہ ہوگئے اور بولے۔

''بیٹی۔ میں نے خلیفہ سے درخواست کی تھی لیکن انھوں نے اجازت نہیں دی۔ ہاں یہ ضرور فرمایا کہ ایک شرط پر اجازت مل سکتی ہے۔''

بنت عتبہ خوش ہوگئی۔ ''کیا شرط لگائی ہے خلیفہ محترم نے۔ میں ہر شرط پوری کروں گی۔''

''ہاں بیٹی! شرط تم ہی کو پوری کرنی ہے۔ خلیفہ محترم نے فرمایا ہے کہ پہلے بیٹی کے فرض سے فارغ ہوجاؤ پھر جہاد پر جانا۔''

اور اس کے ساتھ ہی بنت عتبہ نے حیا سے گردن جھکا لی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

''بابا! آخر دوسری عورتیں بھی تو جہاد پر گئی ہیں۔ آپ خلیفہ محترم سے کہیں کہ میری بیٹی جہاد کو شادی پر ترجیح دیتی ہے۔ وہ ضرور مان جائیں گے۔''

عتبہ ''ہوں'' کہہ کر خاموش ہوگئے۔ جواب بھی کیا دیتے۔ لڑکی کا ٹھکانہ ماں کا سایہ یا سسرال کی چوکھٹ ہوتی ہے۔ ماں چار سال کی بچی کو چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ عتبہ پینتیس سال کے تھے۔ چاہتے تو دوسری شادی کر سکتے تھے لیکن بیٹی کی معصومیت پاؤں کی بیڑی بن گئی۔ وہ اپنا عیش تج کر کے بیٹی کی پرورش میں لگ گئے۔

بیٹی نے عتبہ کے دل میں شہادت کی آرزو اور جہاد کے شوق کی ایسی جوت جگائی کہ وہ ہر دم بے چین رہنے لگے۔ میدانِ جنگ سے کوئی قاصد آتا تو اُس کے پیچھے لگ جاتے۔ گھر بلا کر اُس سے لڑائی کے حالات سنتے پھر سوچتے وہ گھڑی کتنی مبارک ہوگی جب وہ مجاہدوں کے دوش بدوش جہاد میں حصہ لیں گے۔ ساتھ ہی وہ بیٹی کے لئے کسی معقول لڑکے کی تلاش میں بھی رہتے مگر مدینہ منورہ تو جیسے جوانوں سے خالی ہوگیا تھا۔ قریب قریب سب ہی جوان جوشِ جہاد سے سرشار ہوکر مختلف محاذوں کا رُخ کر چکے تھے۔ جو باقی تھے وہ بے چینی سے اپنی باری کے منتظر تھے۔ عتبہ نے کئی جوانوں سے بالواسطہ گفتگو کے ذریعہ اُن کا عندیہ معلوم کرنے کی کوشش کی۔ یہ نہیں کہ بنت عتبہ میں کوئی عیب تھا یا وہ خوبصورت نہ تھی۔ وہ ہزار دو ہزار میں بھی ایسی بیٹی نہ تھی۔ جس محفل میں بھی جاتی محفل چمک اُٹھتی۔ دوشیزائیں اُسے گھیر لیتیں اور اُس کی دوستی پر فخر کرتیں۔ مدینہ کے جوان بھی بنت عتبہ کے ساتھ شادی کے لئے تیار تھے لیکن جہاد کے اختتام پر۔

عتبہ کو جب مدینہ میں ناکامی ہوئی اور اُن کی دوڑ دھوپ کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو انھوں نے طائف جانے کا ارادہ کیا۔ طائف میں اُن کے بھائی رہتے تھے۔ وہ ضعیف العمر تھے۔ جہاد میں حصہ نہیں لے سکتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکرؓ نے انہیں جوانوں کی تربیت کا کام سونپا تھا۔ طائف میں ایک چھوٹی سی چھاؤنی تھی۔ جہاد پر جانے والے مجاہدین کو وہاں سے اسلحہ دیا جاتا اور نو جوانوں کو کچھ دن شمشیر زنی اور تیراندازی کی تربیت دی جاتی۔ عتبہ نے دراصل طائف جانے کا فیصلہ اس لئے کیا تھا کہ ممکن ہے کہ وہاں کوئی معقول رشتہ مل جائے تو وہ بیٹی کے فرض سے بری الذمہ ہو جائیں۔

بنت عتبہ کو باپ کی پریشانی کا پورا احساس تھا۔ وہ جانتی تھی کہ عتبہ بہر صورت محاذ پر جانے کے لئے بے چین ہیں لیکن اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ باپ کی پریشانی کس طرح دُور کرے۔ ایک دن عتبہ باہر سے آئے تو کچھ زیادہ ہی پریشان تھے۔

بنت عتبہ نے گھبرا کے پُوچھا۔

''بابا! خدا خیر کرے۔ آج آپ بہت پریشان ہیں۔''

''ہاں بیٹی!......'' عتبہ نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''سنا ہے ایک ملک شام کے محاذ پر ایک کمک بھیجی جا رہی ہے۔''

''پھر آپ خلیفۃ المسلمین سے جا کر ملئے۔'' بنت عتبہ نے فوراً کہا۔

''بیٹی میرا ارادہ ہے'' عتبہ کہتے کہتے رُکے۔

بنت عتبہ نے ذرا انتظار کیا۔ جب باپ کچھ نہ بولے تو اُس نے کہا۔ ''بابا میں آپ کے راستے کا پتھر بن گئی ہوں۔ آپ جو حکم دیں گے میں اُس پر عمل کرنے کو تیار ہوں۔''

عتبہ بولے۔

''بیٹی تم میری آنکھوں کا نور ہو۔ تمہاری فکر ضرور ہے لیکن پریشانی نہیں۔ ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے اگر تم بھی اُسے پسند کرو۔''

بنت عتبہ نے باپ کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''بابا جس بات سے آپ کے دل کو تسکین حاصل ہو اُس پر عمل کرنا میرا فرض ہے۔ مجھے آپ صرف حکم دیجیے۔''

''میں طائف جانا چاہتا ہوں بیٹی!......''

''تو اِس میں فکر کی کیا بات ہے۔''

''تم بھی میرے ساتھ چلوگی۔''

بنت عتبہ کو اور زیادہ خوشی ہوئی۔ طائف کے فوجی کیمپ کی اُس نے بڑی شہرت سنی تھی۔ تایا اور تائی سے بھی وہ بہت دنوں سے نہیں ملی تھی۔ اُس نے سوچا طائف جانا تو ایک پنتھ دو کاج ہوگا۔ عزیزوں سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور طائف کی چھاؤنی کی سیر بھی۔

بنت عتبہ نے کہا۔

''بابا یہ تو اور اچھی بات ہے۔ میں تایا اور تائی سے بہت دنوں سے ملنا چاہتی تھی۔''

باپ کی فکر قدرے کم ہوئی وہ بولے

''بس تو پھر تیار ہو جاؤ۔''

عتبہ یہ کہہ کر باہر چلے گئے اور بنت عتبہ تیاریوں میں لگ گئی۔

چوتھے دن شام کے وقت باپ بیٹی طائف پہنچے۔ عتبہ کے بھائی اور بھاوج کو اُن کے آنے کی بڑی خوشی ہوئی۔ بنت عتبہ کو سب سے زیادہ خوشی تھی۔ تایا کا گھر فوجی چھاؤنی کے ایک کونے پر تھا۔ شام ہونے کی وجہ سے وہ تربیت گاہ کا کوئی منظر نہ دیکھ سکی لیکن میدان کے چاروں طرف لگے خیموں سے اُس نے اندازہ لگایا کہ اِس میں خوش نصیب مجاہد رہتے ہیں۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ صبح ہوتے ہی وہ میدان کی سیر کو جائے گی اور مجاہدین کو تربیت حاصل کرتے ہوئے دیکھے گی۔

مہمانوں کے آنے سے گھر میں چہل پہل ہوگئی۔ تایا کی اپنی کوئی اولاد نہ تھی۔ عتبہ کی بیٹی کو وہ اپنی ہی بیٹی سمجھتے تھے۔ رات دیر تک سب جاگتے رہے۔ عتبہ بڑے بھائی سے میدانِ جنگ کی خبریں سنتے رہے اور بنت عتبہ تائی کو مدینہ کے حالات بتاتی رہی۔ طائف، مدینہ سے بہت زیادہ دور نہ تھا لیکن اِن کی آپس میں سالوں ملاقات نہ ہوتی۔ تائی، کرید کرید کر اپنی جاننے والیوں کے حالات پوچھتی رہیں اور بنت عتبہ ہنس ہنس کے ہر ایک کی تفصیل بتاتی رہی۔ تین کمروں کے اس مکان میں اتنی جگہ نہ تھی کہ کوئی راز کی بات کی جاسکتی۔ ایک کمرے میں اسلحہ خانہ، ٹوٹی پھوٹی تلواروں، نیزوں اور تیر کمانوں سے بھرا ہوا تھا۔ برابر کے دونوں کمرے رہائش کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ عتبہ، بھائی کے ساتھ ایک کمرے میں تھے دوسرے کمرے سے تائی بھتیجی کی باتوں کی صاف آوازیں آرہی تھیں۔ عتبہ، بھائی سے بیٹی کے بارے میں مشورہ کرنا چاہتے تھے لیکن ڈر یہ تھا کہ کہیں بھاوج یا بیٹی نہ سُن لیں۔ عتبہ مجبوراً اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ بیٹی کا ذکر کرنے کا انہیں موقعہ ہی نہ ملا۔ اُن کے بھائی باتیں کرتے کرتے ہی سو گئے۔

صبح بھی عتبہ کو بھائی سے گفتگو کا موقعہ نہ مل رہا تھا۔ بھائی کو میدانِ جنگ جانے کی جلدی تھی۔ بنت عتبہ نے تائی کو رات ہی اِس بات پر آمادہ کر لیا تھا کہ وہ تایا کے ساتھ مجاہدوں کی تربیت دیکھنے جائے گی۔ وہ تیار ہو کے تایا کے پاس پہنچ گئی۔ اب عتبہ بات کرتے تو کیسے۔ بیٹی سر پر سوار تھی۔

آخر عتبہ کو کہنا پڑا۔

''بیٹی تائی کے پاس جا کے بیٹھو۔ مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

بنت عتبہ کا چہرہ اُتر گیا۔ وہ تو میدان میں جانے کی خوشی میں پھولے نہ سمارہی تھی۔

تایا نے اُسے افسردہ دیکھا تو بولے۔

''تم کیوں پریشان ہو گئیں بیٹی۔ عتبہ بہت دن بعد آئے ہیں۔ ہم رات زیادہ دیر باتیں نہ کر سکے۔ ذرا دیر انتظار کرو۔ ابھی چلتے ہیں۔''

بنت عتبہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ یونہی کھڑی رہی۔

اِس وقت تائی نے دخل دیا۔

''بیچاری کو فوجی تربیت دیکھنے کا شوق ہے۔ آپ دونوں نے خواہ مخواہ اُسے جھڑک دیا۔''

تایا کو شاید تاؤ آ گیا کہ بنت عتبہ کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ وہ تیر کمان لٹکا کر آئی تھی اور اب اُسے روک دیا گیا تھا۔

انہوں نے فرمایا۔

''اچھا دل چھوٹا نہ کرو۔ تم میدان میں چلو۔ میں ابھی بات کر کے آتا ہوں۔''

بنت عتبہ خوش ہو گئی۔ وہ تائی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

تائی بولیں۔

''جاؤ بیٹی۔ ڈرکا ہے کا۔ ماشاءاللہ تم بھی تیرانداز ہو۔''

بنت عتبہ نے ہاتھ بڑھا کر تایا کی کمر سے تلوار کھینچ لی اور ہنستی ہوئی باہر نکل گئی۔

جوانی بذات خود ایک ''حُسن'' ہے اگر اِس حسن میں حسنِ خداداد شامل ہو جائے تو پھر اُس کا کیا کہنا۔ بنت عتبہ کو خدا نے حسین دل اور حسین شکل وصورت سے تو نوازا تھا۔ لیکن جب وہ میدان میں تلوار لہراتی، کاندھے سے ترکش کمان لگائے نکلی تو ایک قیامت بپا ہو گئی۔ عرب جوان جگہ جگہ ٹولیاں بنائے اسلحہ صاف کر رہے تھے کوئی تیر کی نوک درست کر رہا تھا تو کوئی نیزے کو سان دے رہا تھا۔ کسی کے ہاتھ میں تلوار تھی تو کوئی خنجر کی دھار پر انگلی پھیر رہا تھا۔ انہوں نے ایک حورارض کو اِس شان سے آتے دیکھا تو جو جس حال میں تھا اُسی حال میں دم بخود ہو کر رہ گیا۔ سب کی نظریں اِس حسین پیکر سے اٹک کر رہ گئیں۔

بنت عتبہ سب سے بے پرواہ، بڑی شانِ بے نیازی سے اُن کے درمیان سے گزرتی رہی۔ ایک جگہ چار چھ جوان تلواروں کو صیقل کر رہے تھے۔ بنت عتبہ اُن کے قریب سے گزری تو ایک نے دوسرے کو ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھ رہا ہے ابان''

ابان آہستہ سے بولا۔

''جب عورت کے ہاتھ تلوار آ جائے تو مردوں کو چوڑیاں پہن کر گھر میں بیٹھ جانا چاہیے۔''

ابان نے بہت ہی آہستہ سے کہا تھا لیکن یہ بات بنت عتبہ کے کان تک پہنچ گئی۔ وہ دس قدم اُن سے آگے نکل چکی تھی۔ یہ بات سُن کے بنت عتبہ رُکی اور پلٹ کر تیزی سے اُن کے پاس آ گئی۔ عرب جوانوں کے چہروں کا رنگ اُڑ گیا۔ ابان تو ایسا گھبرایا کہ صیقل کرنے والا تیر اُس کے ہاتھ سے گر گیا۔

بنت عتبہ نے ابان کے پاس پہنچ کر سخت لہجے میں پوچھا۔

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''ابان'' ابان نے گھٹی آواز میں جواب دیا۔

''کیا کہا تھا تم نے۔؟'' بنت عتبہ نے اور تیزی دکھائی۔

''جی۔ جی میں نے'' ابان نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ میں نے آپ سے تو کچھ بھی نہیں کہا۔''

بنت عتبہ، ابان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔

''تم بزدل ہو ابان۔ ایک عرب عورت کے سامنے اِس قدر گھبرا رہے ہو تو میدان میں جا کر کیا کرو گے؟''

ابان کو یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کی غیرت کو للکار دیا ہو۔

وہ اکڑ کے بولا۔

''ہاں۔ کہا تھا اور ٹھیک کہا تھا۔ عورت کے ہاتھ میں تلوار نہیں چوڑیاں اچھی لگتی ہیں۔''

بنت عتبہ کو ایسے جواب کی امید نہ تھی۔

بنت عتبہ حیران ہو کر اُسے دیکھنے لگی۔ کہاں تو گھبراہٹ کے مارے ابان کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی اور اب وہ اکڑ رہا تھا۔ پس وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''ابان!...... عورتیں، چوڑیاں ضرور پہنتی ہیں مگر جب میدان میں آتی ہیں تو اُن کے کاندھے پر ترکش اور ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے۔''

اٹھارہ سالہ نوجوان ابان للکارنے پر سامنے تو آ گیا تھا لیکن بنت عتبہ کی حاضر جوابی نے اُسے شرمندہ کر دیا۔ پھر اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے بولا۔

''تلوار صرف اُس ہاتھ میں اچھی لگتی ہے جو اُس کا استعمال جانتا ہو۔''

بنتِ عتبہ تلوار چلانے میں ماہر نہ تھی۔ اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔ پھر یہ ڈر تھا کہ اگر اس نے تلوار چلانے کا غلط دعویٰ کیا اور ابان نے اسے کہیں مقابلے کی دعوت دے دی تو پھر وہ کیا کرے گی۔

کچھ سوچنے کے بعد بنتِ عتبہ نے کہا۔

''میں نے تلوار چلانے کا دعویٰ نہیں کیا۔ میں تیر انداز ہوں۔''

''تیر انداز؟......'' ابان نے محسوس کیا کہ اس کے سامنے کھڑی دوشیزہ کچھ دب کر بول رہی ہے۔ اس سے اس نے فائدہ اٹھایا اور بڑھ چڑھ کے بولا۔

''آپ کو تیر چلانے کی کیا ضرورت؟'' اور وہ مسکرانے لگا۔

بنتِ عتبہ کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ کڑک کے بولی۔

''میں نہیں جانتی تھی کہ طائف کے جوان اتنے نامعقول ہوتے ہیں کہ وہ خواتین کی عزت کرنا بھی نہیں جانتے۔''

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ خاتون کا عرب کے کس علاقہ سے تعلق ہے؟''

''یثرب۔ مدینۃ النبی۔'' بنت عتبہ نے فخر سے سر اونچا کرتے ہوئے کہا۔

''یثرب'' ابان نے حیرت سے بنت عتبہ کو دیکھا پھر عاجزی سے بولا۔ ''قابلِ احترام خاتون!...... میں معافی کا خواستگار ہوں۔ مدینہ کی تو خاک بھی ہماری آنکھوں کا سرمہ ہے۔ میں سخت شرمندہ ہوں خاتون!......''

ابان نے کچھ اِس طرح عاجزی کا اظہار کیا کہ بنت عتبہ کو اپنے سخت لہجے پر افسوس ہونے لگا۔ وہ نرمی سے بولی۔

''آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں اپنے تلخ لہجے پر نادم ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک دزدیدہ نظر ابان پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی۔

ابان اُس کی مترنم آواز کے کیف میں ڈوبا ہوا تھا۔ بنت عتبہ جب جانے لگی تو چونک کے بولا۔

''کیا میں قابلِ احترام مدنی خاتون کا نام پوچھنے کی گستاخی کر سکتا ہوں۔''

بنت عتبہ کے رخسار، حیا سے گل رنگ ہو گئے۔ نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

''میرا نام ثمن ہے لیکن بنت عتبہ کے نام سے پکاری جاتی ہوں۔''

بنت عتبہ نے ایک لمحہ جواب کا انتظار کیا۔ پتہ نہیں اُسے کس طرح کے جواب کا انتظار تھا۔ ابان نے سوال کیا۔ اُس نے یہ جواب دے دیا۔ اب کس بات کا انتظار تھا۔ ابان اُس کے نام کی حلاوت میں کھویا ہوا تھا۔ ثمن بنت عتبہ۔ عتبہ کی بیٹی۔ یہ عتبہ کون ہیں۔ مدینہ کے کوئی رئیس معلوم ہوتے ہیں۔

ابان نے مزید کچھ نہ پوچھا اور بنت عتبہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ پھر بھی ایک بار دو جھجکتی نظریں اُٹھ کر آپس میں ٹکرا گئیں۔ نظریں کیا تھیں برق کی ایک آتش بار چکا چوند مانند بجلی کڑکیں اور ماہتاب دل کو گہنا گئیں۔ بنتِ عتبہ اِن نظروں کی تاب نہ لا سکی اور نقاب درست کرتی آگے بڑھ گئی۔ باتوں کے دوران اُس کے چہرے کا نصف جالی دار نقاب سرک گیا تھا۔ اُسے خیال گزرا کہ کہیں ابان نے اُس کا پورا چہرہ نہ دیکھ لیا ہو۔

''ہوں۔ دیکھ لیا ہو گا تو کیا ہے۔ میں ایسی بُری تو نہیں کہ لوگ انگلیاں اُٹھائیں۔'' بنت عتبہ اپنے دل کو سمجھاتی اور تسلی دیتی بڑے بڑے قدم اُٹھانے لگی۔ ایک طرف نیزے بازی کی مشق ہو رہی تھی دوسری طرف تیراندازی کا مظاہرہ جاری تھا۔ بنت عتبہ نے دوسری طرف کا رُخ کیا۔

بنت عتبہ کے جانے کے بعد ابان عجیب عجیب خیالوں میں کھو گیا۔ اُس کے دوست بڑی دلچسپی سے دونوں کی نوک جھونک سُن رہے تھے۔ جب ثمن چلی گئی تو انہوں نے ابان کو چونکایا۔

ایک نے کہا۔

''ابان۔ بڑی حاضر جواب لڑکی ہے۔ تمہارا منہ پھیر دیا۔''

دوسرے نے ٹکڑا لگایا۔

''ابان بیچارہ تو بس بغلیں جھانک کے رہ گیا۔''

تیسرے نے ابان کی حمایت کی۔ ''ابان نے بڑا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہماری تو آواز بھی نہ نکل سکی۔''

''میں کہتا ہوں اُسے تیر کمان کی ضرورت ہی نہیں'' ایک منچلے نے تبصرہ شروع کیا۔ ''وہ جدھر بھی نظر بھر کے دیکھ لےبس کشتوں کے پشتے لگ جاتے ہیں۔''

''نہیں دوست'' ابان ناگواری سے بولا۔ ''شریف لڑکیوں کے بارے میں ایسی باتیں نہیں کرتے۔ تم نے غور نہیں کیا۔ کس قدر بے خوفی سے گفتگو کر رہی تھی۔ یہ شریف لڑکیوں کی سب سے بڑی پہچان ہے۔''

پھر سب اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ کچھ دیر بعد انھوں نے چھاؤنی کے ناظم کو آتے دیکھا۔ ناظم اپنے چھوٹے بھائی عتبہ کو لئے میدان میں داخل ہوئے۔ عتبہ نے اپنی پریشانی سے بھائی کو آگاہ کر دیا تھا۔ شاید اس لئے وہ زیادہ سنجیدہ ہو گئے تھے۔ ناظم جس طرف سے گزرتے، زیرِ تربیت جوان انہیں سلام کرتے اور خوش آمدید کہتے۔ ناظم ہر جوان کو جواب دیتے اور اُس کے چہرے کو اس طرح غور سے دیکھتے جیسے اُس کے چہرے پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ رہے ہوں۔

ناظم صاحب چلتے چلتے ابان کے پاس آ کر رُک گئے۔ ابان نے ادب سے سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیا پھر ابان کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔ ابان گھبرا گیا۔ معاً اُسے گمان ہوا کہ کہیں بنت عتبہ نے اُس کی شکایت تو نہیں کر دی۔ ابان ابھی اِس گمان پر غور کر ہی رہا تھا کہ اُس کے کان میں آواز آئی۔

''ابان میرے ساتھ تو آؤ۔''

ابان کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُس کا گمان یقین میں بدل گیا۔ ضرور بنت عتبہ نے شکایت کی ہے۔ جبھی ناظم صاحب، اُسے اپنے ساتھ بلا رہے ہیں۔ ابان کا خوف کے مارے خون خشک ہونے لگا۔ اُسے بنت عتبہ پر سخت غصہ آیا۔ بات تو اُس نے شروع کی تھی۔ میں نے کیا کہا تھا۔ ویسے اپنے آپ کو مدینہ کا کہتی ہے اور عادت کیا بُری پائی ہے۔ میں نے تو معافی بھی مانگ لی تھی پھر بھی شکایت کر دی۔ دل کی اچھی نہیں صرف صورت سے کیا ہوتا ہے لڑکی کی صورت نہیں سیرت دیکھی جاتی ہے۔ میں صاف کہہ دوں گا کہ بات اُس نے شروع کی تھی۔ ابان یہ سوچتا ہوا ناظم کے پیچھے چلتا رہا۔

تیر بازی کے میدان میں پہنچ کر ناظم صاحب رُک گئے۔

وہ عتبہ سے بولے۔

''یہ ابان ہے۔ بہت ہی شریف جوان۔ اِن کے باپ بھی میرے شاگرد رہ چکے ہیں۔''

عتبہ نے دلچسپی سے ابان کو دیکھا۔ ابان نے ادب سے عتبہ کو سلام کیا۔ ناظم صاحب کی تعریف سے اُس کے دل کو بہت اطمینان ہوا۔

پھر ناظم صاحب نے عتبہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''بیٹے ابان، یہ ہیں میرے چھوٹے بھائی عتبہ۔ جہاد کا شوق ہے لیکن ابھی تک اجازت حاصل نہیں ہوئی۔''

عتبہ کے نام پر ابان کے کان کھڑے ہوئے۔ اُس نے ادب سے پُوچھا۔

''یہ محترم یثرب، مدینۃ النبی سے تو تشریف نہیں لائے؟''

''ہاں بیٹے۔ مدینہ سے آئے ہیں'' ناظم پیار سے بولے ''مگر تمہیں کیسے معلوم ہوا۔ کیا تم پہلے مل چکے ہو؟''

''نہیں نہیں۔ ابان گھبرا گیا۔'' میں نے اندازہ لگایا تھا۔''

اندازہ کیا۔ ابان کو یقین ہو گیا کہ یہ بزرگ وہی ہیں جن کی صاحبزادی ابھی تو اس کا دل چرا کر لے گئی ہے۔ پھر ناظم صاحب نے اُس کے خیال کی تصدیق کر دی۔

انہوں نے کہا۔

''عتبہ اپنی بیٹی کے ساتھ آئے ہیں۔ دونوں کے دل ''شوق جہاد'' سے بھرے ہوئے ہیں''

ابان کے دل میں اگر کوئی شبہ تھا بھی تو وہ ناظم صاحب کی وضاحت سے دُور ہو گیا۔

ناظم صاحب، عتبہ اور ابان کو لئے اُس طرف چلے گئے جہاں تیراندازی کی مشق ہو رہی تھی۔ ابان کی نظروں نے دُور ہی سے بنت عتبہ کو اِس مجمع میں تلاش کر لیا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ لوگ قریب پہنچے تو انہیں دیکھ کر بنت عتبہ بھاگتی ہوئی اُن کے پاس چلی آئی۔ اُس کے ہاتھ میں کمان تھی اور وہ بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

بنت عتبہ نے قریب پہنچتے ہی کہا۔

''تایا جان! میں نے چار تیر چلائے اور چاروں ہی ٹھیک نشانے پر بیٹھے'' یہ کہتے ہوئے اُس کی نظر ابان پر پڑی۔ بنت عتبہ ٹپٹا گئی۔ گھبرا گئی۔ حیا کا پسینہ اُس کے رخساروں پر پھوٹ پڑا۔

ناظم نے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا۔

''کیوں نہیں۔ ہماری بیٹی بہترین تیرانداز ہے۔ ضرور نام پیدا کرے گی اِس فن میں'' پھر وہ ابان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''بیٹی یہ ہے ابان۔ جس طرح تو تیراندازی میں ماہر ہے اُسی طرح شمشیر زنی میں اس کا جواب نہیں۔ خدا نے اِسے حوصلہ اور شجاعت بھی ایسی ہی دی ہے۔''

بنت عتبہ نے کن انکھیوں سے ابان کو دیکھا۔ ابان کی نظریں اُسی طرف تھیں۔ یوں نظروں کا یہ دوسرا ٹکراؤ تھا۔

ابان نے حوصلہ کیا۔ بولا۔

''میں بنت عتبہ سے مل چکا ہوں''

''کہاں؟'' ناظم صاحب گھبرا گئے۔ انہوں نے مشکوک نظروں سے بنت عتبہ کو دیکھا۔

بنت عتبہ کیوں خاموش رہتی۔ اُس نے بھی اُسی حوصلہ کا اظہار کیا۔

''جی ہاں تایا جان!...... میں میدان میں آئی تو سب سے پہلے اِن کا ہی سامنا ہوا۔ تلوار کی دھار دیکھ رہے تھے''

''اچھا اچھا۔ یہ تو بہت اچھا ہوا'' ناظم صاحب بھی یہی چاہتے تھے۔ انہوں نے مسکرا کے عتبہ کی طرف دیکھا۔

''تایا جان۔ آیئے میں اپنا نشانہ دکھاتی ہوں'' بنت عتبہ نے ناظم صاحب کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

''میرے لئے کیا حکم ہے۔ میں یہیں ٹھہروں؟'' ابان نے شوخ نظروں سے بنت عتبہ کو دیکھتے ہوئے جھجکتے انداز میں کہا۔

ناظم صاحب نے بنت عتبہ کو اس طرح دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ ابان کو بھی دعوت دو۔

بنت عتبہ آہستہ سے بولی۔

''تیراندازی کا شوق ہو تو انہیں بھی بلا لیجئے''

ابان کا دل تو چاہا کہ کہے۔ آپ کی تیراندازی سے زیادہ آپ کے تیر کھانے کا شوق ہے لیکن وہ خاموش ہو کر اُن کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

نشانہ گاہ میں لکڑی کے موٹے ستون پر ''نشان'' بنا ہوا تھا۔ ایک بڑا دائرہ۔ اُس کے اندر بتدریج چھوٹے چھوٹے دائرے۔ سب کے بیچ میں ایک 'نقطہ' اصل نشانہ یہی نقطہ تھا۔ تیراندازوں کی مشق جاری تھی۔ نشانہ، تیراندازوں کی زد پر تھا۔

ناظم صاحب نے یونہی بات شروع کی۔

انہوں نے ابان سے پُوچھا۔

''اچھا ابان۔ یہ تو بتاؤ سب سے مشکل نشانہ کس چیز کا ہوتا ہے؟''

ابان نے ایک لمحہ دماغ پر زور دیا پھر بولا۔

''محترم! ستون پر بنا ہوا نشان اپنی جگہ جامد ہے۔ اُس میں کوئی حرکت نہیں۔ اُسے نشانہ بنانا میرے خیال میں زیادہ مشکل نہیں''

بنت عتبہ کو غصہ آ گیا۔ وہ سمجھی ابان نے جان بوجھ کے اُس کا مذاق اڑایا ہے۔

وہ چڑ کے بولی۔

''تایا جان۔ میرے خیال میں یہ جواب درست نہیں۔ اگر اِس ننھے نقطہ پر نشانہ لگانا آسان ہے تو مشکل نشانہ کونسا ہے؟''

''تم ہی اِس کا جواب دو بیٹی'' ناظم صاحب ہنستے ہوئے بولے۔

بنت عتبہ پریشان ہو گئی۔ اُس نے تو اپنے خیال میں ابان کے اعتراض کا منہ توڑ جواب دیا تھا لیکن اب وہ اپنے جواب میں خود ہی اُلجھ کر رہ گئی۔ ابان اُس کی الجھن اور پریشانی پر مسکرانے لگا۔ بنت عتبہ کی نظر اُس پر پڑی تو وہ جل کر رہ گئی۔ ذرا دیر سوچنے کے بعد بنت عتبہ نے جواب دیا۔

''تایا جان میرے خیال میں کسی آنکھ کا نشانہ باندھنا سب سے مشکل ہوتا ہے''

''یہ جواب نامکمل ہے بزرگ محترم'' ابان نے فوراً اعتراض جڑ دیا۔

اب تو بنتِ عتبہ کا غصہ کے مارے بُرا حال ہو گیا۔ اُس نے قہر آلود نظروں سے ابان کو دیکھا۔ ابان کو اِن نظروں پر بڑا پیار آیا۔

ناظم صاحب نے ابان سے سوال کیا۔

''بنت عتبہ کا جواب نامکمل ہے تو تم اِسے مکمل کر دو''

ابان نے اندازہ لگالیا کہ اب یہ چھیڑ چھاڑ مہلک صورت اختیار کر سکتی ہے بس اس نے مسکین صورت بنا کر کہا۔

''محترم ناظم صاحب۔ آنکھ اس نقطے سے بڑی ہوتی ہے اس پر نشانہ لگانا مشکل نہیں لیکن میرے خیال میں بنتِ عتبہ یہ کہنا چاہتی ہیں کہ میدان جنگ میں جب فوجیں آپس میں دست و گریباں ہوں اور کسی شے کو قرار نہ ہو اس وقت متحرک دشمن کی آنکھ کو نشانہ بنانا واقعی سب سے مشکل ہے۔ میرا خیال ہے بنتِ عتبہ یہی کہنا چاہتی تھیں۔

''جی تایا جان! میرا یہی مطلب تھا۔'' بنتِ عتبہ جلدی سے بول پڑی۔ ابان کی باتوں سے اس کے تن بدن میں جو آگ سی لگ گئی تھی وہ ایک دم ٹھنڈی ہوگئی۔ اس نے ابان کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے وہ سمجھوتہ کرنا چاہتی ہو۔

عتبہ اور ناظم صاحب کو ابان کی ذہانت کی داد دینا پڑی۔ عتبہ نے سوچا یہ نوجوان ایک روز شجاعت اور بہادری کی دنیا میں نام پیدا کرلے گا۔ انھوں نے اس کا اظہار مناسب سمجھا۔

بولے۔

''ماشاءاللہ۔ لشکرِ اسلام میں جب تک ابان جیسے زیرک جوان موجود ہیں۔ ہمارا جھنڈا ہر میدان میں بلند رہے گا۔''

ابان کا سر فخر سے بلند ہوگیا۔ اس نے چور نظروں سے بنتِ عتبہ کو دیکھا۔

بنتِ عتبہ آسمان پر اڑتے چند پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔ یہ پرندے اس کی بائیں جانب سے اُڑ رہے تھے۔ جب پرندے بنتِ عتبہ کے سر سے گزر کر دائیں جانب چلے تو اس نے جلدی سے کمان کھینچی اور ترکش سے تیر کھینچتے ہوئے بولی۔

''تایا جان دیکھئے تیسرا پرندہ۔''

سب کی نظریں اوپر اٹھ گئیں۔ پرندے آگے پیچھے تیزی سے اُڑتے گزر رہے تھے ان کی بلندی بھی کافی تھی۔ سب کی نظریں اوپر تھیں کہ ''زوں'' کی آواز کے ساتھ تیر بنتِ عتبہ کی کمان سے نکلا اور دوسرے ہی لمحے تیسرے نمبر کا پرندہ تیر میں پیوست ہو کر نیچے گرتا دکھائی دیا۔

''سبحان اللہ'' ناظم کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ انھوں نے آگے بڑھ کر بڑی محبت سے بنتِ عتبہ کو اپنے سینے سے لگالیا۔

اس وقت ابان کا دل بھی چاہا کہ وہ بنت عتبہ کی اس بے مثال تیراندازی کی تعریف کرے لیکن بزرگوں کی موجودگی نے اس کی زبان بند رکھی۔

چھاؤنی سے واپسی کے بعد بنتِ عتبہ قدرے خاموش خاموش رہنے لگی اس کی حاضر جوابی کو شاید گہن لگ گیا تھا اور بات از حد تشویش دہ تھی اس کی تائی کی جہاندیدہ آنکھوں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہ سکی اور انہوں نے بنتِ عتبہ سے مختلف انداز میں سوال جواب کر کے اصل بات کا پتہ چلا لیا کہ بنتِ عتبہ مرض عشق میں مبتلا ہوگئی ہے۔ انہوں نے اس کا اظہار اپنے شوہر سے کیا تو وہ بھی قدرے پریشان ہوگئے انہوں نے کافی سوچ بچار کے بعد ابان کا حال جاننے اور پھر کسی طرح اسے ٹٹولنے کی بات کی۔

دوسرے دن تایا نے کسی بہانے سے ابان کو اپنے پاس بلایا اور باتوں باتوں میں ابان کی ساری کیفیت جانچ لی ان پر یہ عقدہ کھلا کہ آتش عشق صرف یکطرفہ نہیں ہے بلکہ دوطرفہ ہے۔

دونوں ہی اس آتش میں بری طرح جھلس رہے ہیں اور دونوں کی کیفیات ایک دوسرے سے مختلف نہیں ہیں بہر حال وہ جہاندیدہ شخص تھے انہوں نے ابان کو رخصت کرنے کے بعد عتبہ سے بات کی تو وہ اس رشتہ کے لئے قدرے تذبذب کے بعد راضی ہو گئے۔

ناظم صاحب نے ابان کو بلا کر کہا۔

''ابان! اب تم جا کے اپنا کام کرو اور ہاں آج شام تم اپنے والد کو میرے پاس ضرور بھیجنا۔''

ابان سلام کر کے واپس ہوا۔ اس کے دل میں گدگدی سی ہو رہی تھی۔

ناظم صاحب اسے اپنے ساتھ کیوں لائے تھے؟

اباجان کو انہوں نے کیوں بلایا ہے؟

یہ دونوں سوال دن بھر اسے پریشان کرتے رہے۔ اس کے دوستوں نے اسے بہت کریدا لیکن اس نے زبان نہ کھولی اور صاف ٹال گیا۔

شام کو وہ اپنے باپ کے پاس پہنچا اور انہیں ناظم صاحب کا پیغام پہنچایا۔ اس کے والد ناظم صاحب کا پیغام سنتے ہی ملاقات کے لئے جانے کو تیار ہو گئے۔ وہ ایک عرصہ سے ناظم صاحب سے نہ ملے تھے۔ انہوں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا۔

کیمپ کے میدان میں اور وہاں سے واپس آنے کے بعد دونوں بھائیوں میں ابان کے بارے میں کافی گفتگو ہوئی۔ عتبۂ ابان کی طرف سے بالکل مطمئن تھے۔ ناظم صاحب کو بھی ابان بہت پسند تھا۔ اب مسئلہ ابان اور اس کے والد کی رضامندی کا تھا۔ ناظم صاحب اس سلسلے میں بھی مطمئن تھے۔

ابان کے والد نماز مغرب کے بعد ملاقات کے لئے آئے۔ ناظم صاحب ان سے بڑے تپاک اور محبت سے ملے پھر ناظم نے عتبہ سے ابان کے والد کا تعارف کرایا اور اشارے سے انہیں دوسرے کمرے میں بھیج دیا۔

ابان کے والد نے بڑے ادب سے پوچھا۔

''قبلہ و کعبہ! فرمایئے آپ نے مجھے کیوں یاد فرمایا ہے؟ میں دل و جان سے آپ کی ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔''

ناظم صاحب نے بے تکلفی سے کہا۔

''بھئی جب تم میرے شاگرد تھے تو تم نے میری بات کبھی نہیں ٹالی تھی۔ اُمید ہے کہ اب بھی تم اسی جذبہ کی لاج رکھو گے۔''

''استادِ محترم! آپ کیا فرما رہے ہیں؟'' ابان کے باپ نے ادب سے جواب دیا۔ ''بات ماننا کیسا' آپ حکم دیجئے۔ میں بسر و چشم تعمیل کے لئے حاضر ہوں۔''

ناظم صاحب پہلے مدرسے میں پڑھاتے رہے تھے۔ اب فوجی تربیتی کیمپ کے ناظم تھے۔ ہمیشہ حکم ہی چلاتے رہے تھے لیکن یہ بھتیجی کا معاملہ تھا۔ وہ کہتے ہوئے جھجک رہے تھے۔

ابان کے باپ نے انہیں خاموش دیکھ کر کہا۔

''محترم ناظم صاحب! میں شرم سے کتنا جارہا ہوں۔ خدارا مجھے حکم دیجئے آپ کیا چاہتے ہیں۔ کیا خواہش ہے آپ کی؟''

ناظم صاحب آہستہ سے بولے۔

''میں ابان کی شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

''لیجئے۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔'' ابان کے والد خوش ہوتے ہوئے بولے۔

''ابان جیسے میرا بیٹا ہے ویسے ہی آپ کا بھی ہے۔ مجھے تو خوشی اس بات کی ہے کہ آپ کو ابان کا بھی اسی طرح خیال ہے جیسے آپ مجھ پر مہربان تھے۔''

ناظم صاحب نے جھجکتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

''لڑکی تو میری نظر میں ہے اور مجھے پسند بھی ہے۔''

''یہ تو اور خوشی کی بات ہے استاد محترم''۔ ابان کے والد نے جواب دیا۔

''آپ کی پسند اور میری پسند الگ تھوڑی ہو سکتی ہے۔ بس سمجھئے رشتہ طے ہو گیا۔ امید ہے کہ ابان بھی رضامند ہو جائے گا۔''

ناظم صاحب مسکرائے۔

''ابان کی رضامندی سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ شرعی حیثیت سے بھی لڑکے اور لڑکی کی پسند معلوم کرنا ضروری ہے۔''

ابان کے والد کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

''لڑکی والوں سے کیا آپ نے بات کر لی ہے اور کیا ابان کو انہوں نے دیکھ لیا ہے؟''

ناظم صاحب نے کہا۔

''ارے بھائی لڑکی والوں کی تم فکر نہ کرو۔ لڑکی والا تو میں ہوں۔ میرے بھائی کی بچی ہے۔ وہی بھائی جس سے تم ابھی ملے تھے۔''

''پھر تو یہ گھر کی بات ہوئی۔'' ابان کے والد نے کہا۔ ''میں آج ہی ابان سے پوچھ لوں گا۔ آپ کا تو وہ یوں بھی بہت احترام کرتا ہے۔''

ابان کے والد کے رخصت ہونے کے بعد ناظم صاحب نے عتبہ کو بلوایا۔

''مبارک ہو عتبہ۔ یہ مسئلہ تو حل ہوتا دکھائی دیتا ہے۔''

ناظم صاحب نے نوید دی۔

''ابان کے والد نے فوراً ہاں کر لی۔ امید ہے کہ کام بن جائے گا۔ اب تم فرض سے بھی آزاد ہو جاؤ گے اور تمہاری جہاد میں حصہ لینے کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔''

عتبہ کو جیسے اطمینان نہ ہو رہا تھا۔ انہوں نے پوچھا۔

''بھائی جان! کیا آپ کو امید ہے کہ یہ سب کچھ بالکل ایسے ہی ہو جائے گا جیسے آپ سوچ رہے ہیں؟''

''ارے اب شبہ کس بات کا ہے؟'' ناظم صاحب نے سمجھایا۔ ''انشاء اللہ تعالیٰ ابان اور ثمن کی شادی ضرور ہوگی۔''

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے!'' عتبہ نے کہا اور خاموش ہو گئے لیکن پتہ نہیں ان کا دل اب بھی کیوں مطمئن نہ تھا۔
بنتِ عتبہ کو صبح ہی شبہ ہو گیا تھا کہ ابان کے والد کو ضرور کسی خاص وجہ سے بلایا گیا ہے۔ گھر پہنچ کے عتبہ نے کچھ اشاروں کنایوں میں بھی اسے سمجھایا۔ بنتِ عتبہ کو جب معلوم ہوا کہ ابان کے والد رضامند ہو گئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئی ابان نے اسے پہلی ہی ملاقات میں متاثر کر لیا تھا۔

دوسرے دن جب ابان کے والد جواب لے کر آئے تو ناظم صاحب کے پاس بیٹھے تھے۔ عتبہ نے اٹھ کر اندر جانا چاہا مگر ابان کے والد نے انہیں بڑے متانت سے کہا۔

''بھائی عتبہ میرے لئے اس سے بڑھ کر اور کیا خوشی ہو سکتی ہے کہ میں آپ کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر اپنے گھر لے جاؤں۔ ابان بھی اسے اپنے لئے ایک بڑا اعزاز سمجھتا ہے۔ اس نے آپ کی بیٹی کی تیراندازی کا مظاہرہ بھی دیکھا ہے۔ وہ بنتِ عتبہ کی صورت، سیرت اور فن کا بھی مداح ہے۔ شادی کا بھی خواہش مند ہے لیکن اس نے شادی کے لئے ایک شرط رکھی ہے۔ اس کی بات اس قدر معقول ہے کہ میں اسے قائل نہ کر سکا۔''

عتبہ اور ناظم صاحب کے چہرے پر آئی ہوئی خوشی افسردگی میں بدل گئی۔

ناظم صاحب نے سنجیدگی سے کہا۔

''ابان کی طبیعت سے میں بھی واقف ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس نے کوئی غلط شرط لگائی ہو گی کہ اسے پورا کیا جائے۔''

ابان کے والد نے جواب دیا۔
''محترم! شاید میں نے شرط کا لفظ غلط استعمال کیا ہے۔ دراصل ابان نے اپنی ایک مجبوری کا اظہار کیا ہے۔ ابان کہتا ہے کہ اس کے پیر، جہاد کی رکاب میں ہیں اور سر پر شہادت کا کفن بندھا ہے۔ نہ معلوم کب محاذ پر جانا پڑے۔ ایسی صورت میں ''جہاد'' میرے لئے فرض ہے بلکہ مقدم ہے۔''

ناظم صاحب تو سن کر سوچ میں پڑ گئے لیکن عتبہ نے فوراً کہا۔
''سبحان اللہ۔ ابان کے کیا پاکیزہ خیالات ہیں لیکن اس سلسلے میں یہ عرض ہے کہ میری بیٹی بھی جہاد کی خواہش مند ہے۔ اگر شادی کے بعد دونوں میاں بیوی شریکِ جہاد ہوں تو شاید زیادہ اچھا ہو۔''

''محترم عتبہ۔'' ابان کے والد بولے۔ ''مجھے معلوم ہے کہ شادی تو میدان جنگ میں بھی ہوتی ہے۔ میں نے ابان کو یہ بات سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے کہا کہ میں ایک باسلیقہ لڑکی کو کچھ دن کا عیش دے کر اسے ہمیشہ کے لئے سوگوار نہیں کرنا چاہتا۔ اس نے یہ ضرور وعدہ کیا ہے کہ اگر اسے شہادت نصیب نہ ہوئی اور وہ ایک سرخرو غازی کی طرح واپس آیا تو شادی صرف بنتِ عتبہ ہی سے کرے گا اگر انتظار کیا جا سکے تو وہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔''

عتبہ اور ناظم صاحب دونوں ہی لاجواب ہو گئے۔ جہاد کی مخالفت کر کے خدا اور رسول ﷺ کی نظروں میں گرنے کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔
عتبہ دل گرفتہ سے اٹھ کر بیٹی کو ابان کے فیصلے سے آگاہ کرنے لگے۔ بنتِ عتبہ دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ عتبہ اس کے سامنے جا کر چپ

چاپ مجرموں کی طرح کھڑے ہو گئے۔

بیٹی نے پوچھا۔

''بابا آپ افسردہ کیوں ہیں؟''

عتبہ بولے۔

''بیٹی! ابان کا جواب تم تک پہنچانے کی مجھ میں ہمت نہیں۔''

''اس کی ضرورت بھی نہیں بابا۔'' بنتِ عتبہ نے سنبھل کر جواب دیا۔ ''میں نے ابان کا فیصلہ سن لیا ہے۔''

''سن لیا ہے تم نے؟'' اور عتبہ بیٹی کا منہ دیکھنے لگے۔

''ہاں۔ بابا میں نے سب کچھ سن لیا ہے۔'' بنتِ عتبہ نے کہا۔ ''ابان نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے۔ وہ شوقِ شہادت سے سرشار ہیں۔ انہیں روکنا سخت گناہ ہوگا۔ اس دنیا کی عشرت تو صرف دوروزہ ہے اور وہ ابدی مسرت کے متلاشی ہیں۔ وہ قطعی سیدھے راستے پر چل رہے ہیں مجھے کوئی افسوس نہیں۔ میں ان کا عمر بھر انتظار کروں گی۔

☆ ☆ ☆

اردو ٹائپنگ سروس

اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اُردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر سکین کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے یا
☆ اپنی تحریر رومن اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیج دیجئے یا
☆ اپنا مواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کر دیجئے یا
☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھی بھیجا جا سکتا ہے

اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ای میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادائیگی کے طریقہ کار اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540

ای میل: harfcomposers@yahoo.com

ویب سائٹ : http://pktypist.com

خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے زمانہ میں کچھ لوگوں نے زکوٰۃ دینا بند کر دی تھی اور کچھ لوگ اسلام سے منحرف ہو گئے تھے لیکن عزم صمیم کے سامنے کسی کی ایک نہ چلی اور ایک ایک کر کے تمام فتنے دم توڑ گئے۔ فتنۂ ارتداد اور جھوٹے نبیوں کے خاتمے کے بعد خلیفۃ المسلمین نے روم اور شام کی طرف توجہ کی۔ وہاں کے حالات کے پیش نظر آپ نے چار لشکر ترتیب دیئے اور انہیں حمص، فلسطین، دمشق اور اُردن روانہ کیا۔

مجاہدین کے ان لشکروں پر عرب کے چار نامور سردار مقرر کئے گئے تھے۔ ایک لشکر حضرت ابوعبیدہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کی زیر کمان تھا۔ انہوں نے جابیہ پہنچ کر اپنا مورچہ لگایا۔ یزید بن ابوسفیان بلقا پہنچے۔ شرجیل بن حسنہ بصرہ میں خیمہ زن ہوئے اور عمرو بن عاص وادی عربہ میں داخل ہوئے۔ اس طرح مسلمان فوجوں نے ملک شام اور ارض روم کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ حضرت خالد بن ولید ؓ پہلے ہی ایرانیوں کو پیہم شکستیں دیتے ہوئے حیرہ اور فراض تک پہنچ چکے تھے۔

رومیوں اور شامیوں نے اپنے آپ کو چاروں طرف سے گھرا ہوا دیکھا تو وہ قیصر روم شہنشاہ ہرقل کے دربار میں فریاد لے کر گئے اور مسلمانوں سے مقابلے کے لئے درخواست کی۔ شہنشاہ روم بڑا جہاندیدہ تھا۔ اس کے کانوں میں مسلمانوں کی ایران میں فتوحات کی خبریں پڑ چکی تھیں۔ وہ مسلمانوں کے ''جوش جہاد'' اور سرفروشی سے بہت خائف تھا اور جنگ کے لئے آمادہ نہ تھا۔ اس نے اپنے سرداروں پر زور دیا کہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کے بجائے انہیں کچھ لے دے کر صلح کر لی جائے۔ ہرقل کو شاید اپنی شکست کا پہلے ہی یقین ہو گیا تھا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ مسلمانوں سے جنگ کرنے کا مطلب ہے کہ ہمیں شام اور روم کے اخراج سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔

رومی اور شامی سردار اگر شہنشاہ ہرقل کا مشورہ مان لیتے تو شاید یہ جنگ رک جاتی لیکن وہ تو جنگ پر بضد ہوئے اور ہرقل کو مجبور ہو کر مسلمانوں کے خلاف صف آرا ہونا پڑا۔ ہرقل اس وقت بیت المقدس میں تھا۔ وہ وہاں سے حمص آیا اور لشکر اکٹھا کرنا شروع کیا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ اسلامی لشکر چار حصوں میں تقسیم ہے تو اس نے بھی اپنے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا اور چار فوجیں بنا کر مسلمانوں کے مقابلے پر بھیجیں۔

ہرقل نے اپنے بھائی تذارق کو نوے ہزار فوج کے ساتھ عمرو بن عاص کے مقابلے پر، پچاس ہزار فوج کے ساتھ جرجیہ بن تودر کو یزید بن ابی سفیان کے مقابلے پر، فیقا بن نسطورس کو ساٹھ ہزار فوج کے ساتھ ابوعبیدہ کے مقابلے پر اور چالیس ہزار فوج کے ساتھ درا قص کو شرجیل بن حسنہ کے مقابلے پر روانہ کیا۔

مسلمانوں کو علم ہوا کہ ان کی ہر فوج کے مقابلہ پر اس سے دوگنی فوج ہرقل نے بھیجی ہے تو انہوں نے آپس میں صلاح و مشورہ کیا۔ تیز رفتار قاصد ایک پیغام دوسرے تک پہنچاتے رہے۔ چار مسلمان سرداروں میں عمرو بن عاص کی ذہانت کے سبھی قائل تھے۔ انہوں نے رائے دی کہ الگ الگ مقابلے کے بجائے ہم سب کو یکجا ہو جانا چاہیئے۔ اس طرح ہم تعداد کی کمی کی وجہ سے مغلوب نہ ہو سکیں گے۔ اس مشورہ کو سب نے پسند کیا اور دربار خلافت سے اس کی منظوری کے لئے ایک قاصد روانہ کیا گیا۔ قاصد کے ذریعہ مدینہ سے مزید کمک بھی منگوائی گئی۔

مدینہ میں جب یہ خبر مشہور ہوئی کہ اسلامی لشکر کو کمک بھیجی جا رہی ہے تو مجاہدین اسلام کے دل جوش جہاد سے اور بھر گئے۔ مدینہ اور طائف کی چھاؤنیوں میں دھڑا دھڑ جوان پہنچنے لگے۔ ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ اسے کمک کے دستوں میں شامل کیا جائے۔ اس طرح صبح سے شام تک میلہ

سالگا رہتا۔ انتخاب شروع ہوا تو ان جوانوں کو سب سے پہلے شامل کیا گیا جو عرصہ سے زیر تربیت تھے۔ ابان کے دل کی مراد بر آئی تھی اور اس کا انتخاب ہو گیا تھا۔

ادھر خلیفۃ المسلمین نے محاذ پر گئے ہوئے سرداروں کی درخواست قبول کرتے ہوئے انہیں یکجا ہو جانے کا حکم بھیج دیا۔ ایک قاصد حضرت خالد بن ولید t کے پاس بھیجا گیا۔ انہیں حکم دیا گیا کہ وہ عراق کے محاذ سے آدھا لشکر لے کر رومیوں اور شامیوں کے مقابلے پر روانہ ہو جائیں۔ ادھر مدینہ میں پانچ ہزار کا ایک لشکر تیار کیا گیا اور اس کی سرداری کے فرائض خالد بن ولید t کے سپرد کیے گئے۔

ابان ابھی جوان تھا۔ اس کے پوشیدہ جوہر ابھی تک سامنے نہ آئے تھے۔ پس وہ معمولی سوار دستوں میں شامل ہو کر خالد بن ولید t کے ساتھ محاذ کی طرف روانہ ہوا۔ خالد بن ولید t کو عمرو بن عاص کے پاس پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔ پس وہ منزلیں مارتے ارض عرب کی طرف چلے جس کے نواح میں عمرو بن عاص مقیم تھے۔ تیسری منزل پر انہوں نے ایک مناسب میدان دیکھ کر خیمہ زن ہونے کا حکم دیا۔ ذرا ہی دیر میں پورا میدان خیموں سے بھر گیا۔ خیموں کے آگے آگ روشن کر دی گئی۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا۔

ابان کا دل جوش جہاد سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے دوست مختلف دستوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ابان ہر منزل پر ان سے ملنے جاتا تھا اور ان سے اس طرح ہنس ہنس کے باتیں کرتا جیسے میدان جنگ کے بجائے وہ کسی بارات میں جا رہا ہے۔ اسی دوران ابان ایک دوست کا خیمہ تلاش کر رہا تھا کہ ایک جگہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

''کیا یہ عتبہ ہیں۔'' ابان نے اپنے دل سے سوال کیا۔

اور پھر خود ہی جواب دیا۔

''نہیں۔ وہ نہیں۔ انہیں تو محاذ پر جانے کی اجازت نہ ملی تھی۔''

لیکن وہ عتبہ ہی تھے۔ عتبہ بھی شاید کسی کا خیمہ تلاش کر رہے تھے۔ ابان اپنے دل کو مطمئن کرنے کے لئے ایک خیمے کی آڑ میں کھڑا ہو گیا۔ عتبہ اس کے قریب سے گزر کر آگے نکل گئے۔ اب ابان کو یقین کرنا پڑا کہ وہ عتبہ ہیں لیکن اب ان سے ملتے ہوئے اسے شرم آ رہی تھی۔ اس نے شادی سے انکار کیا تھا۔ وہ بنت عتبہ جیسی خوبصورت لڑکی کو قبول نہ کر سکا تھا لیکن اس میں اس کی کیا خطا تھی۔ کیونکہ جہاد اول ہے اور شادی بعد میں بھی ہو سکتی ہے۔

ابان نے آخر ان سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ عتبہ قدم بقدم دور ہوتے جا رہے تھے۔ پس اس نے عتبہ کی طرف تیز قدم اٹھائے لیکن اس کے ساتھ ہی خیال آیا۔

''بنت عتبہ نے اس انکار پر اس کے بارے میں کیا سوچا ہوگا۔''

یہ خیال آتے ہی عتبہ کے قدم رک گئے۔ اس کے دل میں ایک عجیب سی کشمکش تھی۔ اک تذبذب کا عالم تھا۔ ایک دل کہتا عتبہ سے ملو۔ دوسرا دل منع کرتا آخر عتبہ ایک خیمے کی آڑ میں ہو گئے۔

ابان نے ہمت کی اور تیز قدم اٹھاتا اس خیمے کے پاس پہنچ گیا۔ پھر وہ خیمہ سے آگے بڑھا تو عتبہ اسے ایک آدمی سے گفتگو کرتے نظر

آئے۔ ابان چپ چاپ ان کے سامنے چلا گیا مگر اس کی نظریں نیچی تھیں۔

عتبہ کی نظر دوسری آدمی سے گفتگو کرتے ہوئے ابان پر پڑی تو وہ خوش ہو گئے۔ بولے۔

''ارے ابان تم''

اور انہوں نے بغلگیر ہونے کے لئے ہاتھ پھیلا دیئے۔

ابان جھجکتا ہوا ان کے سینے سے لگ گیا۔

پھر ابان ان کے سینے سے الگ ہوتے ہوئے بولا۔

''میں سمجھا تھا کہ آپ مجھ سے ناراض ہیں۔''

''کیوں۔ اس میں ناراض ہونے کی کیا بات تھی؟'' عتبہ نے جواب دیا۔

''تم نے جو جواب دیا اس سے ہم خوش۔ ہمارا خدا خوش۔ تمہارے فیصلے کو میری بیٹی نے بھی پسند کیا ہے۔''

''بنت عتبہ'' جیسے ابان کے دل سے ایک آواز ابھری۔ اس نے چاہا کہ بنت عتبہ کے بارے میں ان سے کچھ پوچھے لیکن حجاب مانع رہا۔

پھر بھی ابان نے کہا۔

''محترم۔ آپ لشکر کے ساتھ کیسے آ گئے؟ آپ کو میدان جنگ میں جانے کی تو اجازت نہیں ملی تھی۔''

عتبہ نے جواب میں بتلایا۔

''ہاں بیٹے پہلے تو خلیفۃ المسلمین نے انکار کر دیا تھا مگر اس دفعہ اس نے ہاتھ پیر جوڑ کے آخر انہیں رضامند کر لیا۔ اللہ خلیفۃ المسلمین کا سایہ ہمارے سروں پر قیامت تک قائم رکھے۔''

ابان کے دل میں پھر گدگدی سی ہوئی کہ بنت عتبہ کے بارے میں کچھ پوچھے مگر اسے ہمت نہ ہوئی۔

اگلی منزل پر دونوں کی پھر ملاقات ہوئی اور ذرا کھل کے باتیں ہوئی۔ ابان کو معلوم ہوا کہ بنت عتبہ بھی لشکر کے ساتھ ہے۔ اسے خواتین کے لشکر میں شامل کر لیا گیا ہے۔ خواتین کے خیمے لشکر سے ذرا ہٹ کر لگائے جاتے تھے لیکن اس سے اگلی منزل پر ابان اور بنت عتبہ کا اتفاقیہ آمنا سامنا ہو گیا۔

ابان نے شرم یا لحاظ کی وجہ سے نظریں نیچی کر لیں۔ دوسری طرف بنت عتبہ نے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہ ہونے دیا۔

اب تو ہر منزل پر دور ہی دور سے ان کی ملاقات ہوتی لیکن یہ ملاقاتیں نظروں کے ملاپ سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ خالد بن ولید کی اصل منزل ارض عربہ تھی جہاں عمرو بن عاص پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ ارض عربہ ابھی کئی منزل دور تھی۔ خالد بن ولید کو وہاں پہنچنے کی جلدی تھی۔ انہوں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ ابھی تین منزلیں باقی تھیں کہ چاروں طرف پھیلے ہوئے جاسوس سواروں نے خالد بن ولید کو ایک ایسی اطلاع پہنچائی جس سے وہ ذرا دیر کے لیے پریشان ہو گئے۔

ایک جاسوس نے خالد بن ولید کو بتایا۔

''دس بارہ ہزار کا ایک رومی لشکر بڑی تیزی سے مسلمانوں کے تعاقب میں بڑھا چلا آرہا ہے۔''

اس اطلاع پر خالد بن ولید نے اپنے خاص خاص سرداروں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا۔ بعض نے رائے دی کہ ہمیں خیمے اکھاڑ کر فوراً ارض عربہ کی طرف کوچ کر جانا چاہیے تاکہ ہمیں عمرو بن عاص کی مدد حاصل ہو جائے۔ ان سرداروں کی دلیل یہ تھی کہ اس وقت مسلمانوں کی تعداد صرف پانچ ہزار ہے جبکہ عقب میں آنے والے رومیوں کی تعداد دس بارہ ہزار کے درمیان بتائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس قلیل تعداد سے دشمنوں کا مقابلہ کرنا کسی طرح مناسب نہیں۔

دوسری رائے اس کے بالکل برعکس تھی۔ رائے دینے والے یہ سوار تجربہ کار نہ تھے لیکن ان کی رگوں میں جوانی کا خون گردش کر رہا تھا اور ان کے سینے جہاد کے جوش سے پھٹے جاتے تھے۔ ان سب نے جنگ کے حق میں آواز بلند کی۔ انہوں نے رائے دی کہ قریب ہی کوئی مناسب مقام دیکھ کر ہمیں مورچہ لگانا چاہیئے اور اللہ تعالیٰ کے بھروسے پر دشمن سے مقابلہ کرنا چاہیئے کیونکہ اگلی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی دشمن نے گھیر لیا تو افراتفری کا خطرہ ہے اور پھر ہم اپنی مرضی کا میدان بھی حاصل نہ کر سکیں گے۔

آخر خالد بن ولید نے جوانوں کے گروہ سے اتفاق کیا اور کسی معقول میدان کی تلاش میں فوراً سوار دوڑائے۔

ادھر شہنشاہ ہرقل مسلمانوں کی نقل و حرکت سے غافل نہ تھا۔ مسلمانوں کے چار لشکروں کے مقابلے میں اس نے بھی چار زبردست لشکر روانہ کر دیئے تھے۔ پھر جب اسے یہ خبر ملی کہ مدینہ سے ایک تازہ دم فوج کمک کے طور پر بھیجی گئی ہے جس کا رخ ارض عربہ کی طرف ہے تو اس نے فوراً بارہ ہزار کا مزید لشکر ترتیب دے کر ایک مشہور رومی سردار قیقلان کے سپرد کر کے حکم دیا کہ مدینہ سے آنے والی کمک کو راستے ہی میں روک لے تاکہ یہ کمک عمرو بن عاص کے لشکر کے درمیان حائل ہو جائے لیکن خالد بن ولید آگے نکل چکے تھے اس لئے وہ تعاقب کرتا ہوا خالد بن ولید کے پاس پہنچ گیا۔

خالد بن ولید اجنادین کے میدان میں اپنے مورچے لگا چکے تھے اور رومیوں کا انتظار کر رہے تھے۔ رومیوں کا لشکر شام کے وقت پہنچا اور مسلمانوں کے سامنے خیمہ زن ہو گیا۔ خالد بن ولید نے رات کے لیے بہت زبردست حفاظتی انتظام کئے۔ خصوصاً انہوں نے خواتین کے خیموں کے گرد کافی پہرہ لگا دیا تاکہ اگر شب خون مارا جائے تو اس کا تدارک ہو سکے۔

مگر رات کو کوئی واقعہ پیش نہ آیا۔ کسی طرف سے بھی شب خون مارنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ رومیوں کے پڑاؤ میں حسب دستور کافی رات تک شراب کا دور چلتا رہا۔ مسلمانوں کی قلیل تعداد کے پیش نظر انہیں اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا اور شاید وہ پہلے ہی فتح کا جشن منانے لگے تھے۔ مسلمانوں نے اس رات بہت کم آرام کیا۔ صحابہ کرامؓ کی ایک کثیر تعداد اس لشکر میں موجود تھی وہ سب کے سب تمام رات توبہ و استغفار اور تسبیح و درود میں مصروف مسلمانوں کی فتح و نصرت کی دُعائیں مانگتے رہے۔

صبح کو نماز سے فارغ ہوتے ہی خالد بن ولید نے صفیں ترتیب دیں۔ رومی بھی کیل کانٹے سے آراستہ ہو کر مقابلے پر آئے۔ مسلمانوں کا یہ عالم تھا کہ ان کے گھوڑے رانوں سے نکلے جاتے تھے۔ تلواریں بے نیاز ہونے کے لئے بے چین تھیں۔ حملے کا حکم ہوا تو مسلمان بھوکے شیروں کی طرح دشمن پر جا پڑے۔ ایسے گھمسان کا رن پڑا کہ زمین و آسمان کانپ اٹھے۔ جو سوار تجربہ کار تھے اور لڑائیوں میں پہلے بھی شریک ہو چکے تھے وہ

سنبھل سنبھل کر حملے کر رہے تھے لیکن منجھلے جوان جن کا یہ پہلا موقعہ تھا انہیں آگے پیچھے کا کوئی ہوش نہ تھا اور خیال تھا تو بس یہ ایک بھی دشمن کا سپاہی میدان میں زندہ نہ رہنے پائے۔

نوجوان ابان کی تلوار بجلی کی طرح کوندرہی تھی۔ اس نے کچھ ایسی دلیری اور شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ جوان سرداروں نے جنگ کو ترجیح دی تھی ان کا مشورہ کامیاب ہوا اور دوپہر ڈھلے رومی لشکر کئی ہزار لاشیں میدان جنگ میں چھوڑ کے بھاگ نکلا۔ خالد بن ولید نے فوج کو مصلحتاً بھاگنے والوں کے تعاقب سے روک لیا لیکن اس وقت تک ابان رومی سپہ سالار قیقلان تک پہنچ چکا تھا۔ قیقلان نے لشکر کو بھاگتے دیکھا تو وہ خود بھی بھاگنے کی فکر میں لگ گیا۔ اس وقت ابان کے ساتھ چار پانچ اور جیالے تھے۔ وہ سب ریلا کر کے قیقلان کے قریب پہنچ گئے۔ اس نے بھاگ نکلنے کی بہت کوشش کی لیکن ابان کے دو تین وار اس کے شانے پر ایسے پڑے کہ قیقلان بے دم ہو کر زین سے لٹک گیا اور ابان نے بڑھ کر اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اب مسلمان فتح سے سرشار ہو کر اپنے خیموں کی طرف واپس ہوئے۔ قیقلان کا سر ابان کے قبضے میں تھا۔

اس غیر متوقع جنگ میں فتح کی وجہ سے سپہ سالار خالد بن ولید بے حد مسرور تھے۔ اب وہ اپنے خیمے کے باہر بیٹھے تھے۔ بارہ ہزار کے مقابلے میں پانچ ہزار کی کامیابی اس قدر شاندار تھی کہ خالد بن ولید خوشی سے پھولے نہ سماتے تھے اور پھر جب رومی سپہ سالار قیقلان کا سر ان کے قدموں میں ڈالا گیا تو ان کی مسرت کا عالم دیدنی تھا۔ کبھی وہ سر کو دیکھتے اور کبھی سر لانے والے جوان کو۔ ان کے تمام سردار ابان کو تحسین بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

خالد بن ولید کھڑے ہوتے ہوئے ابان سے بولے۔

''خوش نصیب۔ کیا نام ہے تمہارا؟''

''ابان'' اور ابان نے جواب دے کر نظریں جھکا لیں۔

''کس علاقے سے تعلق ہے تمہارا۔''

''طائف کی چھاؤنی سے میرا انتخاب ہوا ہے۔''

''طائف۔'' خالد مسرت سے بولے۔ ''سبحان اللہ۔ طائف کی زمین پہلے ہی متبرک تھی۔ میں اس مقدس زمین کے بہادر جوان کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔''

یہ کہتے ہوئے خالد بن ولید نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے۔ ابان جھجکتا ہوا ان کی طرف بڑھا اور ان کے سینے سے لگ گیا۔

خالد نے پوچھا۔

''ابان۔ کس عہدے پر فائز ہو۔''

جس سوار دستے سے ابان کا تعلق تھا اس کا سردار وہاں کھڑا تھا۔ چنانچہ ابان کے بجائے اس نے جواب دیا۔

"سالارِ محترم۔ ابان میرے دستے میں شامل ہے۔ میدانِ جنگ میں پہلی بار آیا ہے۔"

"سبحان اللہ۔ سبحان اللہ" خالد بولے۔ "ابان کی غیر معمولی شجاعت کے پیشِ نظر ہم اسے بیس سواروں کا سردار مقرر کرتے ہیں۔"

ابان کے اس اعزاز کو سب نے پسند کیا۔

اجنادین کی پہلی جنگ میں کافی تعداد میں صحابہ کرام شریک تھے۔ ان میں بیشتر نے اس جنگ میں شہادت پائی۔ خالد بن ولید شہیدوں کی لاشوں کے پاس پہنچے۔ وہ کثیر تعداد میں صحابیوں کی لاشیں دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے۔

انہوں نے حکم دیا۔

"ہر صحابی کے لئے الگ قبر تیار کی جائے۔"

مقتولین کی تجہیز و تکفین کے حکم دینے کے بعد خالد بن ولید زخمیوں کے خیمے کی طرف چلے۔ ہر خیمے میں چار زخمیوں کو رکھا گیا تھا۔ کچھ کی مرہم پٹی ہو چکی تھی اور بعض کے زخم صاف کر کے پٹیاں باندھی جا رہی تھیں۔ خواتین اسلام بڑی توجہ سے زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں۔

ایک خیمے میں کئی آدمی ایک زخمی پر جھکے ہوئے تھے۔ خالد خیمے میں داخل ہوئے تو تمام لوگ ادب سے کھڑے ہو گئے۔ زخمی کے جسم پر بے شمار زخم تھے۔ اس کا پورا بستر اور کپڑے خون میں لت پت تھے۔ زخموں سے خون اب تک جاری تھا۔ زخمی بے ہوش تھا۔ اس کی سانس بہت آہستہ چل رہی تھی۔

خالد نے جھک کر زخمی کو دیکھا پھر کچھ سوچنے لگے۔

ایک سردار نے پوچھا۔

"کیا نام ہے ان کا؟"

"عتبہ............ مدینے کے رہنے والے ہیں۔" قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی نے جواب دیا۔

"عتبہ............ ہاں یہ عتبہ ہیں۔" خالد بن ولید کو جیسے کچھ یاد آ گیا۔ "کیسی حالت ہے ان کی؟"

"خون بہت بہہ گیا ہے۔" پٹی باندھنے والے نے جواب دیا۔ "اللہ تعالیٰ اپنا رحم کرے۔"

"انہیں بچانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔" خالد نے فرمایا۔ "ان کی دیکھ بھال کی مجھے خاص تاکید کی گئی ہے۔"

پھر کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"مجھے یاد پڑتا ہے کہ ان کے ساتھ ان کی بیٹی بھی آئی ہوئی ہے۔"

اس وقت کئی آدمیوں کی نظریں ایک ساتھ خیمے کے کونے کی طرف اٹھیں جہاں ایک لڑکی سر جھکائے کھڑی تھی۔

وہ آہستہ آہستہ خالد کے قریب آ گئی۔

"تم عتبہ کی بیٹی ہو۔" اور خالد نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

اور بنت عتبہ نے ایک سسکی بھر کر سر جھکا دیا۔

خالد بن ولید نے زخمی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تمہارے والد محترم کو شہادت کی بڑی آرزو تھی۔ انہیں بچانے کی پوری پوری کوشش کی جائے گی۔ آگے اللہ تعالیٰ کی مرضی۔ لیکن یہ خیال رکھو کہ تم صرف عتبہ کی بیٹی نہیں، ہماری بھی بیٹی ہو۔ تمہیں کوئی بھی پریشانی نہیں ہوگی۔''

اس وقت زخمی کو ہلکی سی کھانسی آئی اور کھانسی کے ساتھ ہی تھوڑا سا خون ناک اور منہ سے باہر آ گیا۔ خالد بن ولید ان پر جھک گئے۔ زخمی کے ہونٹوں کو حرکت ہوئی اور آنکھیں آہستہ آہستہ کھل گئیں۔ بنت عتبہ جلدی سے باپ سے الگ ہو کر بیٹھ گئی۔

خالد بن ولید نے عتبہ سے کہا۔

''محترم عتبہ۔ آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

عتبہ نے نحیف آواز میں رک رک کے دریافت کیا۔

''جنگ کا کیا نتیجہ ہوا؟''

''مبارک ہو آپ کو.................'' خالد جلدی سے بولے۔ ''خدا نے ہمیں کامیابی سے ہمکنار کیا۔''

عتبہ کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ ایک لمحے کے لئے ان کی آنکھیں بند ہوئیں پھر ذرا سنبھل کے بولے۔

''میری آرزو بھی پوری ہو گئی۔ میں بھی منزل کے قریب پہنچ گیا ہوں۔''

پھر عتبہ نے نظریں اس طرح گھمائیں جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہوں۔

''آپ کی بیٹی۔ آپ کے سینہ سے لگی بیٹھی ہے۔'' انہیں بتایا گیا۔

''ہاں بابا'' کہہ کر بنت عتبہ نے اپنا ہاتھ باپ کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''میں آپ کے قریب ہوں۔''

''سپہ سالار۔'' عتبہ کے منہ سے نکلا پھر ان پر غشی طاری ہو گئی۔

خالد بن ولید اپنا منہ ان کے قریب لا کر بولے۔

''محترم عتبہ فرمایئے۔ میں سن رہا ہوں۔''

عتبہ نے پھر آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے بولے۔

''ایک وعدہ کیجئے مجھ سے۔''

''حکم دیجئے محترم..........'' خالد جلدی سے بولے۔

''میری بیٹی کسی کی امانت ہے۔'' عتبہ نے رک رک کے کہا۔ ''میرے بعد امانت اس تک پہنچا دیجئے گا۔''

''بالکل فکر نہ کیجئے محترم عتبہ۔'' خالد نے انہیں مطمئن کرنے کے لئے کہا۔

''آپ کی بیٹی کو میں نے اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔ جہاں کہے وہاں پہنچا دیا جائے گا۔''

عتبہ کی آواز ڈوب رہی تھی۔ وہ زور لگا کر بولے۔ ''لشکر میں ایک سوار ابان ہے۔ یہ اس کی امانت ہے۔''

''ابان'' خالد نے مسرت سے دہرایا۔ ''محترم عتبہ۔ آپ کی بیٹی بڑی خوش نصیب ہے۔ ابان نے رومی لشکر کے سپہ سالار قیقلان کا سر اتارا ہے اور ہم نے ابھی ابھی اسے بیس سواروں کا سردار مقرر کیا ہے۔''

عتبہ کے جسم میں جیسے طاقت سی آ گئی۔ ان کی آنکھیں خوشی سے چمک اٹھیں۔

خالد بن ولید نے حکم دیا۔

''ابان کو فوراً یہاں لایا جائے۔''

لوگ دوڑ کے ابان کو وہاں لے آئے۔ ابان کی نظر سپہ سالار اور بنت عتبہ پر پڑی۔ بنت عتبہ ابان کو دیکھ کر سمٹ گئی۔

خالد بن ولید نے کہا۔

''ابان! تم محترم عتبہ کو جانتے ہو؟''

ابان کی نظریں زخمی عتبہ پر پہلے ہی سے جمی تھیں۔ اس نے جواب دیا۔

''جی ہاں سپہ سالار۔ میں محترم عتبہ اور بنت عتبہ دونوں کو جانتا ہوں۔ کیا عتبہ بہت زخمی ہوئے ہیں۔'' اور ابان عتبہ پر جھک گئے۔

''ابان! خالد بولے۔ ''محترم عتبہ کو بعد میں دیکھنا اس وقت تو ان کے زخموں کو مرہم کی ضرورت ہے اور وہ مرہم صرف تم مہیا کر سکتے ہو۔''

''فرمایئے سپہ سالار............'' ابان جلدی سے بولا۔ ''میں محترم عتبہ کے لیے جان تک دے سکتا ہوں۔'' خالد بن ولید نے ابان کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔

محترم عتبہ نے ایک امانت میرے سپرد کی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ امانت اسی وقت اس شخص کو پہنچا دوں جس کے لئے انہوں نے حکم دیا ہے۔''

ابان کی سمجھ میں سپہ سالار کی بات اچھی طرح نہ آ سکی۔ اس نے پوچھا۔

''میرے لئے کیا حکم ہے سپہ سالار؟''

خالد بن ولید متانت سے بولے۔

''ابان۔ شیر سے پنجہ لڑانے والے کے سینہ میں ہمیشہ ایک دردمند دل ہوا کرتا ہے۔ محترم عتبہ کی امانت ان کی بیٹی ہے۔ اس کی حفاظت میں نے قبول کی ہے۔ اب میں یہ امانت تمہارے سپرد کر رہا ہوں۔ تم اس کے اہل بھی ہو اور عتبہ کی بھی یہی آرزو ہے۔''

ابان نے گھبرا کے عتبہ کے چہرے پر نظر ڈالی۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور ان دھندلائی ہوئی آنکھوں میں ابان کو امید و بیم کی کشمکش نظر آئی۔

پھر ابان نے بنت عتبہ کو دیکھا۔ وہ باپ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ابان نے بڑے ادب سے سپہ سالار کو مخاطب کیا۔

''محترم سپہ سالار۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر میں محاذ سے غازی بن کر واپس آیا تو بنت عتبہ کو اپنے نکاح میں لاؤں گا۔ مجھے علم نہ تھا کہ

حالات ایسی کروٹ بدلیں گے۔ میں محترم عتبہ کی آرزو پوری کرنے پر آمادہ ہوں۔"

"شاباش ابان" سپہ سالار کے سر سے جیسے بوجھ سا اتر گیا۔"ہم نے تمہارے بارے میں ٹھیک ہی اندازہ لگایا تھا۔خدا تمہیں اس سے زیادہ عظمت عطا کرے۔"

اور خالد بن ولید نے اس وقت بنت عتبہ اور ابان کا خود ہی نکاح پڑھا دیا۔

پھر جب سب لوگ خیمے سے چلے گئے تو ابان'عتبہ کے سر کے دوسری طرف بیٹھ گیا۔اس نے اپنا ہاتھ عتبہ کے سینے پر رکھا۔عتبہ کی آنکھیں اس وقت تک کھلی تھیں جب نکاح پڑھایا گیا تو ان پر ضعف کا دورہ پڑا اور آنکھیں بند ہو گئیں۔رات کے کسی حصہ میں بنت عتبہ کا ہاتھ ابان کے ہاتھ پر آ گیا لیکن مسرت کی ان گھڑیوں میں تمام رات موت کا سایہ منڈلاتا رہا۔عتبہ کے ڈوبتے دل اور اکھڑی سانسوں کو دیکھ کر ہی انہوں نے پوری رات آنکھوں ہی میں کاٹ دی۔صبح دم فجر کی اذان کے ساتھ ہی عتبہ کی آرزوئے شہادت پوری ہو گئی اور وہ آخری ہچکی لے کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ بنتِ عتبہ تایا کے خیمہ سے رخصت ہو کر ابان بن سعید کے گھر خیمہ عروسی میں پہنچ گئی۔پہلی ہی ملاقات ایک دوسرے کی دید کرتے ہوئے وقت کو اپنے ساتھ اڑا لے گئی اور وہ آنکھوں کے تیروں سے ایک دوسرے کو گھائل کرتے کرتے خود ہی چکنا چور ہو کر خوابوں کی حسین وادی میں پہنچ گئے۔

ابھی اس شادی کو ہوئے چند روز ہی ہوئے تھے اور ان دونوں کی پیاسی اور متلاشی روحیں ابھی ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف بھی نہ ہو سکیں تھی کہ رومیوں نے دمشق کی جانب سے مسلمان افواج پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔

ملک شام میں غور کے قریب یرموک نام کی ایک وادی ہے۔حضرت ابوبکر صدیق t کے حکم کے مطابق مسلمانوں کے چاروں لشکر یکجا ہونے کے لئے اس وادی کی طرف چلے۔شہنشاہ روم ہرقل نے بھی اپنے تمام لشکر یرموک کی طرف بھیج دیئے تھے۔رومی فوجیں واقوصہ کے مقام پر آ کر ٹھہر گئی تھیں۔پھر دوسرے دن اسلامی لشکر بھی وادی میں داخل ہوا اور رومیوں کے سامنے مورچے لگائے ۱۳ ہجری صفر کے مہینے سے ربیع الثانی یعنی پورے تین ماہ تک دونوں فوجیں آمنے سامنے مورچے جمائے رہیں لیکن کسی نے دوسرے پر حملہ کرنے کی کوشش نہ کی۔

خالد بن ولید اجنادین کی فتح کے بعد ارض عربہ میں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے تمام لشکر یرموک جا چکے ہیں۔عمرو بن عاص نے ان کے لئے یہ پیغام چھوڑا تھا کہ وہ بھی بے جھجک یرموک کی طرف چل پڑیں۔چنانچہ خالد بن ولید نے فوراً اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔اس مشورے میں انہوں نے ابان کو بھی شریک کیا۔جواں عمر ابان کو بنت عتبہ کے ساتھ شادی کے بعد سو سواروں کا سردار مقرر کر دیا گیا تھا۔پس اتفاق رائے کے بعد خالد بن ولید نے بھی اپنے گھوڑوں کے رخ یرموک کی طرف موڑ دیئے اور وہ بہت جلد وہاں پہنچ گئے۔مسلمانوں کو اس کمک سے بہت خوشی ہوئی۔

لشکر اسلام کے تمام جواں عمر مجاہدین جنگ کے لئے بڑے بے چین تھے مگر کیفیت یہ تھی کہ دونوں لشکر صبح کو تیار ہو کر نکلتے۔صفیں درست کی جاتیں اور شام تک اسی عالم میں دوسری طرف سے جنگ کے آغاز کا انتظار ہوتا۔پھر واپسی کا بگل بجتا اور دونوں لشکر اپنی اپنی خیمہ گاہ میں واپس آ جاتے۔

مدینہ سے کمک آجانے کے باوجود مسلمانوں نے جنگ میں پہل نہیں کی۔ لشکر کے اصل دماغ عمرو بن عاص تھے انہوں نے تمام سرداروں کو سمجھایا اور انہیں جنگ شروع کرنے سے روکے رکھا۔ اس دوران خالد بن ولید کو مدینہ سے حکم ملا انہوں نے ابن حارثہ کو اپنا قائم مقام بنایا اور خود دس ہزار فوج لے کر عراق سے شام کی طرف چل پڑے۔ خالد بن ولید کو ہر چند یرموک پہنچنے کی جلدی تھی لیکن ان کی شمشیر آبدار راستے میں بھی نیام کے اندر نہ رہ سکی۔ ارک اور تدبر مغلوب ہوئے۔ مرج ولبط کے قلعدار نے سرکشی دکھائی تو اسے تاخت وتاراج کیا پھر غوطہ فتح کر کے وہ بصریٰ میں داخل ہوئے۔ بصریٰ شام کا پہلا شہر تھا جو خالد بن ولید کے ہاتھوں فتح ہوا۔

میدانِ جنگ میں اس طویل خاموشی سے قیصر روم ہرقل نے فائدہ اٹھایا اس نے روم کے ایک مشہور سردار اباہان کی زیر کمان ایک اور لشکر روانہ کر دیا۔ اس وقت مسلمانوں کی تعداد چھتیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ ان کے مقابلے میں رومی لشکر دو لاکھ چالیس ہزار تھا۔ جس میں روم کے تمام بڑے بڑے سرداروں کے علاوہ عیسائی پادریوں کی بھی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔ مسلمانوں اور رومیوں کی یہ پہلی عظیم جنگ تھی جس کا فیصلہ بڑا دوررس نکلنا تھا۔

جنگ شروع ہونے سے ایک دن پہلے تمام مسلم سرداران لشکر کا ایک اجلاس ہوا اس میں جنگ کے تمام پہلوؤں پر غور کیا گیا۔ ہر سردار نے اپنی رائے پیش کی۔ خالد بن ولید سب کی باتیں سنتے رہے جب سب بول چکے تو عمرو بن عاص نے خالد بن ولید کا مشورہ طلب کیا۔

خالد بن ولید نے سرداروں کو مخاطب کر کے فرمایا۔

''یہ جنگ ایک عظیم مذہبی جنگ ہے۔ آج ہمیں فخر اور نافرمانی کا خیال دل سے نکال دینا چاہئے اور صرف اللہ تعالیٰ کے واسطے اپنی تمام کوششیں صرف کرنا چاہئیں۔ دیکھو دشمن تنظیم اور ترتیب کے ساتھ میدان جنگ میں موجود ہے اور تم متفرق اور منتشر ہو۔ تمہارا یہ انتشار تمہارے لئے دشمن کے حملے سے زیادہ نقصان پہنچانے والا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ ساری فوج کی امارت ایک امیر کی کمان میں دے دی جائے اور فوج کی امارت باری باری تقسیم کر لی جائے۔ ایک دن ایک امیر، سردار ہو تو دوسرے دن دوسرا سردار امیر بنایا جائے۔ اگر تمہیں یہ رائے پسند ہے تو آج مجھے امیر بن جانے دو۔

اسلامی لشکر کے سردار نے خالد بن ولید کی رائے کو پسند کیا۔ سب سے پہلے ان کی امارت عمرو بن عاص نے تسلیم کی۔ اس کے بعد باقی تمام سرداروں نے خالد بن ولید کو اپنا امیر مان لیا۔

رومی بڑی آن وبان کے ساتھ میدان میں صف آرا ہوئے۔ خالد بن ولید نے اپنے لشکر کو اس طرح ترتیب دیا کہ اس سے قبل کبھی لشکر کو اس طرح مرتب نہ کیا گیا تھا۔ خالد بن ولید نے مردوں کے علاوہ خواتین کا بھی ایک دستہ ترتیب دیا۔ خالد بن ولید کا خیمہ ایک بلند مقام پر تھا۔ انہوں نے خواتین کو حکم دیا کہ وہ پتھر اکٹھے کر لیں اور ضرورت پڑے تو خیموں کی چوبیں بھی اکھاڑ لیں۔ پھر ان کے سپرد یہ کام ہوا کہ جنگ کے دوران وہ اونچے ٹیلے پر کھڑی رہیں اور جو مسلمان میدان جنگ سے منہ پھیرے اس کی خبر پتھروں اور خیمے کی چوبوں سے لیں اور کسی کو بھی بھاگنے کا موقعہ نہ دیں۔

ان خواتین میں بنت عتبہ بھی تھی۔ اس کا محبوب شوہر اباان اس وقت شرجیل بن حسنہ کے دستوں میں شامل تھا۔ بنت عتبہ نے تیر کمان لے کر میدان جنگ میں جانے کی اجازت مانگی تھی مگر اسے اس کی اجازت نہیں دی گئی اور اسے خواتین کے دستے کے ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا۔ اس طرح بنت عتبہ کی جنگ (جہاد) کی آرزو اس کے دل ہی میں رہ گئی۔

آخر جنگ یرموک شروع ہوئی۔ یہ بڑی خوفناک جنگ تھی۔ فوجیں ایک دوسرے پر بھوکے بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑیں۔ خواتین پتھر اکٹھے کئے اور خیموں کی چوبیں اٹھائے تمام دن مستعد ٹیلے پر کھڑی رہیں لیکن کسی مسلمان نے جنگ سے منہ موڑنے کی کوشش نہ کی۔ پہلے دن کی جنگ میں خالد بن ولید کی بہادری دیکھنے کے لائق تھی۔ وہ رومیوں کے لشکر میں دور تک گھستے چلے گئے اور تمام دن ان کے درمیان کھڑے جنگ کرتے رہے۔ ان کے ساتھ کے دستوں نے دشمن کے لشکر کے درمیان ایک طوفان برپا کر دیا۔

رات ہوئی تو دونوں طرف سے جنگ بندی کر دی گئی۔ رومیوں کا سپہ سالار ابابان پہلے دن کی جنگ سے ایسا گھبرا گیا کہ اس نے صلح کی پیشکش کی۔ اس نے اپنے ایک سردار جار باجرجہ کو سفیر بنا کر اسلامی لشکر میں بھیجا۔ وہ مسلمانوں کے جلال اور نظم وضبط سے ایسا متاثر ہوا کہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا اور مسلمانوں کے ساتھ شامل ہو کر لڑنے کی اجازت مانگی۔ خالد بن ولید نے اسے بڑی مشکل سے سمجھا بجھا کر واپس بھیجا۔ اس دن صلح کی گفتگو تعطل کا شکار ہو گئی۔ دوسرے دن خالد بن ولید خود سفیر بن کر رومیوں کے لشکر میں گئے مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

پھر یرموک کی فیصلہ کن جنگ شروع ہوئی۔ رومیوں کے لشکر کے آگے آگے مذہبی پیشوا انجیل مقدس ہاتھوں میں لئے عیسائیوں کے حوصلے بڑھا رہے تھے۔ مسلمانوں کے خطیب ابوسفیان t تھے۔ وہ لشکر کے اس سرے سے اس سرے تک گھوڑا دوڑا رہے تھے اور مسلمانوں کو جوش دلا رہے تھے۔ وہ اک بار اپنے بیٹے یزید بن ابوسفیان کے قریب سے گزرے تو چیخ کے بولے۔

''یزید! تو فوج کا ایک افسر ہے۔ ہمت اور پامردی سے لڑ اور کسی افسر سے پیچھے نہ رہ۔''

کئی ہزار رومیوں نے پیروں میں بیڑیاں پہن رکھی تھی تا کہ میدان جنگ سے بھاگنے کا خیال ہی پیدا نہ ہو۔ اس کا جواب عکرمہ اور ان کے بیٹے عمرو بن عکرمہ نے دیا۔

عکرمہ پوری طاقت سے چلا کر بولے۔

''میں نے ہر میدان میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ساتھ جنگ کی ہے بھلا آج میں کیسے پیٹھ دکھا سکتا ہوں۔ میرے ہاتھ پر کون موت کی بیعت کرنے کے لئے تیار ہے؟''

عکرمہ کی آواز پر سب سے پہلے حارث بن ہشام اور ضرار بن ازور گھوڑے بڑھا کر ان کے پاس آئے اور دیکھتے ہی دیکھتے چار سو مزید جانبازوں نے ان کے گرد حلقہ بنا لیا۔ سب نے عہد کیا۔

''موت کو گلے لگالیں گے لیکن میدان سے منہ نہ موڑیں گے۔''

ان جانبازوں کا حملہ بڑا طوفانی تھا۔

دوپہر کے وقت مسلمانوں کے کچھ دستوں میں ابتری پیدا ہوئی۔ ان پر رومیوں کا شدید دباؤ پڑ رہا تھا۔ پس انہوں نے پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ یہ دستے خالد بن ولید کے خیمے کی طرف پسپا ہو رہے تھے۔ وہاں خواتین اسلام تیار کھڑی تھیں۔

ابان کو جو شرجیل بن حسنہ کے دستے میں تھے انہوں نے رومیوں کو عورتوں کی طرف بڑھتے دیکھا تو وہ بنت عتبہ کی مدد کو چلے۔

ابان ابھی خواتین کے ٹیلے سے پرے ہی تھے کہ اوپر سے ان پر پتھر برسنا شروع ہو گئے۔ ابان نے گھبرا کر اوپر دیکھا۔ وہاں بنت عتبہ سب سے آگے تھی اور سب سے زیادہ تیزی سے پسپا ہونے والے مسلمانوں پر پتھر برسا رہی تھی۔

ابان نے گھوڑا روک کر بنت عتبہ کو آواز دی۔

''ثمن۔ ادھر دیکھو۔ میں ہوں تمہارا ابان۔''

مگر جواب میں ثمن (بنت عتبہ) نے تاک کر ایک پتھر ابان کے سر پر مارا۔

ابان نے جلدی سے سر گھما لیا مگر پتھر اس کے شانے کو زخمی کرتا ہوا آگے نکل گیا۔''

ابان زور سے چیخا۔

''ثمن پاگل ہو گئی ہو۔ مجھے پہچانو۔''

ثمن (بنت عتبہ) نے دوسرا پتھر اس پر برساتے ہوئے کہا۔

''ابان واپس جاؤ.......... مسلمان ہو تو واپس جاؤ.......... میرے شوہر ہو تو واپس جاؤ۔''

بنت عتبہ نے پھر نشانہ لے کر اسے پتھر مارا تھا۔ اگر ابان پھرتی سے گھوڑا موڑ کر ہٹ نہ جاتا تو اس کا سر ضرور زخمی ہو جاتا۔

ابان سمجھا کہ میری بیوی پاگل ہو گئی ہے۔ اس نے چیخ کر کہا۔

''ثمن۔ ہوش میں آؤ۔ میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ رومیوں کا دباؤ اس طرف بہت بڑھ گیا ہے۔ خواتین کی حفاظت میرا فرض ہے۔''

اس وقت ایک پتھر ابان کے گھوڑے کے سر پر لگا۔ گھوڑا ابدکا۔ ابان نے بڑی مشکل سے گھوڑے کو قابو میں کیا۔

پھر اوپر سے بنت عتبہ کی آواز سنائی دی۔

''عورتیں اپنی حفاظت کرنا جانتی ہیں۔ تم بزدل ہو۔ میدان چھوڑ کے آئے ہو۔ واپس جاؤ ابان ورنہ میں پتھر مار مار کر تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کے سر پاش پاش کر دوں گی۔ یہی میرا اور امیر لشکر کا حکم ہے۔''

ابان کی سمجھ میں نہ آیا کہ بنت عتبہ ایسی حرکت کیوں کر رہی ہے اس نے گھوڑا سنبھال کر پوچھا۔

''کیا امیر لشکر نے مسلمانوں کو پتھر مارنے کا حکم دیا ہے؟''

بنت عتبہ نے پھر پتھر مارتے ہوئے جواب دیا۔

''تم مسلمان نہیں۔ بزدل بھگوڑے ہو۔ امیر کا حکم ہے کہ بھاگنے والوں کے سر پتھروں سے اور ٹانگیں خیمے کی چوبوں سے توڑ دی جائیں۔ واپس جاؤ ابان۔ ورنہ خدا کی قسم میں پتھر مار مار کر تمہارا قیمہ بنا دوں گی۔''

اب ابان کو ہوش آ گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو واپسی کا اشارہ کیا۔ اس کے کئی ساتھی پتھروں سے زخمی ہو گئے تھے۔ عورتیں.......... اب بھی چیخ رہی تھیں۔

''ٹیلے پر سے واپس جاؤ۔ واپس جاؤ..................''

کے نعرے لگا رہی تھیں۔

ابان گھوڑا گھما کر پسپا ہوتے ہوئے دستوں کے پاس پہنچا اور چلا کر بولا۔

''رک جاؤ میرے ساتھیو۔ آج تمہارے قدم میدان میں نہ بڑھے تو کل مدینہ والوں کو کیا جواب دو گے۔ بڑھو بڑھو۔ آگے بڑھو اور دشمن کا منہ پھیر دو۔''

یہ کہتا ہوا ابان شیر کی طرح گرجتا رومیوں پر جا پڑا۔ پسپا ہونے والوں کے قدم رک گئے اور انہوں نے سنبھل کر ایسا زبردست حملہ کیا کہ رومیوں کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

شام ہوتے ہی خالد بن ولید' ابوعبیدہ بن جراح' عمرو بن العاص' شرجیل بن حسنہ' قعقاع بن عمرو' عمرو بن عدی' عکرمہ عمرو بن عمر اور یزید بن ابوسفیان نے رومیوں کے منہ پھیر دیئے۔ رومی سردار ابابان میدان جنگ میں مارا گیا۔ چالیس ہزار رومی گرفتار اور ایک لاکھ تیس ہزار رومی دریا میں غرق ہو گئے۔ خالد بن ولید گھوڑے سے اتر کر سربسجود ہو گئے۔

مسلمانوں کو فتح عظیم ہوئی تھی۔ جنگ یرموک میں ساڑھے تین ہزار مسلمانوں نے شہادت پائی جن میں عکرمہ اور ان کے بیٹے عمرو بن عکرمہ بھی تھے۔ ان دونوں نے خالد بن ولید کے زیر اثر جنگ کی اور ان کے زانو پر آخری ہچکی لی۔ جنگ یرموک میں ابوسفیان کی دوسری آنکھ بھی ضائع ہو گئی۔

رات کو جب ابان اور بنت عتبہ کی ملاقات ہوئی تو دونوں ہی اپنی اپنی جگہ شرمسار اور چپ چپ تھے۔ ابان نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''جان ابان! نظریں اٹھاؤ۔ میں تم سے شرمندہ ہوں۔''

بنت عتبہ نے آہستہ آہستہ دلہنوں کی طرح سر اٹھایا اور آنکھیں کھولیں۔

بنت عتبہ کی اس ادا پر ابان تڑپ اٹھا اس نے بڑھ کر بنتِ عتبہ کے ہاتھوں پر محبت کے کتنے ہی پھول نچھاور کر دیئے۔

بنت عتبہ نے سمٹتے ہوئے کہا۔

''ابان! میں بھی تم سے شرمندہ ہوں۔''

''کیوں تم کیوں شرمندہ ہو۔ غلطی میری تھی۔ مجھے سزا مل گئی۔'' یہ کہتے ابان نے اپنا وہ شانہ سہلانا شروع کیا جس پر بنت عتبہ کا پتھر لگا تھا۔

بنت عتبہ نے جلدی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

پھر پوچھا۔

''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔''

ابان شوخی سے بولا۔

''یہ بات تو پتھر مارنے سے پہلے سوچی ہوتی۔''

''وہ میرا فرض تھا ابان۔ میں مجبور تھی۔'' بنت عتبہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

ابان کو اسے چھیڑنے میں لطف آ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔
''اگر میں پتھر کھا کر بھی تمہاری طرف بڑھتا رہتا تو تم کیا کرتیں؟''

''تو ....تو میں............'' بنت عتبہ سنبھل کے بولی۔'' تو میں اس قدر پتھر برساتی کہ تم اور تمہارا گھوڑا زمین پر لیٹ جاتے۔''

ابان نے اور چھیڑا.................. ''اور اگر میں زخمی ہونے کے باوجود تمہارے پاس پہنچ جاتا تو؟''

بنت عتبہ نے اسی متانت سے کہا۔
''اس وقت میں خیمے کی چوب سے تمہارا سر پھاڑ دیتی اور ٹانگیں توڑ دیتی۔''
''اگر میں نہ مرتا اور تمہاری طرف بڑھتا ہی رہتا تو۔''

ابان جیسے لاجواب کرنا چاہتا تھا۔

بنت عتبہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولی۔

''اگر تم پھر بھی باز نہ آتے تو میں خدائے واحد کی قسم اس وقت میں امیر لشکر کا حکم نظر میں رکھتے ہوئے اپنی کمان میں تیر جوڑتی اور وہ تیر تمہارے سینے کے پار ہو جاتا۔''
''شاباش ثمن۔ تم صحیح معنوں میں شہید کی بیٹی ہو۔''

اور ابان نے وفور محبت سے اسے گلے لگا لیا۔

''مجھے تم پر فخر ہے۔ تم نے امیر لشکر کے حکم کو سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ سپاہی کا پہلا فرض اپنے امیر کی اطاعت ہے۔''
''کیا آپ نے مجھے معاف کر دیا؟'' اب بنت عتبہ نے اسے چھیڑا۔

ابان ہنس کے بولا۔

''اب تم مجھ سے بدلہ لے رہی ہو۔ تم نے امیر لشکر کی اطاعت کا اظہار کیا ہے۔ تم تو مبارک باد کے لائق ہو لیکن یہ تو بتاؤ کہ اگر میں تمہارے ہاتھ سے مارا جاتا تو تم کیا کرتیں؟''

بنت عتبہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔
''خدا نہ کرے کہ ایسا ہوتا اور اگر خدا کو یہی منظور ہوتا تو یقین کرو ابان' میں تمہاری لاش پر لات مار کر اپنے خیمے میں چلی جاتی۔''
''کیوں؟'' ابان چونک کے بولا۔'' کیا تم میری بیوی نہیں ہو۔ بیوی کا فرض ہے کہ مرنے والے شوہر کا سوگ منائے۔''

بنت عتبہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''ابان! ایک عرب عورت کے لئے اس سے بڑی اور کوئی بے عزتی نہیں کہ اسے ایک بزدل اور بھگوڑے کی بیوی کے نام سے پکارا جائے۔''

ابان کے دل میں بنت عتبہ کی عزت اور زیادہ ہوگئی۔

یہ دونوں باتیں کر ہی رہے تھے کہ خالد بن ولید کا آدمی ابان کو بلانے آگیا۔ ابان گھبرا گیا۔ اس نے قاصد سے پوچھا۔

''بھائی تمہیں کچھ پتہ ہے۔ امیر محترم نے مجھے کیوں یاد کیا ہے؟''

''مجھے کوئی علم نہیں۔'' قاصد نے قطعی انکار کر دیا۔

''امیر اکیلے ہیں یا ان کے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔'' ابان نے دوسرا سوال کیا۔

قاصد نے بتایا۔

''تمام سردار اکٹھے بیٹھے ہیں۔''

ابان کی پریشانی بڑھ گئی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس نے خیموں کی طرف جانے کی غلطی کی ہے اس کا جواب طلب کیا جائے گا۔

بس ابان نے افسردگی سے کہا۔

''میں نے امیر کی نافرمانی کی ہے ثمن (بنت عتبہ)۔ مجھ سے جواب طلب کیا جائے گا۔''

بنت عتبہ مسکرا کے بولی۔

''ابان۔ یہ بات تو پہلے ہی سوچنا چاہئے تھی۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہو..................'' ابان نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ ''تمہاری محبت نے مجھے اس وقت اندھا کر دیا تھا۔''

پھر اس نے پلٹ کے قاصد سے سوال کیا۔

''کیا میں اکیلا چلوں؟''

''نہیں۔ امیر نے آپ کی بیوی کو بھی طلب کیا ہے۔''

''مجھے؟'' اور بنت عتبہ کا رنگ فق ہوگیا۔

ابان کو موقعہ مل گیا۔ اس نے فوراً کہا۔

''اب تک تو خوب بول رہی تھیں۔ اب چلو میرے ساتھ۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔''

خالد بن ولید تمام جلیل القدر سرداروں کے ساتھ ایک میدان میں بیٹھے تھے۔ وہاں نہ فرش وفروش تھا اور نہ قالین اور گاؤ تکئے۔ تمام لوگ آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ اوپر آسمان پر چاند چمک رہا تھا۔

دونوں میاں بیوی ڈرتے ڈرتے ان کے سامنے پہنچے۔ دونوں نے حاضرین کو سلام کیا۔

ابان کے بولنے سے پہلے شرجیل بن حسنیٰ نے کہا۔

''ابان کی میں نے بہت تعریف سنی ہے اسی جوان نے جنگ اجنادین میں رومی سردار قبقلان کا سر اتارا تھا۔''

''تعجب کی بات ہے۔'' خالد بن ولید بولے۔'' ایسا بہادر سردار ایسی سخت غلطی کرے۔ کیوں ابان! تم اپنی جگہ چھوڑ کے خیموں کی طرف کیوں گئے تھے؟''

اس دفعہ ابان کے بجائے بنت عتبہ نے جواب دیا۔

''امیر محترم! یہ غلطی ابان نے میری وجہ سے کی ہے۔ انہوں نے رومیوں کو خیمے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا تو ان کے دل میں محبت نے جوش مارا اور وہ مجھے بچانے کے لئے میدان چھوڑ کے پیچھے آ گئے۔ اے امیر محترم! یہ ابان کی سخت غلطی ہے۔ ان کے دل میں لشکر اسلام کی محبت کی بجائے صرف اپنی بیوی کی محبت پیدا ہوئی۔ میں بنت عتبہ ان کی بیوی ہوں مگر میں ان کی سفارش نہ کروں گی۔ ابان کو سزا ملنی چاہیئے۔''

خالد بن ولید نے مسکرا کے کہا۔

''بنت عتبہ! تم ان کی سفارش نہ کرو تب بھی ہم انہیں سزا نہیں دے سکتے۔ تم سے پہلے ہی ان کی دو سفارشیں ہمارے پاس پہنچ چکی ہیں۔''

''تو کیا آپ انہیں معاف کر دیں گے امیر محترم۔'' بنت عتبہ نے غم اور خوشی کے ملے جلے لہجے میں پوچھا۔

خالد بن ولید نے بنت عتبہ کو کوئی جواب نہ دیا۔ انہوں نے ابان سے پوچھا۔

''ابان! تمہاری بیوی نے تمہیں کتنے پتھر مارے تھے اور ان پتھروں سے کیا تمہیں چوٹ آئی تھی؟

ابان کی شرم کی وجہ سے گردن نہ اٹھتی تھی۔ اس نے کہا۔

''امیر محترم! مجھ پر اور میرے ساتھیوں پر اوپر سے لاتعداد پتھروں کی بارش ہو رہی تھی لیکن امیر مکرم! یہ میری غلطی تھی۔ میں اپنی غلطی کے لئے سخت شرمندہ ہوں اور ہر سزا کے لئے تیار ہوں۔''

خالد بن ولید نے کہا۔

''بنت عتبہ! کیا تم نہیں جانتیں کہ''اعتراف جرم'' جرم کی شدت کو کم نہیں کرتا ہے پھر ابان کی یہ سزا کیا کم ہے کہ تم نے خود اسے مار مار کے زخمی کر دیا ہے۔ تمہارا اپنے شوہر کو خلوص نیت سے پتھر مارنا ابان کے لئے سفارش بن گیا۔ اس کے بعد ابان نے دوسری سفارش کی تھی۔ ان حالات میں جبکہ مجرم کو اپنے جرم سے زیادہ سزا مل چکی ہو اور اس نے خود اس کی تلافی کرنے کی سفارش کرنے کی کوشش کی ہو پھر ہم کیسے سزا دے سکتے ہیں؟''

ابان اور عتبہ نے دیکھا کہ تمام چہروں پر غصے کی سختی کے بجائے لطف وعنائت کی نرمی ہے۔

بنت عتبہ نے نرمی سے کہا۔

''امیر محترم! میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے میرے شوہر کو معاف کر دیا' پھر وہ ابان کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''اگر چہ ابان کا جرم معافی کے قابل نہ تھا۔''

اس پر خالد بن ولید نے ابان کو نصیحت کی۔

''ابان! یادرکھو کہ ایک سپاہی اور ایک پیادے کا اپنی صف سے نکلنا اور جگہ چھوڑ نا' صف بندی کی پوری ترتیب کو درہم برہم کر دینا ہوتا ہے۔ جب بھی کسی فوجی دستے نے امیر لشکر کے حکم کے بغیر اپنی جگہ چھوڑی۔ اسے اور اس کے لشکر کو نقصان اٹھانا پڑا۔ اب تم جاؤ اور آئندہ اس کا خیال رکھنا۔''

ابان واپس ہونے لگا تو خالد بن ولید نے سمجھایا۔

''ابان! اپنی بیوی کو ساتھ لے جاؤ۔ ہم نے اس نیک بیوی کو اس وجہ سے بلوایا تھا کہ تمہارے دل میں اس کی طرف سے میل آگیا ہو تو اسے دور کرا دیں تمہیں ایسی اصول پرست اور بہادر بیوی کی قدر کرنی چاہیے۔''

ابان اور بنت عتبہ خیمے کی طرف واپس ہوئے تو ابان نے اسے چھیڑا۔

''بڑی ظالم ہو تم۔ مجھے سزا دلوانے کی تو تم نے پوری کوشش کی تھی۔''

''امیر نے مجھے اصول پرست کہا ہے نا۔'' بنت عتبہ نے جواب میں کہا۔

''میں نے تو صرف اصول کی بات کہی تھی۔ چاہے اس سے تمہیں سزا ملتی یا معاف کر دیئے جاتے۔''

ابان نے جواب دیا۔

''اگر میں یہ کہہ دیتا کہ میری بیوی بہت دیکھ بھال کے اس طرح مجھے پتھر مار رہی تھی کہ مجھے کوئی پتھر نہ لگ سکے اور دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو کہ میری خوب پٹائی ہو رہی ہے تو پھر تمہارا حشر کیا ہوتا؟

بنت عتبہ نے چڑ کے کہا۔

''ابان اگر تم امیر کے سامنے یہ بات کہتے تو میں سمجھتی کہ میرا شوہر صرف بزدل ہی نہیں جھوٹا بھی ہے۔''

ابان نے ہاتھ بڑھا کر بنت عتبہ کا ہاتھ محبت سے پکڑ کر کہا۔

بنتِ عتبہ! انہی خوبیوں نے تو مجھے تمہارا غلام بنا رکھا ہے۔''

اس وقت مسلمانوں کے سپہ سالار محاذ جنگ ابوعبیدہ بن الجراح t تھے اور مسلمانوں کے سالار لشکر خالد بن ولید t تھے۔

ابوعبیدہ بن جراح t نے رومیوں کے لشکر عظیم کی پیش قدمی کی اطلاعات پا کر فوری طور پر خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق t کی خدمت میں کمک کی درخواست بھیجی جس پر خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق t نے طائف کے ناظم کو فوری طور پر کمک روانہ کر دی۔

اسلامی لشکر ابھی وادی یرموک میں ٹھہرا ہوا آئندہ قدم اٹھانے کے بارے میں صلاح و مشورے میں مصروف تھا کہ ایک شام مدینہ منورہ سے ایک قاصد وادی میں داخل ہوا اور اس نے امیر لشکر کا خیمہ دریافت کیا۔ اس وقت تک خالد بن ولید امیر لشکر تھے۔ تمام سرداروں نے فیصلہ کیا تھا کہ جب تک خالد بن ولید ملک شام میں ہیں وہی امیر لشکر رہیں گے۔ پس قاصد کو خالد بن ولید کے خیمے پر پہنچایا گیا۔

خالد اس وقت خیمہ میں تنہا تھے۔ قاصد نے انہیں سلام کر کے ایک خط ان کی طرف بڑھا دیا۔

خالد بن ولید خط کھول رہے تھے کہ قاصد نے کہا۔

''اے امیر لشکر! میں بہت افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دیتا ہوں خلیفۃ المسلمین جناب ابوبکر صدیق t نے انتقال فرمایا اور حضرت عمر فاروق t ان کے جانشین مقرر ہوئے ہیں۔''

حضرت خالد بن ولید اس افسوسناک خبر سے بہت افسردہ ہوئے۔ کچھ دیر افسردگی کے عالم میں خاموش بیٹھے رہے پھر خط پڑھا۔ یہ خط حضرت عمر فاروق t کی طرف سے تھا۔ اس میں درج تھا۔

''اے امیر لشکر! میں بہت افسوس کے ساتھ آپ کو حضرت ابوبکر صدیق t کی وفات کی اطلاع دیتا ہوں مزید یہ کہ خلیفہ اول نے انتقال فرمایا اور حضرت عمر فاروق t کو ان کا جانشین مقرر کیا گیا ہے۔''

حاضرین مجلس نے خلیفہ اول کے انتقال پر افسوس کیا اور ان کی جگہ حضرت عمر فاروق t کو بحیثیت خلیفہ دوم کی نامزدگی پسند کی۔ اس خط کے ذریعے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو پورے لشکر اسلام کا سپہ سالار بھی بنایا گیا تھا۔ حضرت خالد بن ولید اس وقت مستعفی ہو گئے۔ انہوں نے اس بات کا کوئی گلہ شکوہ نہ کیا۔

لشکر اسلام میں حضرت ابوبکر صدیق t کی وفات کی خبر سے افسردگی پھیل گئی اور ہر آنکھ نم ہو گئی۔ حالات کی سنگینی کے پیش نظر حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے حضرت عمر فاروق t کو فتح یرموک کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ فتح یرموک کی خبر پہلے ہی مدینہ پہنچ چکی تھی۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے اپنے خط میں خلیفہ دوم کو یہ بھی لکھا کہ۔

''یرموک میں رومی لشکر تقریباً تمام کا تمام ختم ہو گیا ہے مگر چالیس پچاس ہزار رومی بچ کر بھاگ نکلے ہیں اور اب وہ مقام ''فحل'' میں پڑاؤ ڈالے مزید کمک کے منتظر ہیں۔ دوسری اطلاع یہ ہے کہ قیصر روم نے 'یرموک' کی شکست کا حال سن کر ایک عظیم لشکر شام کے دارالسلطنت دمشق کی طرف روانہ کیا ہے۔''

حضرت عمر فاروق t نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کو حکم دیا کہ ایک مضبوط دستہ ''فحل'' کی طرف روانہ کیا جائے جو شکست خوردہ رومیوں کو الجھائے رکھے۔ باقی لشکر دمشق پہنچ جائے جو رومیوں کی آخری پناہ گاہ ہے۔

حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے اس حکم کے تحت ایک دستہ فوج فوراً ''فحل'' کی طرف روانہ کر دیا۔ انہیں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ دمشق کے رومی لشکر کو ''حمص اور فلسطین'' دونوں جانب سے برابر کمک پہنچ رہی ہے۔ حضرت ابوعبیدہ نے فوراً دو دستے حمص اور فلسطین کے راستوں پر لگوا دیئے تاکہ دمشق کو کمک نہ پہنچ سکے۔ اس انتظام کے بعد وہ شام کے صدر مقام کی طرف روانہ ہوئے۔

دمشق میں رومی لشکر کا سپہ سالار ''نسطار بن نسطورس'' تھا۔ فصیل شہر کے چاروں طرف چار دروازے تھے۔ فصیل کے چاروں طرف ایک گہری اور چوڑی خندق بھی تھی جو پانی سے ہر وقت لبالب بھری رہتی تھی۔ ایک دروازے سے دوسرے دروازے کا فاصلہ اتنا زیادہ تھا کہ اگر ایک دروازے پر جنگ شروع ہو جائے تو اس کی اطلاع دوسرے دروازے تک پہنچنے میں کئی گھنٹے لگ جاتے تھے۔ شہر دمشق کے مشہور دروازے نمبر ا باب جابیہ نمبر ۲ باب المشرق نمبر ۳ باب توما زیادہ مشہور تھے۔ باب توما کی حفاظت ہرقل اعظم کے داماد کے سپرد تھی۔ اس کا نام توما تھا جس نام سے یہ دروازہ

PDF BY MANZOOR

موسوم تھا۔

ہرقل اعظم کو لشکر اسلام کے دمشق کی طرف بڑھنے کی اطلاع پہنچی تو اس نے فوراً ''حمص'' سے تازہ دم لشکر روانہ کیا۔ ایک اور لشکر فلسطین سے بھی بھیجا گیا۔ دور اندیش لشکر اسلام نے اس کا انتظام پہلے ہی کر رکھا تھا پس مدد کو آنے والے لشکروں کو راستے ہی میں روک لیا گیا اور انہیں لڑائی میں ایسا الجھایا کہ وہ دمشق جانے کا راستہ بھول گئے۔

مسلمانوں کے حملے کی خبر پا کر نسطار بن نسطورس قلعہ بند ہو کے بیٹھ گیا تھا۔ حضرت ابوعبیدہ نے دمشق پہنچتے ہی دمشق کا محاصرہ کر لیا۔ باب مشرق پر خالد بن ولید' مغرب میں خود ابوعبیدہ بن جراح' شمال میں عمرو بن العاص اور جنوب میں باب توما پر شرجیل بن حسنٰی کو سردار مقرر کیا گیا تھا۔

ابان اب تک شرجیل بن حسنہ کے دستوں میں شامل تھا۔ یزید بن ابوسفیان کو محفوظ لشکر دیا گیا تھا کہ وہ بوقت ضرورت دوسرے دستوں کو کمک پہنچاتے رہیں۔

رومیوں کو کھلے میدان میں آنے کی جرأت نہ ہوئی۔ انہوں نے مدافعتی جنگ کا طریقہ اختیار کیا۔ مسلمانوں کے لئے دریا جیسی گہری خندق عبور کرنا آسان نہ تھا۔ وہ روز فصیل پر حملہ کرتے مگر اوپر سے تیروں کی ایسی بارش ہوتی کہ مسلمانوں کا کوئی بس نہ چلتا۔ شمشیر زنوں کی شمشیریں بیکار ہو رہی تھیں اور لڑائی صرف تیراندازی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ ہر دروازے پر صبح سے شام تک دونوں طرف سے تیراندازی ہوتی۔ رومی چونکہ فصیل کے اوپر تھے اس لئے ان کا کم نقصان ہوتا۔ مسلمان کھلے میدان میں ہونے کی وجہ سے انہیں زیادہ نقصان نہ پہنچا سکتے۔

اسلامی لشکر اس صورت حال سے پریشان تھا۔ پھر مسلمانوں نے مشکوں کے ذریعہ خندق پار کرنے کی کوشش کی۔ اس میں انہیں کامیابی بھی ہوئی لیکن خندق کے اس پار پہنچنے کے باوجود وہ فصیل تک نہ پہنچ سکے۔ اگر فصیل کے کسی دروازے پر لشکر اسلام کے چند سپاہی مشکوں کے ذریعہ خندق پار کر لیتے تو انہیں وہاں سامنے سے آنے والے سینکڑوں تیروں کا سامنا کرنا پڑتا اور آگے نہ بڑھ پاتے۔

محاصرہ طول پکڑتا جا رہا تھا۔ دس پندرہ دن پھر ایک مہینہ یہاں تک کہ پورے دو ماہ گزر گئے مگر مسلمانوں کو کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

بنت عتبہ کا شوہر ابان ایک سو سواروں کا رسالدار تھا۔ ایک شب اس نے اپنے سواروں کو اکٹھا کیا اور بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''تم میں کون سا ایسا مجاہد ہے جو میرے ہاتھ پر موت کی بیعت کرے گا۔''

موت کی بیعت کسی بہت ہی اہم موقعہ پر کی جاتی تھی۔ یہ دراصل شہادت کی ایک قسم تھی۔ قسم کھانے والے یہ سوچ لیتے تھے کہ جس کام کے لئے وہ جا رہے ہیں اس کام میں وہ اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔ ابان کے سواروں کو معلوم تھا کہ ابان بن سعید کی شادی نئی نئی ہوئی ہے اور ابھی اس جوان نے جوانی کی کوئی بہار نہیں دیکھی۔ مگر؟ انہوں نے یہ آواز سنی تو انہیں بہت غیرت آئی اور ایک ایک کر کے ابان کے تمام سواروں نے موت کی بیعت کر لی۔

اس وقت ابان مسرور لہجے میں بولا۔

''میرے ساتھیو! مجھے آسمان پر جنت کے دروازے کھلے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہم سے پہلے شہید ہونے والے ہمیں بلا رہے

ہیں۔ کل صبح ہم خندق ایک ساتھ پار کریں گے اور دمشق کی فصیل پر یا تو چڑھ جائیں گے یا پھر اپنی جانیں قربان کر دیں گے۔"

ابان کے ساتھی شہادت کی قسم کھا چکے تھے۔ انہوں نے ابان کو اور حوصلہ دیا۔ صبح کو جب میدانِ کارزار گرم ہوا تو ابان اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ خندق میں اترا۔ خواتین کا خیمہ اونچی جگہ نصب تھا۔ بنت عتبہ نے اپنے شوہر کو خندق میں اترتے دیکھا تو اس کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ بنت عتبہ خواتین میں بہت مقبول تھی۔ خواتین اس کے شوہر کو بھی پہچانتی تھیں۔ ان سب نے بنت عتبہ کو مبارک باد دی۔

ابان کو خندق پار کرتے دیکھ کر اور مزید کئی سو آدمی خندق میں اتر گئے۔ باب توما کا سردار توما قلعہ کے اوپر کھڑا ہوا مسلمانوں کی اس جرأت کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ توما کے قریب ہی دمشق کا ایک پادری صلیب اٹھائے کھڑا تھا۔ اسے بھی مسلمانوں کی اس جرأت پر بڑی حیرت ہوئی۔

ادھر ابان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اس پار پہنچا تو فصیل سے تیروں کی بارش شروع ہوگئی۔ ابان اور اس کے ساتھیوں نے ڈھالوں کو تلوار کے سہارے زمین میں گاڑ دیا اور ان کی آڑ میں لیٹ کر اور کہیں بیٹھ کے تیر اندازی شروع کی۔ اب تک فصیل والوں کو نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن ابان کی اس حکمت عملی سے فصیل والے مسلمانوں کی زد میں آگئے اور مسلمانوں کے تیروں نے انہیں زخمی کرنا شروع کر دیا۔

شرجیل بن حسنہ اور یزید بن ابوسفیان خندق کے اس طرف کھڑے بہادر ابان اور اس کے ساتھیوں کی محفوظ تیر اندازی دیکھ رہے تھے۔ شرجیل بن حسنہ کے دماغ میں فوراً یہ خیال گزرا کہ اگر پورا لشکر اس طرح خندق پار کرلے تو فصیل تک ضرور پہنچا جاسکتا ہے مگر مشکل یہ تھی کہ پورے لشکر کو پار اتارنے کے لئے ان کے پاس اتنے مشکیزے موجود نہ تھے۔ انہوں نے فوراً یزید بن ابوسفیان سے مشورہ کیا اور طے پایا کہ سپہ سالار سے اتنی تعداد میں مشکیزے مہیا کرنے کی درخواست کی جائے تاکہ پورا لشکر ایک ساتھ خندق عبور کر کے فصیل پر حملہ کر سکے۔

دو گھنٹے کی مسلسل تیر اندازی نے رومیوں کو کافی نقصان پہنچایا۔ رومی اب رک رک کر اور آڑ میں کھڑے ہو کر تیر پھینکنے پر مجبور تھے۔ اس دوران ابان کے سامنے تلوار کی ٹیک سے کھڑی ڈھال اتفاقاً گر پڑی اور فصیل سے آتا ہوا ایک تیر ابان کی ران میں پیوست ہوگیا۔ بہادر ابان نے چبھا ہوا تیر ران سے کھینچ کر دور پھینک دیا اور زخم پر عمامہ کی چٹ کی ایک پٹی کس کر باندھ دی۔ اسی وقت شرجیل بن حسنہ نے ابان اور دوسرے لوگوں کو واپس آنے کا حکم دیا۔ کیونکہ صرف چند سو تیر اندازوں سے فصیل والوں کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ رہا تھا ابان اور اس کے ساتھی موت کی بیعت کر چکے تھے لیکن سالار کے حکم پر انہیں واپس آنا پڑا۔

ابان جب واپس آیا تو شرجیل بن حسنہ نے اسے شاباش دیتے ہوئے کہا۔

"ابان!...... میں تمہاری بہادری سے بہت خوش ہوں۔ تم اور تمہارے ساتھی اگر چہ قلعہ والوں کو زیادہ نقصان نہ پہنچا سکے لیکن ہمیں اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ اگر تمام لشکر ایک ساتھ خندق پار کر جائے تو فصیل تک پہنچنا زیادہ مشکل نہیں۔"

ابان خاموشی سے امیر کی باتیں سنتے رہے۔ وہ کیسے کہتے کہ ان کے دل میں تو شہادت کی آرزو تھی جو پوری نہ ہوسکی۔ ابان نے خود کو اب تک سنبھالے رکھا تھا۔ وہ خود چل کے شرجیل بن حسنہ کے پاس پہنچے تھے اور اپنے پیر کی تکلیف کو چھپائے رکھا تھا۔ لیکن جب وہ واپس جانے لگے تو ان کے پیر لڑکھڑا گئے۔ شرجیل بن حسنہ نے فوراً بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ پھر ان کی نظر ابان کی ران پر بندھے ہوئے عمامے پر پڑی۔ شرجیل بن حسنہ

نے دریافت کیا۔

''ابان! یہ عمامہ اس پر کیوں باندھا ہے کیا کوئی زخم آیا ہے؟''

ابان صرف ''ہاں'' کہہ سکے۔ پھر ان کی زبان بھی لڑکھڑا گئی اور پھر وہ شرجیل کے ہاتھوں میں ہی بے ہوش ہو گئے۔ شرجیل بن حسنہ نے ابان کو فوراً اس کے خیمے میں بھجوا دیا۔

بنت عتبہ خیمے میں خوش بیٹھی تھی اور اپنے بہادر شوہر کا انتظار کر رہی تھی لیکن جب دو آدمی ابان کو ہاتھوں پر اٹھائے خیمے میں لائے تو وہ گھبرا گئی۔ ابان کی آنکھیں بند تھیں اور چہرے پر نیلاہٹ پھیلی تھی۔ اسی وقت مرہم پٹی کرنے والے آ گئے انہوں نے عمامہ کھول کر ابان کی ران کا زخم دیکھا۔ زخم کے چاروں طرف کا حصہ نیلا پڑ گیا تھا۔

ایک دانا طبیب نے تبصرہ کیا۔

''یہ زخم زہر بھرے تیر کا ہے۔''

دوسرے طبیب نے جھک کر زخم دیکھا اور اپنے ساتھی کی رائے کی تصدیق کی۔

بنت عتبہ بھاگ کر ابان کے پاس پہنچی۔ اس نے ابان کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ پھر ایک سسکی لی اور اس نے ابان کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیا۔

ایک طبیب نے جا کر سالار کو بتایا۔

''ابان کو زہر بھرے تیر کا زخم لگا ہے۔ زہر تمام جسم میں پھیل چکا ہے۔''

شرجیل بن حسنہ اور یزید بن ابوسفیان دونوں ہی ابان کو دیکھنے خیمے میں آ گئے۔ ابان کا سارا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں اور ہونٹوں پر کپکپاہٹ تھی۔

شرجیل بن حسنہ نے اپنا کان ابان کے ہونٹوں سے لگایا۔

''ثمن۔ تم کہاں ہو؟'' ابان کے ہونٹوں سے نحیف سی آواز آئی۔

شرجیل بن حسنہ نے اپنا سر الگ کرتے ہوئے بنت عتبہ سے کہا۔

''ابان تمہیں آواز دے رہے ہیں۔''

بنت عتبہ ابان پر جھک گئی اور بولی۔

''ابان! آنکھیں کھولو۔ ابان میں تمہارے پاس ہوں۔ تمہارا سر میری گود میں ہے۔''

ابان نے شاید زور لگایا۔ اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلیں۔ اس نے کہا۔

''میری آرزو پوری ہو گئی۔ میں عتبہ کے پاس جا رہا ہوں۔''

ابان نے یہ لرزتے ہونٹوں سے کہا پھر اس کی آواز بند ہوگئی۔ اسے ایک ہچکی سی آئی اور آنکھیں بند ہوگئیں اور بے چاری بنت عتبہ کے منہ سے ایک ٹھنڈی سانس نکلی۔ پھر وہ خالی خالی آنکھوں سے شرجیل بن حسنہ کو دیکھنے لگی۔

شرجیل بن حسنہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔

''بنت عتبہ! ابان نے موت کی بیعت کی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی شہادت قبول فرمائی۔ تمہیں غم نہیں کرنا چاہیئے۔''

بنت عتبہ نے آہستہ سے ابان کا سر اپنے زانو سے ہٹا کر فرش خاک پر رکھ دیا اور لاش سے یوں گویا ہوئی۔

''ابان! جس خدا کے حکم سے ہم اکٹھا ہوئے تھے اس کے حکم سے ہم آج جدا ہو گئے۔ مجھے اس جدائی کا غم نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں شہادت کا مرتبہ عطا کیا ہے تم اب میرے باپ کے ساتھ ہو لیکن میں تم سے زیادہ دنوں تک جدا نہ رہ سکوں گی۔ میں خدا کے حضور قسم کھاتی ہوں کہ میں رومیوں کے خلاف جہاد کروں گی اور اس وقت تک جہاد کرتی رہوں گی جب تک تمہارے پاس نہیں آتی۔ مجھے امید ہے کہ میرا خدا میری یہ آرزو ضرور پوری کرے گا۔''

خیمے کے اندر موجود تمام لوگ بنت عتبہ کے عہد اور باتوں پر رو دیئے۔ سب کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ ان کی آنکھوں کے سوتے جیسے خشک ہو گئے تھے۔

ذرا دیر بعد بنت عتبہ نے سالار لشکر سے کہا۔

''سالار محترم!...... میں اپنا عہد نبھانا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے جہاد کی اجازت دیجئے۔''

اس وقت تک خواتین کو براہ راست جہاد کی اجازت نہ تھی۔ ان کے سپرد فوجیوں کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال تھی۔ چنانچہ شرجیل بن حسنہ نے یزید بن ابوسفیان کی طرف دیکھا۔

یزید بن ابوسفیان نے بنت عتبہ کو سمجھایا۔

''میری نیک بیٹی! لشکر اسلام میں کسی طور سے بھی شرکت کرنا جہاد میں داخل ہے پس اس جہاد میں تم پہلے ہی شریک ہو۔''

''نہیں سپہ سالار!!!......'' بنت عتبہ نے ضد کی۔ ''مرحوم سے کئے ہوئے وعدے کو پورا کرنے میں آپ میری مدد کیجئے۔ میں ایک اچھی تیر انداز ہوں۔ مجھے تیر انداز دستوں میں شامل کر لیجئے۔''

شرجیل بن حسنہ نے بنت عتبہ کے غم کو ہلکا کرنے کے لئے اور اس خیال سے کہ تیر انداز دست بدست لڑائی سے ذرا دور ہی رہتے ہیں۔ بنت عتبہ کو جہاد کی اجازت دے دی اور اسے تیر اندازوں میں شامل کر لیا۔

اس اجازت سے تو بنت عتبہ کو جیسے اپنے زخموں کا مرہم مل گیا۔ ابان کی نماز جنازہ پڑھائی گئی۔ انہیں دفن کیا گیا لیکن شہید عتبہ کی بیٹی اور شہید ابان بن سعید بن عاص کی بیوہ نے اپنی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ ٹپکنے دیا۔ اس نے صبر و شکر کا ایسا مظاہرہ کیا کہ لشکر میں موجود تمام خواتین نے اس کی عظمت اور بردباری کی تعریف کی۔

بنت عتبہ پر وہ رات بہت بھاری گزری۔ اس کے باپ کا غم ابھی ختم نہ ہوا تھا کہ محبوب شوہر کے غم نے اسے تازہ صدمہ پہنچایا۔ شرجیل بن حسنہ کے حکم سے چار خواتین بنت عتبہ کے خیمے میں آ گئیں۔ تا کہ اسے تنہائی کا احساس نہ ہو۔ ان خواتین نے بنت عتبہ کا غم بھلانے کی بہت کوشش کی مگر وہ سینے پر پتھر رکھے تمام رات اپنے ترکش اور تیروں کی نوکیں درست کرتی رہی۔ اسے آج صبح ہونے کا بہت انتظار تھا۔

صبح ہوتے ہی بنت عتبہ نے ڈھیلے ڈھالے کپڑوں پر چادر کسی۔ سر پر رومال لپیٹ کر چہرے پر ڈھاٹا باندھا اور تیر کمان سنبھال کر تیر اندازوں کی صفوں میں شامل ہو گئی۔ دھوپ نکلتے ہی حسب معمول دونوں طرف کے تیر اندازوں نے اپنے جوہر دکھانے شروع کئے۔ بنت عتبہ کو رات ہی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے پیارے شوہر کا قاتل باب توما کا سپہ سالار توما ہے اس کے زہریلے تیر کے زخم سے ابان کا انتقال ہوا ہے۔

خندق کے کنارے تیر اندازوں نے مورچے بنا رکھے تھے۔ مورچہ میں پہنچ کے بنت عتبہ نے ایک تیر انداز سے توما کے بارے میں پوچھا۔ تیر انداز دیر تک فصیل پر نظریں دوڑا تا رہا پھر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''وہ دیکھو بہن! فصیل پر چھوٹے برج کے قریب ایک جگہ صرف دو سر قریب قریب نظر آرہے ہیں۔''

بنت عتبہ نے پوچھا۔

''وہ دو آدمی جس میں ایک کے ہاتھ میں جھنڈا ہے۔''

''ہاں بہن وہی۔'' تیر انداز نے جواب دیا۔ ''مگر وہ جھنڈا دراصل رومیوں کی ''صلیب مقدس'' ہے۔ صلیب کو ایک پادری لئے کھڑا ہے۔ اس کے برابر والا آدمی دراصل سردار ''توما'' ہے۔ رومیوں کو یہ یقین ہے کہ جب تک یہ فصیل پر ''صلیب مقدس'' لہراتی رہے گی، مسلمان قلعہ فتح نہیں کر سکیں گے۔''

تیر انداز کے یہ الفاظ بنت عتبہ کے کانوں سے ہوتے ہوئے دل میں اتر گئے۔ اس کے دل سے شوہر کے قاتل سے انتقام لینے کا خیال اک دم نکل گیا قصاص کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کی نظریں فصیل پر لہراتی صلیب پر جم کر رہ گئیں۔

بنت عتبہ سب کی نظریں بچا کر مورچے کے اوپر چڑھ گئی۔ اس وقت فصیل سے اسلامی مورچوں پر تیروں کی بارش ہو رہی تھی لیکن بنت عتبہ مورچے پر کھڑی اپنے قدم جما رہی تھی۔ تیر اندازوں نے اسے دیکھا تو چیخ چیخ کر اسے نیچے بلایا۔ بنت عتبہ نے ہر آواز سے کان بند کر لئے تھے۔ اس نے کمان سنبھالی۔ ترکش سے تیر نکالا۔ کمان میں چڑھایا پھر بسم اللہ شریف کہہ کر چلہ کھینچا۔ تیر ایک ''زوں'' کی آواز کے ساتھ کمان سے نکلا۔ موت اس تیر کے پیچھے پیچھے بھاگی۔ فصیل پر پہنچ کے بنت عتبہ کا تیر موت کا پیغام بن گیا اور سیدھا پادری کے سر میں پیوست ہو گیا۔ پادری ایک چیخ مار کر فصیل پر گرا اور اس کے ہاتھوں میں لہراتی ہوئی صلیب اعظم چھوٹ کر لہراتی ہوئی فصیل کے نیچے جا گری۔

صلیب مقدس کو قلعہ کے باہر گرتے دیکھ کر دو پر جوش جوانوں نے خندق میں چھلانگیں لگا دیں۔ وہ تیرتے ہوئے پہنچے اور تیزی سے فصیل کی طرف بھاگے۔ رومیوں نے صلیب اعظم کو مسلمانوں سے بچانے کے لئے سینکڑوں تیر برسا دیئے۔ ایک مجاہد نے اس کوشش میں جان دے دی اور وہ تیروں کا لقمہ بن گیا مگر دوسرا مجاہد اپنی کوشش میں کامیاب ہوا اور فصیل کے پاس سے صلیب اٹھا کر لشکر اسلام میں واپس آ گیا۔ اب رومیوں نے

جھنجھلا کر اور زیادہ تیروں کی بارش کر دی۔

صلیب اعظم کو شرجیل بن حسنہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ صلیب دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ پھر جب انہیں بتایا گیا کہ صلیب بردار پادری کو ابان شہید کی بیوی نے اپنے تیر کا نشانہ بنایا تھا تو وہ اور زیادہ خوش ہوئے۔ انہوں نے بنت عتبہ کو بلا کر بہت شاباش دی۔

فصیل کے اوپر ہرقل اعظم کا داماد ''توما'' بلبلایا بلبلایا پھر رہا تھا۔ صلیب اعظم کا مسلمانوں کے ہاتھوں میں پہنچنا اور ایک مقدس راہب کا مارا جانا اس کے لئے شرم کا مقام تھا۔ یہ اس کے مذہب کی بھی توہین تھی۔ صلیب کے گر جانے سے رومیوں میں بددلی پیدا ہوگئی تھی۔ رومی سپہ سالار توما کو اور کچھ نہ سوجھا تو اس نے کھلے میدان میں مسلمانوں سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے حکم دیا کہ باب توما کھول کر مسلمانوں پر حملہ کیا جائے اور ان سے ''صلیب اعظم'' واپس چھینی جائے۔ توما کے اس اعلان سے رومیوں میں بہت جوش وخروش پیدا ہو گیا۔ اور آخر کار وہ صلیب کی بے حرمتی کا بدلہ لینے کے لئے قلعہ کا دروازہ کھول کے باہر نکل آئے۔

مسلمان تو اسی کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے رومیوں کو قلعہ سے نکلتے دیکھا تو وہ جان بوجھ کر خود ہی کچھ اور پیچھے ہٹ گئے تا کہ تمام رومی میدان میں آجائیں۔ رومی لشکر بڑے زور وشور سے باہر نکلنے لگے۔ تیر انداز دستے خندق سے ہٹ کر اپنے مخصوص ٹھکانوں پر پہنچ گئے۔ رومی تیر برساتے آگے آرہے تھے۔ مسلمان تیراندازوں نے تیر کا جواب تیر سے دیا۔

رومی سپہ سالار توما تھا۔ بنت عتبہ کو توما کی تلاش تھی۔ انتقام کی چنگاری اس کے دل میں پھر بھڑک اٹھی۔ توما بنت عتبہ کے پیارے شوہر کا قاتل اس کی نظروں کے سامنے تھا اور وہ میدان میں گھوڑا بھگا بھگا کر مسلمانوں پر زبردست حملے کر رہا تھا اس کا گھوڑا میدان میں بجلی کی طرح لپک رہا تھا۔

دونوں لشکر آپس میں گتھ گئے تھے۔ تیر نکالنے اور چلانے کا وقت گزر چکا تھا۔ نیزے اور تلواریں ہر طرف چمک اٹھی تھیں۔ مسلمان جم کر لڑ رہے تھے لیکن رومیوں کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ قلعہ سے سوار اور پیادے نکل نکل کر ان میں شامل ہوتے جارہے تھے۔ شرجیل بن حسنہ بڑھ بڑھ کے حملے کر رہے تھے اور لوگوں کو جوش دلاتے جارہے تھے لیکن اب دشمن کی تعداد اس قدر زیادہ ہوگئی تھی کہ اسے پیچھے دھکیلنا مشکل تھا۔

دوپہر تک سخت جنگ ہوتی رہی مسلمان تمام کوششوں کے کامیاب نہ ہو پارہے تھے معاً بنتِ عتبہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ ترکش کاندھے پر ڈال کے کمان سنبھالتی نیچے آئی اور بڑھتے بڑھتے اس جگہ پہنچ گئی جہاں رومی سالار توما لڑ رہا تھا۔ بنت عتبہ قدرے اونچی جگہ جا کر کھڑی ہوگئی۔

توما فولاد کے زرہ بکتر میں غرق تھا۔ سر پر آہنی کنٹوپ، گلے کے گرد آہنی زنجیریں باقی تمام بدن فولاد کی چادر میں لپٹا ہوا۔ صرف آنکھوں کے دائرے نظر آرہے تھے جن میں کسی کسی وقت آنکھیں دکھائی دے جاتی تھیں۔ اس لئے توما پر تیر چلانا بڑا مشکل تھا۔ تیر خطا ہو کر کسی مسلمان کو بھی لگ سکتا تھا۔ بنتِ عتبہ نے اللہ تعالیٰ کا نام لے کر کمان سنبھالی۔ ترکش سے تیر نکال کر اس میں جوڑا۔ اس نے توما کو نظروں میں دیکھ کے نشانہ باندھا۔ توما کے جسم پر تیر مارنا بالکل بے کار تھا۔ سوائے آنکھوں کے اُس کے جسم کا اور کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں تیر کام کر سکے اور متحرک گھوڑے پر بیٹھے متحرک آنکھ کو نشانہ بنانا ناممکن معلوم ہوتا تھا۔ لیکن بنتِ عتبہ کے کانوں میں اپنے محبوب شوہر آبان کی آواز گونج رہی تھی کہ ''آنکھ اس نقطے سے بڑی ہوتی ہے اس پر نشانہ لگانا مشکل نہیں۔''

توما کے گھوڑے اور اس کے جسم کے ساتھ ساتھ بنتِ عتبہ کی کمان گھومتی رہی۔ اس نے چلہ پوری طاقت سے کھینچ رکھا تھا۔ صرف تیر چھوڑنے کی دیر تھی۔ دیر تک توما اس کے نشانے پر آ آ کے نکلتا رہا۔ بنتِ عتبہ نے ہمت نہ ہاری اور پھر ایک بار بسم اللہ کے ساتھ بنت عتبہ کی کمان سے تیر نکلا اور سیدھا توما کی آنکھ میں پیوست ہو گیا۔ بنتِ عتبہ کا دل خوشی سے کھل اٹھا اور اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اُسے ایسے لگا جیسے ابان اسے دیکھ رہا ہو اور شاباش دے رہا ہو کیونکہ اس نے تو کہا تھا میدان جنگ میں متحرک آنکھ کو نشانہ لگانا مشکل ہے۔ بنت عتبہ نے یہ مشکل کام کر دکھایا تھا اور وہ آج سرخرو ہو گئی تھی۔

توما کی آنکھ میں تیر لگنا تھا کہ رومیوں میں کہرام مچ گیا۔ توما تکلیف سے چیختے چلانے لگا۔ رومیوں نے اسے گھیر لیا مسلمانوں نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک زبردست حملہ کیا۔ رومی اپنے سالار کو ڈھالوں کی آڑ میں لے کر پسپا ہونے لگے۔ بھاگنے والوں پر تیر اندازوں نے تیروں کی بارش کر دی۔ بنتِ عتبہ کی کمان سے بھی زناز ن تیر نکلنے لگے۔ بنتِ عتبہ تیر پھینکتی جاتی اور رجزیہ اشعار پڑھتی جاتی۔

''اے ابان کی بیوہ! اے شہید کی بیٹی! تو اپنا انتقام لینے کے لئے دشمنوں پر تیر برساتی جا۔ رومیوں نے تیرے تیروں کی ہلاکت سے ڈر کر چیخ و پکار شروع کر دی ہے۔''

وہ رومی لشکر جو بڑے جوش سے صلیبِ اعظم کو واپس لینے کے لئے قلعہ سے نکلے تھے۔ وہ اپنے پیچھے کئی سو لاشیں چھوڑ کے قلعہ میں واپس جا چکے ہیں۔ رومی توما کو بچا کر تو لے گئے لیکن بنتِ عتبہ کا تیر اب تک اس کی آنکھ میں پیوست تھا۔ بنت عتبہ کے انتقام کا یہ تیر توما کی آنکھ سے نہ نکل سکا۔ قلعہ کے تمام جراحوں نے کوشش کی مگر ناکام رہے۔ آخر تیر کی لکڑی کاٹ دی گئی اور آہنی نوک توما کی آنکھ میں رہ گئی۔

توما کی آنکھ کی مرہم پٹی ہوئی تو اسے کچھ سکون ملا۔ لیکن اس سکون کے ساتھ انتقام کا جذبہ پھر اس کے دل میں بھڑک اٹھا۔ دوسرے سرداروں نے توما کو بہت سمجھایا مگر وہ انتقام میں اندھا ہو رہا تھا پس وہ قلعہ کا دروازہ کھول کر پھر مسلمانوں پر حملہ آور ہوا۔ بڑی شدید جنگ ہوئی لیکن عصر کے بعد توما کو پھر میدان چھوڑ کر قلعہ میں بند ہونا پڑا۔ صلیب کے غم کے ساتھ آنکھ کے ضائع ہونے کے غم نے اسے بالکل پاگل بنا دیا۔ وہ تمام رات بپھرے ہوئے شیر کی طرح کبھی فصیل تو کبھی قلعہ کی راہداریوں میں بھاگا بھاگا پھرتا رہا۔

ابھی رات کافی باقی تھی کہ توما کے سر پر انتقام کا جنون پھر سوار ہو گیا۔ اس نے شب خون مارنے کے لئے کئی ہزار سپاہی فصیل کے نیچے اتارے اور انہیں لے کر مسلمان خیموں کی طرف بڑھا۔ مسلمان پہلے ہی ہوشیار تھے۔ انھوں نے رومیوں کا شب خون بیکار کر دیا اور مقابلے پر نکل آئے۔ اس وقت بھی سخت لڑائی ہوئی۔ لڑتے لڑتے سویرا ہو گیا۔ رومیوں کی باقی فوج بھی دروازہ کھول کر باہر آ گئی اور ایسے گھمسان کا رن پڑا کہ زمین و آسمان کانپ اٹھے۔ توما کو گھوڑا پہنچا دیا گیا۔ اسے سواروں کی مدد حاصل ہوئی تو اس کے حملے میں اور شدت آ گئی۔

توما بڑا سخت جان تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود وہ بڑھ بڑھ کے حملے کر رہا تھا۔ اسے تیر مارنے والے کی تلاش تھی اور تیر مارنے والی ابان کی بیوہ بنتِ عتبہ خود اس کے قریب پہنچ جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ تیر چلا چلا کر توما کے قریب جانے کے لئے راستہ بنا رہی تھی۔ توما اس سے کافی دور تھا بنتِ عتبہ کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

لڑتے لڑتے توما نے للکارا۔

''کہاں ہے وہ کم بخت جس نے مجھے تیر مارا ہے۔''

بنت عتبہ کے کانوں تک یہ آواز نہ پہنچ سکی۔ سپہ سالار شرجیل بن حسنہ نے توما کی آواز سنی تو گھوڑا اچکار کے رومیوں کو مارتے کاٹتے توما کے قریب پہنچ گئے۔

شرجیل بن حسنہ نے گرج کے کہا۔

''توما تو میرے ہاتھ سے بچ گیا۔اب بچ کے نہیں جاسکتا۔''

پر شرجیل بن حسنہ نے تلوار کا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ اگر رومی سواروں کی کئی ڈھالیں سامنے نہ آجاتیں تو اس کے دو ٹکڑے ہوجاتے۔توما گھبرا کے پیچھے ہٹ گیا۔کئی رومی سردار شرجیل کے آگے دیوار بن کر کھڑے ہوگئے۔لڑائی کچھ اور تیز ہوگئی۔

بنتِ عتبہ کا ترکش خالی ہوگیا۔اب اس کی کمان میں آخری تیر تھا۔وہ چاہتی تھی کہ وہ اس آخری تیر کو بھی توما پر صرف کرے مگر اس کی یہ آرزو پوری نہ ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔توما اس سے بہت دور تھا۔بنتِ عتبہؓ کمان سیدھی کئے ہوئے رومیوں میں گھس گئی۔بنتِ عتبہ کا چہرہ پوشیدہ تھا رومی یہ تو نہ پہچان سکے کہ وہ عورت ہے مگر انہوں نے بنتِ عتبہ کو گھیر لیا۔ایک رومی تو بالکل اس کے قریب پہنچ گیا۔بنت عتبہ کو مجبوراً اپنا آخری تیر اس پر استعمال کرنا پڑا۔رومی تیر کھا کر گرا اور ٹھنڈا ہوگیا۔بنتِ عتبہ کے قریب بہت سے لوگ پہنچ چکے تھے۔ان میں سے ایک نے کمند ڈال کر بنتِ عتبہ کو گرفتار کرلیا۔بنتِ عتبہ نے بہت ہاتھ پیر مارے لیکن رسیاں اس کے جسم کے گرد لپٹ گئی تھیں۔

رومی بنتِ عتبہ کو گھسیٹے لئے جارہے تھے کہ عبدالرحمٰن بن ابوبکر اور ابان بن عثمان کی نظر اس پر پڑی۔وہ گھوڑے دوڑا کر رومیوں کے سر پر آگئے اور ایک ہی حملے میں رومیوں کو مار بھگایا۔انھوں نے فوراً بنتِ عتبہ کے گرد لپٹی ہوئی رسیاں کاٹ کر اسے آزاد کر دیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ بنتِ عتبہ کو بچانے والے ابانؓ حضرت عثمان t کی بیوی ام عمرو بنتِ جذب رومی کے بیٹے تھے اور بنتِ عتبہ کے شوہر کا نام ابان بن سعید بن العاص تھا۔

خالد بن ولید t نے اس قدر فتوحات حاصل کی تھیں کہ ''فتح اور خالد'' دونوں الفاظ لازم وملزوم ہوکر رہ گئے تھے۔خالد بن ولید t نے اس وقت تک جتنی لڑائیاں لڑی تھیں ان سب میں وہ کامیاب رہے تھے لوگوں نے تو یہ بھی کہنا شروع کر دیا تھا کہ جس جنگ میں خالد بن ولید t شامل ہوں گے وہ جنگ مسلمان جیتیں گے پھر بھلا دمشق کا قلعہ ان کے ہاتھوں سے کیسے بچ سکتا تھا۔

محاصرہ دمشق کا اکہتر واں دن تھا۔شام ہی سے قلعہ کی فصیل پر چراغاں ہوگیا۔تمام مسلمان پریشان تھے کہ محصور کس بات کی خوشی منا رہے ہیں۔خالد بن ولید t بھی فکر مند تھے۔وہ اپنے لشکر کے ساتھ باب المشرف کے سامنے پڑاؤ ڈالے تھے۔ایک جاسوس نے انہیں بتایا کہ آج قلعہ کے بطریق (لارڈ پادری) کے یہاں جشن منایا جارہا ہے۔حضرت خالد بن ولید t اس خبر کو سن کر غور و فکر میں ڈوب گئے۔

جوں جوں رات بڑھتی گئی قلعہ کے شور وغضب میں زیادتی ہوگئی۔اس شور کے ساتھ قلعہ سے رقص وسرور کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ یوں

معلوم ہوتا تھا جیسے ہزاروں آدمی شراب پی کر ادھم مچا رہے ہیں۔ خالد بن ولید t کو شاید کسی ایسے ہی وقت کا مدت سے انتظار تھا۔ وہ نہایت صبر و تحمل سے یہ بے ہودہ غل غپاڑہ سنتے رہے وقت کے ساتھ ساتھ آوازوں میں کمی ہوتی گئی پھر آہستہ آہستہ فصیل وقلعہ پر سناٹا چھا گیا۔

خالد بن ولید t خیمے سے نکلے۔ پندرہ بیس جانبازوں کو ساتھ لیا۔ نائب سالار کو بلا کر ہدایت کی کہ پورے لشکر کو نہایت خاموشی سے تیار رکھا جائے اور اللہ اکبر کے نعرے کا انتظار کیا جائے پھر وہ معہ اپنے جانبازوں کے خندق میں اترے اور تیرتے ہوئے پار پہنچ گئے۔ فصیل اور خندق کا درمیانی فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ وہ رینگتے ہوئے فصیل کے پاس آ گئے۔ خالد بن ولید t نے کمند نکال کر اوپر پھینکی۔ کمند کی ڈور فصیل کے کنگورے میں پھنس گئی۔ سب سے پہلے خالد بن ولید t اوپر پہنچے ان کے بعد تمام جانباز ایک ایک کر کے اوپر پہنچ گئے۔

فصیل پر گہری خاموشی طاری تھی۔ کسی کا دور دور تک پتہ نہ تھا۔ یہ لوگ تلواریں بلند کر کے زینہ اترے اور آہستہ آہستہ قلعہ کے دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازے کے قریب پہنچے تو جاگ ہوگئی۔ پہریدار چونک کے نیزے تانے ان کی طرف بڑھے۔ خالد اور ان کے جانبازوں نے انھیں پوری طرح سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور بجلی جیسی تیزی کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑے۔ کچھ جانبازوں نے دروازے کی ٹیک اور زنجیر الگ کر کے دروازہ کھول دیا۔ دروازے کا کھلنا تھا کہ نعرۂ تکبیر کے فلک شگاف نعروں سے قلعہ کے در و دیوار لرز اٹھے۔ لکڑی کے پل خندق پر ڈال دیئے گئے اور خالد کا لشکر آناً فاناً قلعہ میں داخل ہوگیا۔ رومی سالار توما شراب کے نشہ میں دھت پڑا تھا۔ اسے جگایا گیا۔ وہ بھاگ کے آیا۔ رومی لشکر بھی تیار ہو کر آ گیا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ خالد بن ولید کو قلعہ سے نکالنا یا شکست دینا ناممکن تھا۔ چنانچہ لڑائی ہوئی اور خوب خوب ہوئی یہاں تک کہ لڑتے لڑتے سویرا ہو گیا۔

باب توما سے مسلمانوں کے داخل ہونے کی خبر پورے قلعہ میں پھیل گئی۔ باب جابیہ کے قلعہ دار نے یہ سنا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے لیکن آدمی جہاندیدہ تھا۔ اس نے فوراً جنگی چال چلی۔ جلدی سے دروازہ کھلوایا اور چند سواروں کے ساتھ ابوعبیدہ بن جراح t کے خیمہ پر پہنچ کے ہتھیار ڈال دیے۔ شرط یہ ٹھہری کہ قلعہ والوں کی جان و مال کی حفاظت ہوگی۔ ابوعبیدہ بن جراح t نے قول دے دیا اور مصالحانہ طریقے سے اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ میں داخل ہوئے۔

ادھر باب توما س کا لشکر شکست کھا کر ہتھیار ڈال چکا تھا۔ خالد بن ولید t فاتحانہ انداز سے آگے بڑھ رہے تھے۔ قلعہ کے درمیان میں ابوعبیدہ بن جراح t اور خالد بن ولید t کا سامنا ہوا۔ اس وقت عقدہ کھلا کہ رومیوں نے اپنی فطری چالاکی سے ابوعبیدہ t سے مصالحت کر کے قول لے لیا ہے حالانکہ قلعہ خالد بن ولید t نے طاقت سے فتح کیا تھا۔ خالد بن ولید t نے بڑی فراخدلی سے ابوعبیدہ بن جراح t کی بات رکھی اور کوئی شکوہ نہ کیا۔ ابوعبیدہ بن جراح t نے بھی اُسی فراخ دلی کا ثبوت دیا۔

صلاح نامہ جو تیار ہوا وہ خالد بن ولید t کی طرف سے لکھا گیا۔ حالانکہ اسلامی لشکر کے سپہ سالار ابوعبیدہ بن جراح t تھے۔

بہادر جنگجو سپاہی بنتِ عتبہ اگر چہ شہادت کی سعادت حاصل نہ کر سکی لیکن اسے زندگی بھر یہ فخر حاصل رہا کہ فتح دمشق میں اس کے محبوب شوہر ابان کا خون بھی شامل ہے۔

ملکہ خیزراں......ایک تعارف

ایک البیلی اور الھڑلڑکی کی کہانی جو نوعمری میں یتیم ہوگئی اور جس کو اس کے نانا نانی نے پال پوس کر بڑا کیا لیکن ابھی نوجوانی کے حسن نوخیز سے پوری طرح لطف اندوز نہ ہوئی تھی کہ گھر باڑلٹ گیا اور کنیز بن کر ایک بردہ فروش کے ہتھے چڑھی جس نے اسے خراسان سے لا کر بغداد میں بیچا بغداد جو دوسری صدی ہجری کے اوائل میں عباسیہ حکمرانوں کا حسین وجمیل دارالخلافہ تھا اور اپنے عروج کی جانب گامزن تھا جہاں کے عباسی خلفاء حسن بے داد کے دلدادہ اور عشق لڑانے میں اپنی مثال آپ تھے اسی بغداد کے عباسی شہزادے اور ولی عہد مہدی نے اپنی رنگین طبع کی نگاہوں سے بردہ فروش کے سارے مال میں سے اس نوخیز نوجوانی کا انتخاب کیا لیکن خیزران کی منہ زور جوانی اور تیکھے حسن کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس کی منہ مانگی قیمت بردہ فروش کو ادا کرنے پر مجبور ہوگیا کیونکہ خیزران نے انتہائی دلفریب اور حسن ربا نظارے کے ساتھ اپنی قیمت خود لگائی تھی۔

جس کے بارے میں اس دور کے مشہور نجم اور حساب دان خالد برمک جو کہ شہزادہ مہدی کا استاد اور اتالیق تھا نے پیش گوئی کی تھی کہ عنقریب یہ نوخیز لڑکی سارے سلطنت عباسیہ پر حکمرانی کرے گی اور کچھ ہی عرصہ بعد یہ پیش گوئی اس طرح پوری ہوئی کہ خیزران شہزادہ مہدی کی دلہن بنی اور قسمت کی یاوری سے مہدی کے خلیفہ بنتے ہی ملکہ بن گئی اور اپنی خداداد صلاحیت کی بدولت اس کے خلیفہ مہدی پر ایسا جادو چلایا کہ وہ جیسے چاہتی سلطنت کا اعلیٰ عہدہ عطا کرتی اور جس سے چاہتی اس کا اقتدار چھین کر اسے ادنیٰ ترین سطح پر پٹخ دیتی اس طرح اس کی مخالفت کرنے والے کو سب سے پہلے یہ سوچنا پڑتا تھا کہ کیا وہ اس کا عتاب اور عقوبت سہنے کے قابل ہے یا نہیں۔

مہدی چاہتا تھا کہ وہ اپنا ولی عہد سلطنت اپنے بڑے لڑکے ہادی کو بنائے لیکن خیزران اپنے بیٹے ہارون کو مسند اقتدار پر دیکھنا پسند کرتی تھی لیکن خیزران نے اپنے تدبر اور فراست سے سیاست کا ایک ایسا جال بچھایا کہ مہدی کے بعد ہادی کو اقتدار سلطنت سنبھالنا از حد مشکل ہوگیا اور اسے اس دنیا سے دارفنا کی جانب کوچ کرنا پڑا اور اس طرح ملکہ خرزان کی راہ سے وہ تمام مخالفانہ رکاوٹیں دور ہوگئیں جس سے اس کے شاہی اعزاز واکرام کی توہین ہوتی تھی خلیفہ ہارون رشید نے حکومت سنبھالتے ہی ملکہ خیزران کو اپنی من مانی کرنے کی کھلی چھٹی دے رکھی اور مرتے دم تک اس کا طنطنہ اور رعب داب تمام دنیا پر قائم ودائم رہا اور وہ بڑی شان کے ساتھ اس دنیا سے دارفنا کی جانب کوچ کر گئی۔

☆ ☆ ☆

ملکہ خیزراں

ہرنی بھاگ رہی تھی اور شکاری کتے بھونکتے ،غراتے اُس کا پیچھا کر رہے تھے۔

وہ ہرنی ہی تو تھی۔ گیارہ سال کی بچی۔ یمن کے مرغزار میں اُڑتی پھرتی تتلی۔ سامنے جرش کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اُس میں ایک چھوٹا سا جھونپڑا۔ اُس کا گھر اور اُس کا گاؤں اُس کی کُل دنیا اور کُل کائنات تھی۔ ماں باپ دو ماہ کا چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ نانا نانی نے پالا تھا۔ اُن کے سوا اُس کا اور کوئی نہ تھا۔

اُونچی نیچی پگڈنڈیوں اور نم کھیتوں میں بھاگتے بھاگتے اُس کا سانس پھُول گیا۔ بردہ فروشوں کا گروہ اُسے پکڑنے پر بضد تھا۔ آخر پکڑی گئی جیسے شکاری کتے ہرن کو پکڑ لیتے ہیں۔ بردہ فروشوں کے سردار نے اُس کی گردن پر ہاتھ ڈالا تو اُس نے ذرا پلٹ کر اُس کے ہاتھ پر کاٹ لیا اور پھر بھاگی۔ آخر کار پھر پکڑی گئی۔ گاؤں والے اپنی جانیں بچا کر گھروں میں گُھسے ہوئے تھے کسی کو کسی کی فکر نہ تھی سوائے اپنے۔

خیزراں دبلی پتلی، نازک اندام، ستواں ناک، سرخ و سفید چہرہ، کمر تک لٹکے ہوئے بال، جھوم کے چلتی تو بید کی شاخوں کی طرح لہراتی نظر آتی۔ اسی لئے لوگ اُسے خیزراں کہتے تھے۔

بردہ فروش اُسے ایک بڑے کیمپ میں لے آئے جہاں اُس جیسی بہت سی لڑکیاں، عورتیں اور مرد پہلے ہی سے موجود تھے۔ اُس کے ہاتھ باندھ دیے گئے اور پیروں میں زنجیر ڈال دی گئی۔

کئی روز تک وہ کیمپ میں قید رہی اور دارو گیر کا سلسلہ جاری رہا۔ اُس دور میں بردہ فروشی عام تھی۔ پکڑے ہوئے مرد اور عورتیں سرِ بازار فروخت ہوتے۔ اُن کا نیلام ہوتا اور بولی دی جاتی۔ جس کی بولی زیادہ ہوتی اُس کے حوالے وہ مرد، عورت اور بچے بچیاں کر دی جاتیں اور وہ ہمیشہ کے لئے اُس کا مالک ہو جاتا۔ کوئی داد و فریاد نہ تھی۔ بردہ فروشی ایک مستند پیشہ بن چکا تھا۔

یہ دوسری صدی ہجری کا زمانہ تھا۔ ابو مسلم خراسانی قتل ہو چکا تھا اور ابو جعفر منصور عباسی تخت پر متمکن تھا۔ بغداد جو پہلے ایک گاؤں تھا اُسے اِس خلیفہ نے ایک عظیم الشان شہر میں بدل دیا تھا۔

نیا بغداد دجلہ اور فرات کے قریب تعمیر ہوا۔ وسط شہر میں شاہی محلات تعمیر کیے گئے۔ شہر پناہ کے چار دروازے تھے۔ ہر دروازے کے درمیان ایک میل کا فاصلہ تھا۔ ہر دروازے پر لوہے کے بڑے بڑے پھاٹک نصب کیے گئے تھے۔ پھر جامع مسجد، شاہی محل کے لئے تعمیر ہوئی تھی۔ منصور نے شہر کو چوبیس ہزار محلوں میں تقسیم کیا تھا۔ ہر محلّے میں ایک مسجد اور ایک حمّام تھا۔ دریائے دجلہ سے بہت سی نہریں اِن مسجدوں تک پہنچائی گئی تھیں۔ نہروں کے کنارے چار ہزار سبیلیں رکھی جاتی تھیں۔ بغداد کی تعمیر پر اُس دور میں چار کروڑ، آٹھ لاکھ اور تین ہزار درہم خرچ ہوئے تھے۔ شہر کی

تمام سڑکیں چالیس چالیس ہاتھ چوڑی تھیں۔ پچاس ہزار مزدور دن رات کام کرتے تھے۔ کاری گر اور صناع موصل، کوفہ، واسط اور بصرہ سے بلوائے گئے تھے۔

بغداد دریائے دجلہ کے مغربی کنارے پر آباد ہوا تھا اور دریا کے مشرقی کنارے پر ۱۵۱ھ میں ایک اور شہر عباسی ولی عہد ابوعبداللہ محمد مہدی نے بسایا تھا۔ اس شہر کا نام ''رصافہ'' رکھا گیا تھا۔

عباسی اُمرا اور شہزادے، بردہ فروشوں کے اہم گاہکوں میں سے تھے۔ اس لئے بردہ فروش سب سے پہلے بغداد کا رُخ کرتے تھے۔ بغداد میں اُنہیں غلاموں اور کنیزوں کی منہ مانگی قیمت ملتی تھی۔

عباسی ولی عہد محمد مہدی گھوڑا اُڑاتا ہوا رصافہ جا رہا تھا۔ جوانی کا عالم، وہ سیر وشکار کا شوقین تھا حالانکہ مدینہ منورہ میں حضرت امام مالکؒ کے پاس رہ کر حدیث کی سندیں حاصل کی تھیں لیکن طبیعت رنگین پائی تھی۔ منصور نے اُس کی لااُبالی طبیعت کو دیکھ کر اُس کی شادی ایک عباسی امیر زادی ریطہ بن سفاح سے کردی تھی مگر مہدی کو پریشاں نظری پسند تھی۔ وہ ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں رہا کرتا تھا۔

بردہ فروش رسیوں سے بندھے ہوئے غلاموں اور کنیزوں کو گھسیٹتے ہوئے شہزادے کے قریب سے گزرے۔ شہزادے نے گھوڑا روک لیا۔

ولی عہد کا اتالیق خالد بن برمک ساتھ تھا۔ خوبرو امیرزادے کو دیکھ کر بردہ فروش بھی رُک گئے اور بردہ فروشوں کا سرغنہ شہزادے کے قریب آ گیا۔

شہزادے نے دریافت کیا۔

''کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟''

''بغداد۔'' سرغنہ نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' دوسرا سوال ہوا۔

''انہیں فروخت کرنے۔'' سرغنہ نے بندھے ہوئے قیدیوں کی طرف اشارہ کیا۔

شہزادے نے قیدیوں پر ایک طائرانہ نظر ڈالی اور اُس کی نظریں خیزراں پر آ کر رُک گئیں۔

''یہ لڑکی'' شہزادے نے خیزراں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

سرغنہ نے خیزراں کا ہاتھ پکڑ کر اُسے گھسیٹا اور شہزادے کے قریب لے گیا۔

خیزراں نے غصے سے شہزادے کو دیکھا پھر زمین پر تھوک دیا۔

شہزادے کو اُس کی یہ ادا ایسی بھائی کہ اُس نے سرغنہ سے پوچھا۔

''اس لڑکی کو بیچو گے۔''

''تم مجھے نہیں خرید سکتے۔'' سرغنہ کی بجائے خیزراں نے جواب دیا۔

''کیوں؟'' شہزادے کو دلچسپی پیدا ہوگئی۔

خیزراں سینہ تان کے بولی۔:

''میں نے سردار سے یہ وعدہ لیا ہے کہ میں اپنی قیمت خود مقرر کروں گی۔''

''بھلا ہم بھی تو سنیں کہ تم نے اپنی کیا قیمت مقرر کی ہے؟'' شہزادے کی دلچسپی اور بڑھ گئی۔

''میری قیمت ایک لاکھ درہم ہے۔'' خیزراں نے غرور سے سر بلند کرتے ہوئے کہا۔

شہزادے نے مُسکرا کر پوچھا۔

''اتنی قیمت کی وجہ۔ کیا خوبی ہے تم میں؟''

''ہیرا خود منہ سے نہیں بولتا۔ بادشاہوں کی نظریں اُس کی خوبیاں دیکھ لیتی ہیں۔ میری قیمت بھی کوئی بادشاہ ہی ادا کرے گا۔ تم جیسا معمولی سوار ایک لاکھ درہم کہاں سے لائے گا۔''

''گستاخ لڑکی!'' خالد برمک نے دخل دیا۔ ''تو عباسی ولی عہد شہزادہ مہدی سے گفتگو کر رہی ہے۔''

بردہ فروشوں کے حواس اُڑ گئے۔ وہ گھوڑوں سے کود کے شہزادے کے سامنے کھڑے ہو گئے۔

اُس وقت خیزراں بولی۔:

''بدقسمت ہے وہ سلطنت جس کے شہزادے اس طرح کے ہوں۔''

شہزادے نے بُرا مانے بغیر سوال کیا۔:

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''خیزراں''

شہزادے نے زیر لب دہرایا پھر بولا:

''خیزراں! ہم منہ مانگی قیمت دینے پر آمادہ ہیں۔''

خیزراں مُسکرائی اور بولی۔:

''تم شہزادے ہو مگر بے وقوف بھی ہو۔''

''ادب سے بات کر خیزراں!'' خالد برمک نے پھر دخل دیا۔

خیزراں نے خالد کو گھور کے دیکھا اور پوچھا۔:

''تم کون ہو؟''

''میں شہزادے کا اتالیق ہوں، اِن کا اُستاد۔''

خیزراں نے بڑے اطمینان سے کہا۔

"تم اُستاد ہو تو شہزادے کو سمجھاؤ کہ ایک لاکھ میں کنیز نہیں خریدی جاتی۔ یہ تو بادشاہ بننے سے پہلے ہی خزانہ خالی کر دے گا۔"

خالد برمک کی نظریں خیزراں کی پیشانی پر جمی ہوئی تھیں۔ خالد برمک کو علم نجوم اور علم قیافہ میں بڑا دخل تھا۔ اُس نے کہا:

"پورا خزانہ دے کر بھی اگر تمہیں خریدا جائے تو یہ سودا مہنگا نہ پڑے گا۔"

شہزادہ بڑی حیرانی سے اپنے اُستاد کا منہ دیکھنے لگا۔

خالد نے پھر کہا:

"ولی عہد محترم! خیزراں کی پیشانی کہہ رہی ہے کہ یہ ایک دن پوری خلافتِ عباسیہ پر حکومت کرے گی اور ایک عالم اِس کے سامنے سر جھکائے گا۔"

سودا ہو گیا۔ بردہ فروش کو ایک لاکھ درہم ادا کر دیے گئے اور خیزراں کو رصافہ کے قصر الذہب میں پہنچا دیا گیا۔ دوسرا قصر، قصر الخلاص شہزادہ کی بیوی ریطہ بنت سفاح کے لئے مخصوص تھا۔

قصر میں قدم رکھتے ہی خیزراں کی خداداد ذہانت کو چار چاند لگ گئے۔ مشہور زمانہ اساتذہ کو خیزراں کی تعلیم وتربیت پر مقرر کیا گیا۔ دینیات اور علم حدیث کے لئے علامہ دہر امام اوزاعی کی خدمات حاصل کی گئیں۔

خیزراں کو شعروادب سے فطری لگاؤ تھا۔ اس بیدار مغز لڑکی نے مستقبل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اصولِ جہانبانی اور رموزِ مملکت کی تعلیم میں خاص طور پر دلچسپی کا اظہار کیا اور ڈیڑھ سال کے مختصر عرصہ میں ہر علم وفن میں ماہر اور مشاق ہو گئی۔

عقل ودانش کے ساتھ خدا نے اُسے حسن سیرت اور حسنِ صورت سے بھی پوری طرح آراستہ کیا تھا۔ شعروادب سے شہزادے کو بھی دلچسپی تھی اور وہ شاعروں کا ایسا قدردان تھا کہ ایک بار کسی شاعر نے اُس کی شان میں قصیدہ پڑھا تو وہ اِس قدر خوش ہوا کہ شاعر کو بیس ہزار دینار انعام دے ڈالا۔

خلیفہ منصور کے علم میں جب یہ بات لائی گئی تو اُس نے شاعر کو بلا کر سولہ ہزار دینار واپس لے لئے اور صرف چار ہزار دینار اُس غریب شاعر کو دیے گئے۔ اِس کے ساتھ ہی شہزادے کو تنبیہہ ہوئی۔

"ایک شاعر کی ایک سال کی خدمت کا صلہ صرف چار ہزار دینار ہے۔"

خلافتِ عباسیہ میں خلیفہ منصور سب سے زیادہ کنجوس مشہور تھا۔

خیزراں نے نانا نانی کو بھی اپنے پاس محل میں بلوا لیا لیکن وہ دونوں کافی عمر رسیدہ تھے اور خیزراں کا زیادہ دن ساتھ نہ دے سکے اور اللہ کو پیارے ہو گئے۔

خیزراں ماں کی طرف سے بربر تھی اِسی لئے اُس کا جھکاؤ فطرتاً بربروں کی طرف تھا۔ اُس نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے محل میں بربری اور یمنی غلام اور کنیزیں مقرر کیں۔ خیزراں نے اپنی ذہانت کے زور پر بہت جلد علمی مدارج طے کیے دوسری طرف اُس کے حُسن ولیاقت کا ایسا جادو چلا کہ وہ مہدی کے دل ودماغ پر چھا گئی اور وہ اُسی کا کلمہ پڑھنے لگا۔ دوسری تمام بیگمات اور کنیزوں نے اپنی شکست تسلیم کر لی۔ جو عقلمند تھیں اُنھوں نے چڑھتے

سورج کی پرستش کو اپنا کر اور خیزراں کی مخالفت کو چھوڑ کر اُس سے میل ملاقات بڑھالی اور جو کم عقل تھیں وہ سازشوں میں لگ گئیں اور خیزراں کو نیچا دکھانے اور مہدی کی نظروں سے گرانے کے بہانے تلاش کرنے لگیں۔

خیزراں نے چند ہی سال میں عربی ادب، حدیث، تفسیر اور تمام مروجہ علوم میں مہارت حاصل کر لی چونکہ وہ علم کی دولت سے مالا مال تھی اِس لئے نہایت فصیح اور عمدہ شاعرہ ہوئی۔ عربی اشعار کا ایک کثیر ذخیرہ اُس کے دماغ میں محفوظ تھا۔ شعر فہمی اور شعر گوئی دونوں فنون میں اُس کا دامن نہایت وسیع اور آراستہ تھا۔

سنِ بلوغت کو پہنچتے پہنچتے وہ خلیفہ مہدی کے دل و دماغ پر اپنے حسن و جمال، ذہانت و لطافت، علم و فضل اور حد درجہ پاکیزہ اخلاق کا سکّہ جما چکی تھی۔ آخر مہدی نے اُسے ملکہ سلطنت بننے کے جملہ صفات کا حامل پا کر اُس سے شادی کر لی۔

شہزادہ مہدی حد درجہ فضول خرچ تھا۔ اُس پر ستم بالائے ستم یہ کہ خیزراں بھی اپنی فیاضیوں سے ہاتھ اٹھانے سے باز نہ آتی تھی۔ یوں اخراجات بڑھتے چلے گئے۔ شہزادے کے گزارے کی رقم کا بیشتر حصہ ملکہ خیزراں کے ہاتھوں سے خرچ ہوتا تھا۔ خلیفہ منصور روپے پیسے کے معاملے میں بہت سخت تھا۔ جب خیزراں کی فضول خرچیوں کی خبر اُس کے کانوں تک پہنچی تو اُس نے شہزادے کے اُستاد خالد برمک کو طلب کر لیا۔

خالد بن برمک دست بستہ حاضر ہوا۔

خلیفہ نے کہا۔

''برمک ہم نے سنا ہے کہ کوئی کنیز خیزراں ہے جو ملکاؤں کی طرح رہتی ہے۔؟''

''ظلِ سبحانی نے جو کچھ سُنا ہے وہ بالکل درست ہے۔'' برمک نے فوراً جواب دیا۔

خلیفہ چونک پڑا۔ برمک سے اُسے ایسے جواب کی اُمید نہ تھی۔ چنانچہ اُس نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

''برمک ہم نے تمہیں شہزادے کا اتالیق اِس لئے مقرر نہیں کیا تھا کہ تم اُسے کُھلی چُھٹی دے دو؟''

برمک نے قدرے سوچ کر کہا۔

''عالیجاہ! غلام کو اُس کے قصور اور غلطی کی نشاندہی فرمائی جائے تا کہ وہ اصلاح کر سکے۔''

خلیفہ کا مزاج اور گرم ہو گیا۔ اُس نے بگڑ کر کہا۔

''کیا یہ قصور کم ہے کہ ایک معمولی کنیز کو شہزادہ اتنی ڈھیل دے کہ وہ ایک عباسی ملکہ کی طرح ٹھاٹ باٹ سے زندگی گزارے۔ آخر اور کنیزیں بھی تو ہیں۔ ہمیں خبر ملی ہے کہ وہ ہماری بہو ریطہ بنت سفاح سے زیادہ خرچ کرتی ہے؟''

خلیفہ کا پارہ چڑھنے لگا۔ شخصی حکومت اور بادشاہت میں بادشاہ کا حکم ہی قانون ہوا کرتا ہے۔ خالد برمک نے یہی مناسب سمجھا کہ اِس وقت جان بچائی جائے اور خیزراں کی خوبیوں کے بیان کو کسی اور وقت کے لئے اُٹھا رکھے۔

پس اُس نے سر جھکا کے کہا۔

''اعلیٰ حضرت! خادم کو غلطی سے یہ خیال تھا کہ اُس کے فرائض میں شہزادے کے اطوار و کردار کی درستی ہے۔ آئندہ یہ غلام شہزادے کے خانگی معاملات پر بھی نظر رکھے گا۔''

خالد برمک کا جواب بڑا جامع تھا۔ خلیفہ کو فکر ہوئی کہ کہیں شہزادے کو اُس کے اخراجات پر ٹوکنے سے بات نہ بڑھ جائے۔ پس اُس نے جلدی سے بات بدلی۔

''برمک! ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم شہزادے کے اخراجات پر پکڑ کرو۔ ہم تو یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر شہزادے نے ہاتھ نہ روکا تو خود اُسے تکلیف اُٹھانا پڑے گی۔''

برمک نے دیکھا کہ بادشاہ ذرا نرم ہوا ہے تو وہ اِس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے بولا۔

''عالیجاہ! درست فرماتے ہیں۔ مگر شہزادہ مہدی اِس وقت اخراجات کی طرف سے بہت پریشان ہیں۔''

''پریشان ہے آخر کیوں؟'' خلیفہ کو خود پریشانی ہوگئی۔

''یمنی کنیز خیزراں۔ شہزادے کے بچے کو جنم دینے والی ہے۔'' اب خالد برمک نے بے دھڑک بتادیا۔

خلیفہ کا غصہ ختم ہوگیا اور وہ مسکرانے لگا۔

''اچھا! اچھا!......'' خلیفہ نے کہا۔

خالد برمک کی جان میں جان آئی۔

خلیفہ نے ذرا ٹھہر کے کہا۔

''برمک! اگر خیزراں کے لڑکی ہو تو طبرستان اور اگر لڑکا ہو تو طبرستان اور رے دونوں امارتیں شہزادے مہدی کو ہماری طرف سے نذر کی جائیں۔''

خیزراں کے دشمنوں نے تو خیزراں کو ذلیل کرنے کی کوشش کی تھی مگر اُس کا ستارہ عروج پر تھا۔ اُس نے ''الہادی محمد موسیٰ'' کو جنم دے کر رے اور طبرستان دونوں کی گورنری شہزادے کو دلوادی۔

مہدی معہ اپنے حرم کے بغداد سے طبرستان چلا گیا۔ دوسرے سال خیزراں نے ایک بچی بانوقہ کو جنم دیا۔ اور پھر تیسرے سال اُس کے بطن سے ہارون رشید پیدا ہوا۔ خیزراں کا مرتبہ اور شان و شوکت دن بدن بڑھتی گئی۔ شہزادہ مہدی تمام دیگر بیگمات اور کنیزوں کو چھوڑ کر صرف اور صرف خیزراں کا ہو کر رہ گیا۔

خیزراں شہزادے مہدی کے دل و دماغ پر تو حکومت کر رہی تھی لیکن اب بچوں کی پیدائش کے بعد اُس نے ملکی انتظام اور اُصول جہاں بانی کا عملی تجربہ شروع کر دیا۔ مہدی پہلے ہی خیزراں کی لیاقت کا قائل تھا، اُس نے خیزراں کی ملکی معاملات میں دلچسپی دیکھ کر آہستہ آہستہ اپنے اختیارات اُسے سونپنا شروع کر دیے یا خیزراں نے خود ہی اپنی اہلیت اور ذہانت سے اُن پر قبضہ کر لیا۔

چند ہی دنوں میں رکے اور طبرستان کی کایا پلٹ ہوگئی۔ جہاں خاک اڑتی تھی وہاں خوشحالی اور شادابی کے گلشن اُگ آئے۔ رعیت شہزادے کی بجائے خیزراں پر جان دینے لگی۔ خلیفہ کو تمام معاملات کی خبر ہوتی رہتی تھی۔ اُس کے دل میں بھی خیزراں کے لئے جگہ پیدا ہوگئی اور خیزراں کے خلاف محلاتی سازشوں کا جو جال بچھایا گیا تھا وہ شکستہ ہوکر رہ گیا۔ خلیفہ منصور اور ولی عہد مہدی اس کی خوبیوں کے معترف ہو گئے۔

۱۵۷ھ تک مہدی کی حیثیت ولی عہد سلطنت کی تھی۔ اس لئے خیزراں بھی زیادہ نمایاں نہ ہوسکی لیکن ۱۵۸ھ میں جب خلیفہ منصور کی وفات کے بعد اس کا بیٹا مہدی خلیفہ ہوا تو خیزراں کے جوہر بھی نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ وہ خلیفہ مہدی پر پہلے ہی حاوی تھی، اُس کے حکمران ہونے کے بعد سیاسی اور ملکی معاملات میں بھی دخل دینے لگی۔ سیاسی اُمور میں اُس کی رائے اس قدر بے لاگ اور صائب ہوتی تھی کہ خلیفہ بھی اُس کی رائے سے اتفاق کرتا تھا اور اُسے قبول کر لیتا تھا۔ اس کے علاوہ ملکہ خیزراں خلیفہ مہدی کو بے حد محبوب بھی تھی اسی لئے بھی اُس کی ہر بات مانی جاتی تھی۔

محمد بن عبداللہ المہدی کے خلیفہ ہونے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں بھی خیزراں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وہ رکے میں رہنے کے باوصف خلیفہ ابوجعفر المنصور کے دربار میں بہت زیادہ رسائی رکھتی تھی بالخصوص وہ اس کے وزیر اعظم ابوالفضل کے ساتھ نہایت گہرے مراسم رکھتی تھی۔ بقول ابوالفضل ربیع!

''جب ابوجعفر جاں بحق تسلیم ہوئے تو میں نے حکم دیا کہ خیمے نصب کئے جائیں اور قناتیں گھیر دی جائیں چنانچہ یہ سب کچھ ہوگیا تو اب میں امیر المومنین کی تعزیت اور انتظامات کے لئے حرم کے اندر گیا میں نے خلیفہ ابوجعفر المنصور کو ایک بڑی اور ایک چھوٹی کفنی پہنائی اور تکیے کے سہارے انہیں بٹھا دیا ان کے چہرے پر ایک باریک نقاب ڈال دی جس میں ان کی صورت تو نظر آتی تھی مگر ان کا اصل چہرہ معلوم نہ ہوسکتا تھا اس خیال سے کہ کوئی ان کی حالت معلوم نہ کر سکے اور ولی عہدی کے سلسلہ میں آل عباس میں جو عداوت پائی جاتی ہے اس کا جھگڑا نہ شروع ہو جائے میں نے ان کی بیوی کو اس نقاب کے پاس بٹھا دیا۔ یہ ہیئت بنا کر میں اب دربار میں آیا اور اس جگہ آن کھڑا ہوا جہاں سے لوگوں کو یہ معلوم ہو کہ وہ مجھ سے گفتگو کر رہے ہیں پھر میں نے دربار میں اعلان کیا کہ امیر المومنین کی طبیعت اب روبصحت ہے۔ وہ آپ سب کو سلام کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تمہاری حکومت مضبوطی سے برقرار رکھے تمہارے دشمنوں کو ذلیل کرے اور تمہارے دل کو خوش کرے میری یہ خواہش ہے کہ تم اب پھر محمد بن عبداللہ المہدی کے لئے تجدید بیعت کرو تاکہ کسی دشمن یا باغی کو تمہارے خلاف کاروائی کرنے کا نہ تو کوئی موقع ملے اور نہ ہی کوئی فساد پیدا ہو۔''

میرے اس بیان سے سارے درباریوں میں کھسر پھسر ہونے لگی اور تخت کے دعویداران میں ایک اضطراب اور بے چینی پیدا ہوگئی لیکن اکثریت کو پہلے ہی اس معاملے میں بحکم خیزران خرید لیا گیا تھا اس لئے ان حاضرین نے بیک آواز میں کہا کہ۔

''اللہ تعالیٰ امیر المومنین کو توفیق عطا فرمائے ہم اس کام کے لئے بسروچشم حاضر ہیں۔''

میں یہ سن کر اندر گیا اور پھر باہر آ کر کہا۔

بیعت کے لئے سب باری باری تشریف لائیں اور سب نے باری باری بیعت کی۔ مخالفین کو اپنی کمتری کا احساس ہوگیا اور انہوں نے بھی

بیعت کر لینے میں ہی عافیت جانی اور اسی طرح سب نے بلا استثناء مہدی کے لئے بیعت کر لی۔

جب بیعت سے فراغت ہوئی تو میں پھر اندر گیا اور اندر سے باہر آ کر رونے پیٹنے لگا تب حاضرین کو پتہ چلا کہ خلیفہ ابوالجعفر المنصور اس دنیا میں نہیں رہے۔

المہدی کا سب سے بڑا حریف اور ولی عہدی کا دعویدار خلیفہ منصور کا دوسرا چچا عیسیٰ بن موسیٰ تھا لیکن حالات مخالف پا کر اس کو اس سے ہاتھ دھونے پڑے اور ملکہ خیزران کی چستی و ذہانت اور حالات کی پیشگی باخبری کے تحت کئے گئے اقدام سے المہدی کے لئے بغیر کسی خون خرابے اور خرابی کے حکومت کی راہ ہموار کر دی جس سے مہدی کے دل میں خیزران کے لئے محبت اور پیار کا سمندر مزید گہرا ہو گیا اور اس کی قدر بڑھ گئی۔

چونکہ خلیفہ المہدی کو اپنے بڑے بیٹے الہادی سے عشق کی حد تک پیار تھا اس لئے اس نے اسے اپنا ولی عہد نامزد کرنے کے لئے اپنی تخت نشینی کے چند ماہ بعد باوصف ملکہ خیزاں کے مجلس مشاورت بلائی اور کیونکہ ان دنوں بنو ہاشم اور خراسانی شیعان بنو عباس کی تحریک میں تھے وہ خیزران سے اس قدر عقیدت نہ رکھتے تھے بلکہ حاسدانہ نظر رکھتے تھے جبکہ الہادی ماں کی سرپرستی سے قدرے پرے رہ کر آزاد خیال ہو چکا تھا اور ماں کی حاکمانہ طبیعت کے سخت خلاف تھا۔

بہرحال مجلس مشاورت میں ماسوائے المہدی کے چچا عیسیٰ بن موسیٰ اور اس کے بیٹے نے اپنے ولی عہدی کے دعویٰ سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا تو المہدی نے لوگوں کے کہنے پر اپنے چچا کی سر عام پٹائی کروائی اور زبردستی الہادی کے لئے ولی عہدی کی بیعت لی اور اس طرح ۱۵۹ ہجری میں الہادی ولی عہد سلطنت مقرر ہو گیا۔

مؤرخین کا بیان ہے کہ خیزراں کا مہدی پر اس قدر اثر تھا کہ وہ جن لوگوں کو چاہتی تھی اُنہیں سلطنت کے اہم ترین عہدوں پر فائز کرا دیتی تھی۔ جس طرح اُس کا امرائے سلطنت پر اثر تھا اُسے تمام اُمرا اور وزراء تسلیم کرتے تھے۔ یہ اُمر اُس کے تدبر اور فراست کا واضح ثبوت ہے۔ وہ بڑی دور اندیش خاتون تھی اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کی پہلے سے پیش بندی کرنا جانتی تھی اور اُس کے مطابق قدم اُٹھاتی تھی۔ ہادی اُس کا بڑا لڑکا تھا۔ اِس لئے مروجہ قاعدے کے مطابق مہدی نے اُسے اپنا جانشین نامزد کر دیا تھا مگر خیزراں کو ہادی کے مقابلے میں اپنے چھوٹے بیٹے ہارون سے زیادہ محبت تھی۔ دوسرے یہ کہ ہادی کے مزاج میں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا مادہ بہت زیادہ تھا۔ اُس میں خودسری بھی تھی اور وہ اپنی رائے کے مقابلہ میں کسی دوسرے کی رائے کو وقعت نہ دیتا تھا خواہ وہ کتنی ہی اہم ہستی کیوں نہ ہو۔ لیکن ہارون نے اِس قسم کی طبیعت نہیں پائی تھی۔ یہ کہنا تو غلط ہے کہ اُسے سیاست ملکی سے کوئی تعلق ہی نہ تھا مگر بعد کے واقعات نے اتنا ضرور ثابت کیا کہ وہ اِن اُمور سے زیادہ تعلق نہ رکھتا تھا۔ عہد ہارونی میں برامکہ کا اقتدار اِس بات کا واضح ثبوت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خیزراں، ہادی کے مقابلے میں ہارون کو ترجیح دیتی تھی۔ خیزراں طبعیتاً اقتدار پسند واقع ہوئی تھی۔ مہدی کے عہد حکومت میں اُسے سیاسی اُمور میں جو دخل تھا، اُس نے خیزراں کے اقتدار کے لئے مہمیز کا کام کیا۔ وہ چاہتی تھی کہ مہدی کے بعد ایسا شخص خلیفہ بنے جو اُس کے حکم پر چلے اور اُس کے تابع رہے۔ ہارون، ہادی کے مقابلہ میں اپنی ماں کا زیادہ فرمانبردار اور اطاعت گزار تھا۔ اِس لئے بھی خیزراں کو ہارون کی ولی

عہدی کی خواہش تھی۔ لیکن جب اُس نے دیکھا کہ ولی عہدی کا مسئلہ اُس کی مرضی کے مطابق طے نہیں ہوسکا تو اُس نے امرائے سلطنت سے ربط و ضبط بڑھانا شروع کیا تا کہ مہدی کے بعد مسندِ خلافت پر بیٹھنے والا شخص اُس کا دستِ نگر ہو کر رہے۔

ملکہ خیزراں کو یہ صورت حال سخت ناپسند تھی کیونکہ اس سے اس کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط رکھنے اور لوگوں کو اپنی انگلیوں پر نچانے کی خواہش ناآسودہ رہ کر اس کی وقعت گھٹاتی تھی اس لئے اس نے مسلسل خلیفہ المہدی پر زور ڈالے رکھا تا کہ الہادی کی ولی عہدی کا پروانہ منسوخ کر کے اس کے دوسرے بیٹے ہارون الرشید کے حق میں جاری کیا جائے تا کہ اس کی ناآسودہ خواہش کو تسکین ملے کیونکہ ہارون الرشید ماں کے بہت زیادہ زیر اثر تھا اور جو ماں کہتی تھی اس کو ہی اہمیت دیتا تھا اور اس پر عمل درآمد کرتا تھا۔

دوسری طرف وہ مہدی کو بھی اُس کے فیصلے پر نظر ثانی کرنے پر تحریک کرتی رہی اور آخر کار اُس نے مہدی کو اِس امر پر آمادہ کر لیا کہ وہ ہارون کو اپنا اور ہادی کو ہارون کا جانشین مقرر کر دے۔ تاریخ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ خلیفہ مہدی اپنے اِس فیصلے کے نفاذ ہی کے لئے جرجان روانہ ہوا تھا جہاں ہادی مقیم تھا مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا اور اثنائے راہ ہی میں ماہندان میں ۲۲ محرم ۱۶۹ ہجری بمطابق ۱۸ اگست ۷۸۵ عیسوی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

خلیفہ المہدی کی موت کے بارے میں مورخین نے اختلاف کیا ہے بعض کے نزدیک اس کی موت قدرتی تھی جبکہ اکثریت کے مطابق خیزراں نے اپنی ناراضگی کا اس سے بدلہ لیا تھا اور کسی لونڈی نے زہر دے دیا تھا جس کی وجہ سے المہدی مر گیا تھا۔

بعض کے نزدیک ایک لونڈی نے دوسری لونڈی کو امرود میں زہر ملا کر کھلانا چاہا لیکن کسی وجہ سے یہ امرود دھوکے سے خلیفہ مہدی کے روبرو رکھ دیا گیا جسے مہدی نے کھا لیا اور اس سے اس کی موت واقع ہو گئی۔

بعض کے نزدیک خلیفہ مہدی ایک روز شکار کھیلنے گیا تھا کہ ایک شکار کے پیچھے اس نے اپنا گھوڑا ڈال دیا شکار بھاگ کر ایک ویران مکان میں گھس گیا خلیفہ مہدی بھی اس مکان میں گھس گیا دروازے بہت چھوٹے تھے ٹکر کھا کر گر پڑا اور اسی دن ہی دماغی چوٹ کی وجہ سے مر گیا بہر حال اس کی عمر اس وقت ۴۳ سال اور مدت خلافت تقریباً دس سال تھی جبکہ ملکہ خیزراں کی عمر تقریباً بتیس سال تھی۔

خیزراں کے تدبر اور فراست کے امتحان کا یہ بڑا نازک وقت تھا۔ ایک طرف اُس کی ذاتی خواہشات اور ذاتی مفاد تھا جن کا ہادی کی خلافت میں محفوظ رہنا ممکن نہ تھا اور اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی شان و شوکت اور اقتدار خطرے میں ہے، دوسری طرف سلطنت کے وقار اور مسلمانوں کی حکومت کی بقا کا سوال تھا۔ اگر وہ ہارون، اُس کے اتالیق، اُس عہد کے مشہور سیاستدان یحیٰی برمکی، امرائے سلطنت اور سرداران فوج کو ملا کر بغاوت کرا دیتی تو ایک طرف قطعی کامیابی مشتبہ تھی اور دوسری طرف مسلمانوں کی حکومت میں انتشار اور تنزل پیدا ہو جاتا۔ اِس لئے اُس نے بڑی فراست سے کام لیا اور اپنے ذاتی مفادات پر ملکی مفادات کو ترجیح دی۔

اُس نے ہارون کو ہدایت کی کہ فوراً ہادی کو خط لکھ کر اِس واقعہ کی اطلاع دے اور اُس سے درخواست کرے کہ وہ جلد سے جلد دارالخلافہ پہنچ کر اپنی بیعت لے۔

اِدھر ایک واقعہ یہ پیش آیا کہ خلیفہ مہدی کی وفات کی خبر سنتے ہی بغداد میں بغاوت ہو گئی اور فوج کا ایک حصہ باغی ہو گیا۔ اس طرح

خیزراں کے لئے اپنے منصوبے کو عملی شکل دینے کا ایک اور موقع نکل آیا۔ مگر اُس نے اپنی دوراندیشی سے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر اِس موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی تو یہ مفید ہونے کی بجائے اُلٹا نقصان دہ ثابت ہوگا اور ہادی خیال کرے گا کہ خیزراں اور ہارون نے سازش کر کے بغاوت کرائی ہے۔ اِس لئے وہ دونوں سے بدظن ہو جائے گا اور ممکن ہے کہ انتقام لینے پر تُل جائے۔

پس اُس نے بڑی ہوشیاری اور مستعدی سے کام لے کر تمام بڑے بڑے سرداران فوج کو اپنے حضور طلب کیا اور انہیں زر کثیر دے کر کہا۔

''باغی فوج کو دو ماہ کی تنخواہ پیشگی ادا کر دی جائے۔''

اُس کی یہ حکمت عملی کام آئی اور نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف تو بغاوت ختم ہوگئی دوسری طرف فوج اور اُس کے سرداروں پر خیزراں کے حسنِ سلوک، فیاضی اور شفقت کا نہایت خوشگوار اثر پڑا۔ یہی نہیں بلکہ ہادی کے دل میں اپنی ماں اور بھائی کی طرف سے جو شبہات تھے اُن کا خاتمہ ہوگیا اور وہ اُن دونوں کو اپنا خیر طلب سمجھنے لگا۔

اِس طرح خیزراں نے اپنی فراست سے ہادی کو اپنا نیاز مند بنا لیا اور وہ سارا اقتدار اپنی ماں کے حوالے کر کے سیر وشکار اور عیش وعشرت میں مصروف ہوگیا۔ اب خیزراں کا محل عوام وخواص کا مرجع بن گیا۔ فوج کے سالار، انتظامیہ کے حکام، قبائل کے سردار، دربار کے اراکین، سائل اور مصیبت زدہ لوگوں کی بھیڑ اُس کے محل کے دروازے پر لگی رہتی۔ سلطنت کے تمام اُمور اُس کے سامنے پیش ہوتے اور وہ اُن کے متعلق نہایت عاقلانہ فیصلے کرتی۔

مگر افسوس کہ یہ صورت حال زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکی۔ چار ہی ماہ گزرے تھے کہ ہادی کا دل سیر وشکار اور عیش وعشرت کی زندگی سے اکتا گیا اور وہ ملکی انتظام اور انصرام کے معاملات میں کمال دلچسپی لینے لگا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انتظام دو ہاتھوں میں آ گیا۔ ایک طرف خیزراں تھی جو اپنے مفادات اور منشاء کے مطابق کام کرنا چاہتی تھی اور دوسری جانب ہادی تھا جو حکومت کرنے کے جذبے سے سرشار تھا۔ جب وہ خیزراں کے محل کے سامنے لوگوں کا اژدہام دیکھتا تو دل ہی دل میں کڑھتا اور خیال کرتا کہ میں تو نام کا خلیفہ ہوں اصل اقتدار تو میری ماں کے ہاتھوں میں ہے۔

خلیفہ الہادی نے قدرے عرصہ حکومت کے بعد اپنے امراء کے بہکانے اور اپنی ماں ملکہ خیزراں کا اثر رسوخ کم کرنے کے لئے اپنے چھوٹے بھائی ہارون الرشید کی بجائے اپنے نابالغ بیٹے جعفر بن موسیٰ کو اپنا ولی عہد بنانے کی تگ ودو شروع کر دی بہت سے امراء اور فوج بھی اس کی رائے کے تابع ہوگئی ہادی نے ہارون پر سختی شروع کر دی کہ وہ ولی عہدی سے دستبردار ہو جائے ہارون تنگ آ کر چھوڑنے پر آمادہ ہوگیا لیکن اس کے اتالیق یحییٰ برمکی اور اس کی ملکہ خیزراں نے اس بات کی مخالفت کی جس کی وجہ سے خلیفہ ہادی اور اس کی ماں خیزراں کے تعلقات انتہائی کشیدہ ہو گئے دوسری وجہ ملکہ خیزراں کا اپنے بیٹے کے معاملات میں بہت زیادہ دخل دینا تھا جبکہ ہادی کو یہی بات قطعی پسند نہ تھی بقول طبری!

''خیزراں کی نیت یہ تھی کہ جس طرح مہدی کے عہد میں وہ سیاہ وسفید کی مالک تھی وہی بات اسے ہادی کے زمانہ میں بھی نصیب ہو جائے۔''

چنانچہ اس کی ڈیوڑھی مرجع خلائق بن گئی تھی اور بڑے بڑے عمائدواکابر اور فوج اور امراء اس کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اغراض اس سے بیان کرنے لگے تھے چنانچہ ایوان خلافت میں دو گروہ بن گئے تھے ایک گروہ ملکہ خیزراں اور یحییٰ بن برمکی جیسے امراء کا تھا جو ہارون الرشید کے حق

میں تھا اور دوسرا گروہ ان عمائدین و اکابر پر مشتمل تھا جو خلیفہ ہادی کے حق میں تھا اور اس کے بیٹے جعفر کو ولی عہد بنانے کی تجویز کی حمایت کرتا تھا۔

ہادی نے اس صورتحال کے پیش نظر یحییٰ برمکی کو قید کر دیا اور ہارون اپنی جان بچانے کے لئے بغداد سے چلا گیا۔

اس دوران ایک بڑے عہدیدار کے تقرر کے سلسلے میں خیزراں اور ہادی کے درمیان تنازعہ ہو گیا۔ اس موقع پر ہادی نے سختی سے کام لیا اور ماں سے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ اُس کا تقرر میری منشاء کے مطابق ہوگا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اس موقع پر ہادی نے ایک تقریر کی جس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا کہ۔

''کیا دنیا سے چرخہ اُٹھ گیا ہے جسے بیٹھ کر آپ کاتیں،

یا کیا قرآن نہیں رہا جس کی آپ تلاوت کریں''

اور ایک گھر نہیں کہ وہاں جا کر آپ چپ چاپ زندگی بسر کریں؟

اُس نے ماں کو یہ مشورہ بھی دیا کہ اب آپ عمر کی اُس منزل سے گزر رہی ہیں جہاں گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر عبادت کیا کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے ماں کو بتا دیا کہ اگر میں نے آج کے بعد آپ کے دروازے پر کسی اُمرائے سلطنت کو دیکھا تو میں بے دریغ اُس کی گردن اڑا دوں گا۔ دوسری طرف اُس نے امرائے دربار اور اراکین سلطنت کو سرزنش کی اور خیزراں کے پاس ان کی آمدورفت کو ٹھکا بند کرا دیا۔

خلیفہ الہادی نے ماں سے چھٹکارا پانے کی ایک نئی ترکیب سوچی اس کے مطابق اس نے ایک دن اپنی ماں کو پکے ہوئے چاول بھیجے اور کہلا بھیجا کہ مجھے یہ بہت پسند ہیں میں نے بھی ان کو کھایا ہے آپ بھی کھائیں۔

ملکہ خیزراں کے مشیر خالصہ نے اس سے کہا۔

''ذرا توقف کیجئے پہلے اس کا امتحان لینا چاہئے ممکن ہے کہ اس میں آپ کی خلاف طبع کوئی شے ہو۔''

چنانچہ ایک کتا لایا گیا اسے وہ چاول کھلائے گئے جس سے اس کا تمام گوشت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑا۔

اس کے چند روز بعد ہادی نے اپنی ماں سے پچھوایا کہ وہ چاول کیسے تھے۔

ملکہ خیزراں: ''بہت خوش ذائقہ تھے۔''

الہادی: آپ نے کھائے نہیں۔

ملکہ خیزراں: اگر کھا جاتی تو میری طرف سے تجھے اطمینان ہو جاتا وہ خلیفہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جس کی ماں زندہ ہو۔''

اس کے بعد خیزراں کا حکومت کے معاملات میں عمل دخل بالکل ختم ہو گیا اور وہ گوشہ گمنامی میں چلی گئی مگر جلد ہی زمانہ نے پھر پلٹا کھایا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ملکہ، حکومتی معاملات سے الگ رہنے کے باوجود اپنے طور پر حکومت کے سلسلے میں پوری طرح باخبر رہتی تھی چنانچہ اُس کی گمنامی اور حکومت سے بے تعلقی کا زمانہ بہت مختصر ثابت ہوا جو مشکل سے ایک سال بھی نہ تھا۔ چنانچہ جب ۱۴ ربیع الاول ۱۷۰ ہجری بمطابق ۱۳ ستمبر ۷۸۶ عیسوی میں چھتیس سال کی عمر میں ہادی کا انتقال ہو گیا اور مہدی کی وصیت کے مطابق ہارون رشید تحت خلافت پر متمکن ہوا تو ملکہ خیزراں پھر سامنے آ گئی۔

خلیفہ ہادی کی موت کے بارے میں بعض مورخین نے ملکہ خیزراں پر بھی الزام لگایا اور اُسے ہادی کی موت کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ یہ روایت کتاب الدنمانی کی ہے۔ اس کتاب کے مصنف کو مزیدار قصے اور سنسنی خیز حکایتیں سنانے کا بہت شوق اور ملکہ ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ کتاب الدنمانی عربی ادب کی بڑی بلند پایہ کتاب ہے اور تاریخی شخصیتوں کے لطائف اور حکایات کا عمدہ مجموعہ ہے لیکن اس کی تاریخی حیثیت کو کسی دور میں بھی مسلّم تسلیم نہیں کیا گیا۔ اگرچہ اس کتاب میں تمام واقعات ہی غلط نہیں مگر اس میں کچھ واقعات غلط بھی ہیں۔

ہادی کی موت کے بارے میں جو روایت انمانی نے بیان کی ہے اُس کے بارے میں جب دوسری کتب پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں بعض کتابوں میں اس سے مختلف روایتیں بھی ملتی ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ جب تاریخ کی دوسری کتابیں جو ''کتاب الدنمانی'' سے کہیں زیادہ مستند ہیں، اگر وہاں ہمیں مختلف نظر آئیں تو ہم انہیں تسلیم نہ کریں اور اس امر پر زور دیں کہ ماں نے بیٹے کو ضرور ہلاک کرایا ہوگا۔

اِس سلسلے میں یہ امر بھی پیش نظر ہے کہ تاریخ کی قدیم کتابوں میں کوئی کتاب ایسی نہیں جس میں ''ہادی'' کی موت کے متعلق مختلف اور متضاد بیان درج نہ ہوں۔ چنانچہ طبری، سیوطی، اور جامع الحکایات ولوامع الروایات کے مصنف نے ہادی کی موت کے سلسلے میں جو بیان دیا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ ہادی کی موت زہر کے اثر سے ہوئی۔ (طبری)

۲۔ جب ہادی نے ہارون کے قتل کا حکم دیا تو ملکہ خیزراں نے رورو کے التجا کی کہ ہارون کو قتل نہ کروانا مگر اس نے ایک نہ سنی۔

۳۔ ایک روز خیزراں نے اپنی کنیزوں کو حکم دیا کہ تم ہادی کی گردن پر تکیہ رکھ کر بیٹھ جانا اور جب تک اُس کی جان نہ نکل جائے، تم نہ اُٹھنا۔

۴۔ خیزراں نے بڑے درد سے اللہ تعالٰی کے حضور دُعا کی کہ وہ ہارون کو ہادی کے فتنہ سے بچائے اتنے میں ہادی سو گیا۔ ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ اُسے سخت کھانسی آئی اور گلے میں پھندا پڑ گیا۔ خیزراں نے جلدی سے پانی دیا مگر پانی اُس کے حلق سے نیچے نہ اُتر سکا اور اس حالت میں وہ فوت ہو گیا۔ (جوامع الحکایات ولوامع الروایات)

۵۔ ہادی کے پیٹ میں پھوڑا تھا۔ اُسی پھوڑے کی وجہ سے اُس کی موت ہوئی۔

۶۔ ہادی نے اپنے ایک ندیم کو ازراہِ مذاق دھکا دیا اور وہ ایک کٹے ہوئے (نوک دار) بانس پر گر پڑا۔ اُس نے گرتے ہوئے ہادی کا سہارا لینا چاہا مگر ہادی اپنے آپ کو سنبھال نہ سکا اور وہ بھی اُس کے ساتھ ہی گر پڑا۔ وہ بانس ہادی کی ناک یا پیٹ کو چیرتا ہوا گزر گیا اور اُس سے ہادی کا انتقال ہو گیا۔ (تاریخ الخلفاء طبری)

اِن مختلف اور متضاد بیانات کی موجودگی میں یہ قطعی فیصلہ کرنا کہ ہادی کو خیزراں نے مروایا تھا، بہت بڑی جسارت ہے۔ ہاں اگر سارے مورخ اِس امر پر متفق ہوتے کہ خیزراں ہی ہادی کی قاتل تھی تو اِس واقعہ کا انکار ممکن نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ حال کے محتاط مورخ بلکہ بعض قدیم مورخ بھی اِس خیال کی تردید کرتے ہیں کہ خیزراں ہادی کی قاتل تھی۔ چنانچہ البرامکہ کے مولف کا بیان ہے کہ:۔

''مورخین نے ہادی کے اسبابِ موت میں اختلاف کیا ہے۔''

بعض کا قول ہے کہ اُس کے گلے میں ایک زخم تھا جس کے بگڑنے سے وہ فوت ہوا۔ بعض کا خیال ہے کہ جب ہادی نے ہارون کو زہر دینا تجویز کیا اور اِس کا راز کُھل گیا تو خیزراں نے ہارون کی محبت میں ہادی کو زہر دے دیا۔ مگر پہلی روایت (یعنی گلے کے زخم سے موت ہونا) صحیح ہے۔ فی الحقیقت ہادی بہت بیمار تھا۔

اِس روایت کی تائید تاریخ الحکماء ابن "القفطی" کے بیان سے ہوتی ہے۔ اُس بیان میں بھی ہادی کی بیماری کو شدید اور موت کا باعث قرار دیا گیا ہے۔

پس اِن روایات کی موجودگی میں خیزراں کا دامن ہادی کے خون سے پاک نظر آتا ہے اور یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ طبعی موت سے فوت ہوا ہے ویسے بھی عورت ہونے کے ناطے میں کسی ماں کو اس کے بیٹے کے قتل میں ملوث نہیں کر سکتی ان متضاد آراء کی بناء پر ہم اسے قتل سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں بہر حال اس میں کسی سازش کو دخل نہ تھا۔ اِن روایات کے علاوہ کچھ اور واقعاتی شواہد بھی ہیں مگر اُن کے لئے بڑی تفصیل کی ضرورت ہے اور یہاں اُس کی گنجائش نہیں۔

الہادی کی وفات کے فوراً بعد ہرثمہ بن العین کی قیادت میں ہارون الرشید کو ملکہ خیزراں نے بیعت کے لئے دربار میں بھیجا اور ہارون الرشید نے یحییٰ بن خالد برمکی کو قید سے رہا کروا کر اپنے پاس بلایا دوسری طرف یہ ہارون الرشید کی خوش قسمتی تھی کہ جس رات الہادی نے ہارون الرشید کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا اسی رات خلیفہ الہادی اس دنیا سے یہ حسرت دل میں لئے رخصت ہو گیا اور یوں ہارون الرشید خلافت سنبھالنے اور اپنی ماں ملکہ خیزراں کے اقتدار کو بحال کرنے میں کامیاب ہوا۔ یحییٰ برمکی جب دربار میں حاضر ہوا تو ہارون الرشید نے اس کو اپنا وزیر اعظم مقرر کیا اور اسی وقت سب لوگوں کو فرمان میر منشی یوسف بن قاسم سے لکھوا کر بلوایا۔

جب سارے فوجی عہدیدار اکٹھے ہو گئے تو اس موقعہ پر یوسف نے جو تقریر کی اس میں وعدہ کیا کہ نئے خلیفہ تمہارے ساتھ نرمی اور شفقت برتیں گے استحقاق کے مطابق تمہارے عطایا تم کو دیں گے اور ان مقررہ عطایا کے علاوہ خلیفہ کے حق میں جو روپیہ سرکاری خزانوں میں جمع ہے اس میں سے بطور معاش اتنی رقم ماہانہ اضافہ کر دیں گے اس مد معاش کی وجہ سے تمہاری مقرر عطایا میں کوئی کمی نہ کی جائے گی اور نہ ہی یہ رقم اس میں سے آئندہ وضع ہو گی۔

اس تقریر کے بعد تمام لوگوں نے ہارون الرشید کے حق میں بیعت کی جبکہ الہادی کے بیٹے جعفر کو اس قدر ڈرایا دھمکایا گیا کہ جعفر نے اپنے محل سے باہر نکل کر ہارون الرشید کی بیعت قبول کر لی اور اپنی دست برداری کو تسلیم کر لیا اور اس طرح ملکہ خیزراں ہارون الرشید کو حکومت دلانے میں کامیاب ہو گئی۔

غرض ہادی کے انتقال کے بعد خیزراں کو پھر امور سلطنت میں دخیل ہونے کا موقع مل گیا۔ ہارون رشید نے خلیفہ ہوتے ہی سارے اختیارات ماں کے سپرد کر دیے۔ اُس نے یحییٰ برمکی اپنے وزیر اعظم کو ہدایت کر دی کہ جُملہ اُمور میری والدہ کے مشورے سے حل کیا کرو۔ چنانچہ یحییٰ اپنے بیٹوں فضل اور جعفر سے مشورہ کرتا اور پھر آخری فیصلے کے لئے کاغذات خیزراں کے پاس بھیج دیتا۔ خیزراں جو احکام جاری کرتی یحییٰ اُن پر دستخط

کر دیتا۔ گویا آخری فیصلہ خیزراں ہی کا ہوتا تھا۔ اِس طرح خیزراں اب عالمِ اسلام کی مطلق العنان فرمانروا تھی اور بڑی شان وشوکت سے حکومت کرتی تھی۔

مورخین نے خیزراں کے انداز واطوار اور ٹھاٹ باٹ کی جو تصویر کھینچی ہے اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہایت عالی شان محل میں رہتی تھی۔ جو اُس کے لئے خلیفہ مہدی نے تعمیر کرایا تھا۔ اِس شاہی محل کا نام ''اساس'' تھا۔ وہ اِس محل کے سب سے پُرشکوہ کمرے میں پسِ پردہ دربار کرتی تھی۔ دائیں بائیں بنو ہاشم کی مقتدر خواتین ہوتی تھیں۔ پیچھے زریں کمر کنیزیں ہاتھوں میں ننگی تلواریں لئے ایستادہ ہوتی تھیں۔ اراکین سلطنت، عمائدین شہر، سرداران افواج اور غیر ممالک کے وفود اُس کی خدمت میں باریاب ہوتے تھے۔ ہر ایک کے ساتھ وہ نہایت شاہانہ جاہ وجلال سے گفتگو کرتی، اُن کی عرضداشتیں سنتی اور مناسب احکام صادر کرتی۔ اُس کی دولت کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اُس کی ذاتی آمدنی کا اندازہ سولہ کروڑ درہم سالانہ لگایا گیا ہے۔ وہ صرف دولت جمع کرنا ہی نہیں جانتی تھی بلکہ اُسے خرچ کرنا بھی آتا تھا۔ اُس کی فیاضی ساری سلطنت میں مشہور تھی۔ غرباء کے ساتھ ساتھ وہ علماء اور شعراء پر بھی خوب ابرِ کرم برساتی تھی کیونکہ وہ خود بھی بہت اچھی شاعرہ تھی جس کے جوہر اپنے شوہر خلیفہ مہدی کے سامنے خوب کھلتے تھے کیونکہ خلیفہ مہدی شاعرانہ طبیعت کا مالک تھا۔ جب وہ محل سے باہر نکلتی تو اُس کی شان وشوکت دیکھنے کے لائق ہوتی تھی۔ اُس کے آگے آگے مناد، منادی کرتے چلتے کہ ''راستہ چھوڑو۔ امیر المومنین کی والدہ محترمہ کی سواری آ رہی ہے۔''

سینکڑوں سوار اور پیادے ہوا میں تلواریں لہراتے اُس کے پیچھے پیچھے ہوتے۔ لوگ دور رویہ ادب سے کھڑے ہو جاتے اور آنکھیں احترام سے جھکا دیتے۔

خیزراں اپنی فطرت اور طبیعت کے اعتبار سے بڑی نیک تھی۔ اگر کسی وقت کوئی سخت جملہ اُس کی زبان سے نکل جاتا اور اسے احساس ہو جاتا یا کوئی اُسے خدا کا خوف دلاتا تو وہ فوراً اپنی اصلاح کرتی بلکہ حتیٰ الامکان تلافی کی بھی کوشش کرتی۔

ایک دفعہ خلیفہ مہدی کے زمانے میں ایسا ہوا کہ ایک مصیبت زدہ عورت نے اُس کے محل کے دروازے پر حاضر ہو کر اندر آنے کی اجازت مانگی۔ خیزراں نے اُسے اپنے حضور بلوالیا۔ رسمی سلام ودُعا کے بعد خیزراں نے اُس کا نام دریافت کیا۔

اُس نے جواب دیا۔

''میں کسی زمانہ میں شہزادی تھی مگر اب روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ مجھ محتاج کا نام مزنہ ہے۔''

چونکہ مزنہ بنواُمیہ کے شاہی خاندان کی خاتون تھی اور بنواُمیہ اور بنو عباس میں سخت دشمنی تھی اِس لئے عصبیت کے جذبات سے مغلوب ہو کر خیزراں نے اُسے دھتکار دیا اور کہا۔

''یہاں سے نکل جاؤ۔ وہ دن بُھول گئیں جب سن رسیدہ سیدزادیاں رو رو کر تجھ سے فریاد کر رہی تھیں کہ امام ابراہیم بن محمد عباس کی لاش بے گور وکفن پڑی ہے۔ اُن کے کفن، دفن کی اجازت دلوادو اور تو نے ہماری اتنی سی درخواست بھی قبول نہ کی تھی۔ تو جس سزا کی مستحق تھی وہ خدا نے تجھے دی۔ اِس کے بعد بھی تو کیا مجھ سے ہمدردانہ سلوک چاہتی ہے؟''

خیزراں کی گفتگو سُن کر پہلے تو مزنہ ہنسی پھر کہنے لگی۔

''سچ ہے۔ مجھ کو تو اپنے کئے کا پھل مل گیا لیکن اِس وقت میں آپ کے دروازے پر سوال کرنے والے کی حیثیت سے آئی ہوں۔ اگر آپ عقلندی سے کام لیں تو یہ موقع آپ کے لئے اللہ کا شکرادا کرنے کا ہے کہ اُس نے مجھ جیسی عورت کو مصیبت زدہ بنا کر آپ کی خدمت میں حاجت مند کی حیثیت سے بھیجا ہے۔''

اِس کے بعد اُس نے سلام کیا اور واپس جانے لگی۔

خیزراں کے حساس دل پر مزنہ کی گفتگو کا بڑا اثر ہوا اور اُس نے سمجھا بجھا کر اُسے روک لیا۔

اِس کے بعد اپنی کنیزوں سے کہا کہ انہیں حمام لے جاؤ اور میرے کپڑے اِن کے آگے ڈال دو۔ جو لباس انہیں پسند آئے وہ غسل کرانے کے بعد انہیں پہنا دو۔

نہادھو کر اور لباس پہن کے جب مزنہ غسل خانہ سے برآمد ہوئی تو یوں معلوم ہوا جیسے کالی گھٹا میں سے چاند نکل آیا ہو۔ خیزراں آگے بڑھ کر اُس سے بغل گیر ہوئی اور خلیفہ مہدی کی مسند پر بٹھایا۔ صرف یہی نہیں بلکہ رہائش کے لئے ایک نہایت آراستہ پیراستہ کمرہ بھی عطا فرمایا اور کہا۔

''آج کے بعد اپنی زندگی کے آخری لمحے تک آپ میری مہمان ہیں۔''

اِس کے علاوہ اخراجات کے لئے پانچ لاکھ درہم بھی دیے۔

جب خلیفہ مہدی نے یہ واقعہ سنا تو بنو امیہ کی ایک شاہی خاندان کی خاتون کا شاہی محل میں آنا اسے کسی طرح مناسب معلوم نہ ہوا مگر خیزراں نے کمال سمجھداری سے اسے بھی اپنا ہم خیال بنالیا۔ پھر وہ اتنا متاثر ہوا کہ درہموں کی ایک سو تھیلیاں مزنہ کو بھجوائیں اور سلام بھی کہلوایا۔

مزنہ جب تک زندہ رہی خیزراں کے پاس رہی اور انہی کی ممنون و مشکور رہی۔ خلیفہ ہارون رشید کی خلافت کے آغاز میں اس کا انتقال ہوا۔ مرنے کے بعد بھی ملکہ خیزراں نے اسے فراموش نہ کیا بلکہ زر کثیر صرف کر کے اس کا مقبرہ تعمیر کرایا۔

خیزراں کا پہلا بیٹا ہادی ۱۴۷ھ میں پیدا ہوا جو خلیفہ مہدی کی وفات کے بعد ۱۶۹ھ میں سربراہ سلطنت ہوا جبکہ دوسرا بیٹا ہادی کی پیدائش کے دو سال بعد ۱۴۹ھ میں پیدا ہوا اور ۱۷۰ھ میں سلطنت عباسیہ میں ہارون رشید عباسی کے لقب سے ملقب ہوا۔ اس طرح خیزراں نے دنیائے اسلام کے دو عظیم حکمرانوں کی ماں بننے کا فخر حاصل کیا۔

خیزراں بلا کی حسین اور کمال کی ذہین و فطین عورت تھی۔

وہ ایک ایسا نایاب ہیرا تھی جو اپنی قیمت خود لگا کر بھی شہزادے کے لیے انمول بن گئی تھی۔ وہ شہزادے مہدی کے دل پر تو شروع دن سے راج کر رہی تھی لیکن اسے مملکت کے تمام امور میں بھی اتنا ملکہ حاصل تھا کہ رعایا بھی اس کے گن گاتی تھی۔

ملکہ خیزراں کے دور کو تاریخ اسلام میں ایک سنہری دور سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جسے اس کے حسین دل و دماغ نے اپنی ذہانت سے درخشاں بنا دیا تھا۔

http://kitaabghar.com

اُم سلمٰی......ایک تعارف

بنومخزوم کی ام سلمی جس کا تعلق بنوامیہ حکمرانوں سے تھا جس نے اپنی الھڑ دوشیزگی میں خاندانی عباسیہ کے پہلے خلیفہ کو کس طرح پھانسا اور کس طرح اس کے دل پر قابو پایا۔ یہ تاریخ کا ایک ایسا المیہ اور رومانس ہے جو اپنی دلکشی اور خون آشام واقعات کو سمیٹے ہر پڑھنے والے کو ایسے اپنے جال میں پھانستا ہے کہ قاری شروع سے آخر تک خود کو بھی انہی واقعات کا ایک کردار جانتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ اپنے محسوسات کو بھی اسی طرح محسوس کرتا ہے کہ یہ واقعات پہلے عباسی خلیفہ کے ساتھ رونما ہوا ہے بلکہ اس کے اپنے ساتھ بیت رہے ہوں۔

مشہور ادیب الماس ایم اے کے شوخ اور تیز و تند قلم کے وہ شرارے جو تاریخ کے اندر سے بھی رومانس کی داستانوں کو اپنی تیز نوک قلم سے قاری کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے کہ قاری اپنے ان مسلمانوں کے خلفاء کی رنگین داستانوں سے یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنے ان خلفاء نے جہاں مسلمانوں کو ترقی کے دوراہے پر لا کھڑا کیا وہیں اسے مذہب سے دور کرنے اور دنیاوی عیش وطرب کی پستیوں میں بھی لا دھکیلا جس کے نتیجے میں وہ اسلامی سلطنت جو ایک سپر پاور تھی وہی سلطنت ٹکڑوں ٹکڑوں میں بٹ کر ہمیشہ کے لئے دوسروں کی نہ صرف دست نگر بن گئی بلکہ خون آمیز لاکھوں دلخراشوں داستانوں میں بھی ڈھل گئی۔

ام سلمی وہ اموی شہزادی جس کا بنوامیہ کے اختتامی دور میں پورے دمشق میں کوئی ثانی نہ تھا اور جو کسی کو بھی اپنے من کا ساتھی بنانے کو تیار نہ تھی آج اپنے دل کے دریچے ایک ایسے اجنبی پر کھول رہی تھی جو اسے پہلی ہی نظر میں بھا گیا تھا اور جس کا حسن بے تاب اس کے دل کی تمام کیفیتوں پر اس برح طرح چھا گیا تھا جس طرح کالے بادل کا ایک جھرمٹ آفتاب عالم کو اپنی بدلی کی اوٹ میں چھپا کر اس کی کرنوں کا حسن لوٹ لیتا ہے۔

وہ اجنبی جس کے بارے میں اسے یہ تک معلوم نہ تھا کہ وہ اجنبی کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کس مقصد کے پیچھے خاموشی اور دھیرج سے کام کر رہا ہے جس کے بارے میں اس وقت تک پورا دمشق بے خبر تھا لیکن آنے والے دنوں میں جو سلطنت اسلامیہ میں بنوامیہ کا مخالف بن کر ابھرا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پوری اسلامی سلطنت کو زیر نگین بنا کر اس پر عباسی سلطنت کی داغ بیل ڈالی۔

اس نوجوان کی رومانس بھری داستان جب اسے ابھی یہ تک علم نہ تھا کہ کل کو اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور جو ابتداء میں اپنے رومانس کو بھی اپنی پہچان ہو جانے اور گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر چھپانے اور گریز کرنے پر مجبور تھا۔

☆ ☆ ☆

اُمّ سلمٰی

اُم سلمٰی، بنوامیہ کے حکمران مروان بن محمد کے سالار ابن قفیب کی بیٹی تھی جو اپنے حسن بے مثال کی وجہ سے مشہور تھی۔اس کے لئے بہت سے رشتے آ چکے تھے اور رشتوں کی بھر مار اس لئے بھی تھی کہ اُم سلمٰی نہ صرف ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی تھی بلکہ اکلوتی اولاد ہونے کے ناطے جائیدادوں اور جاگیروں کی تنہا وارث تھی۔اُم سلمٰی انتہائی ناز و نعم میں پلی شہزادیوں کی سی شان و تمکنت رکھنے والی حسین و جمیل دوشیزہ تھی۔والدہ کا بچپن میں انتقال ہو چکا تھا اس لئے والد کی توجہ کا مرکز تھی۔دولت کی ریل پیل اور خدمت گاروں کی فوج ظفر موج تھی جو شہزادی اُم سلمٰی کی جنبش ابرو پر دل و جان نثار کرتے تھے۔خلیفہ مروان ان دنوں جنگ میں مصروفیت کی بنا پر موصل میں پھنسا ہوا تھا اس لئے اس کا سالار ابن قفیب ابھی کسی رشتے کو منظور کرنے کی حالت میں نہ تھا ویسے بھی شہزادی ابھی نوعمری کے دور میں تھی۔

اُم سلمٰی حیمہ میں اپنی شاندار حویلی میں حکمرانی کر رہی تھی۔جس حصے میں شہزادی اُم سلمٰی رہتی تھی وہاں سے وہ اکثر جھروکے میں اپنی کنیزوں کے ساتھ کھڑے ہو کر بازار کی رونقیں دیکھا کرتی تھی۔

ایک روز وہ عین دوپہر اپنے جھروکے میں آن کر کھڑی ہوئی تھی کہ اس نے ایک نوجوان کو منہ سر لپیٹے کڑکتی دھوپ میں چوروں کی مانند گزرتے ہوئے دیکھا تو اسے کچھ شک ہوا اور وہ تجسس میں مبتلا ہوگئی اس نے ذرا غور سے اس جانب دیکھا تو اس نوجوان نے بھی اچانک اپنا سر گھمایا وہ جوان بے حد رعنا و خوبصورت اور دلکش سراپا کا مالک تھا اس کے چہرے سے دستار کا پلّو ہٹا تو وہ قدرے گھبرا گیا اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو اسے اوپر جھروکے میں کوئی حور کھڑی نظر آئی اس کی حیرت زدہ نظریں جھروکے میں متجسس کھڑی شہزادی اُم سلمٰی کی نظروں سے جا ٹکرائیں اور ایک دوسرے میں پیوست ہو کر رہ گئیں، ایک شعلہ سا کوندا اور ان دونوں کو کچھ لمحات کیلئے دنیا و مافیا سے بے خبر کر گیا۔یہ وہی لمحہ تھا جب عشق کے دیوتا نے اپنا کیوپڈ چلایا جوان دونوں کے دلوں میں کھب گیا اور ایسا کھبا کہ گویا وہ ایک دوسرے کو اپنا دل دے بیٹھے۔دو اجنبی نگاہیں کیا اسرار و رموز کر گئیں کہ انہیں ہوش وخرد سے بیگانہ کر دیا۔

اس نوجوان کو تو جلد ہوش آ گیا اس نے جلدی سے اپنی دستار کا پلّو اپنے چہرے پر لپیٹا اور چہرہ چھپائے ہوئے تیز تیز قدم اٹھاتا اپنی راہ پر ہولیا جبکہ اُم سلمٰی کافی دیر وہاں مبہوت و ساکت کھڑی رہی جس کو اس کی راز دار کنیز اور سہیلی شامہ نے جھنجھوڑا تب وہ اپنے حواس میں واپس آئی اور اپنی خاص کنیز شامہ سے آنکھیں چرانے لگی۔شامہ ایک معصوم اور ہمدرد لڑکی تھی وہ اُم سلمٰی کی مخمور آنکھوں میں غور سے جھانکنے لگی اور بالآخر کسی بات کو سمجھ کر قدرے مسکرائی جس پر اُم سلمٰی بھاگ کر اپنے کمرہ خاص میں اپنے بستر پر جا کر یکدم گری اور اپنے حواس کو مجتمع کرنے لگی پھر مدہوشی سے قدرے ہوش میں آئی تو ایک آہ سی اس کے دل سے نکل گئی اور وہ سوچنے لگی کہ اچانک اسے کیا ہو گیا تھا۔

یہ خوبرو نوجوان کون تھا، کہاں سے آیا تھا؟ چھپ چھپا کر کہاں جا رہا تھا اور یہ کہ اس کی نظروں میں وہ کیا بات تھی جس نے اس کے دل میں کھب کر ایک عجیب سی کیفیت پیدا کر دی تھی یہ کیسی سرشاری تھی جو اس کے اندر اضطراب پیدا کر رہی تھی اور یہ کیسی طلب تھی کہ اس نوجوان کو دوبارہ دیکھنے کی خواہش ہو رہی تھی۔

اُم سلمٰی کی محبوب کنیز شامہ اسی کی ہم عمر انتہائی خاص کنیز تھی جو اس کی خوشی میں خوش اور ناخوشی میں غمگین ہو جایا کرتی تھی لیکن شامہ اپنی مالکن کی موجودہ کیفیت جس میں وہ کبھی خود سے بڑبڑاتی، کبھی آنکھیں بند کرتی اور کبھی خود بخود نہ جانے کیا سوچ سوچ کر مسکرا رہی تھی، سمجھ نہ پا رہی تھی۔

شامہ کچھ دیر تو مالکن کو آنکھیں جھپکا جھپکا کر دیکھتی رہی پھر اس نے مالکن کو اسی کیفیت میں چھوڑ دیا کیونکہ آج مالکن اسے بے حد خوبصورت آسمان سے اتری ہوئی کوئی حور پری کی مانند نظر آ رہی تھی جس کے چہرے پر بکھرے قوس وقزح کے رنگ اسے ماورائی مخلوق بنا رہے تھے اس لئے اس موقع پر اپنی مالکن کو ڈسٹرب کرنا شامہ کو اچھا نہ لگا اسے تو بس اپنی آقازادی اسی روپ میں بھا رہی تھی اور اس کیفیت کی لذت شامہ کو بھی مسحور کئے دے رہی تھی۔

☆

حمیمہ کوئی بڑا قصبہ یا شہر نہ تھا مگر جنوبی فلسطین میں قافلوں کے اُس سنگم پر آباد تھا جہاں سے بصرہ، حجاز اور شمال میں عراق شام اور انطاکیہ تک سڑکیں جاتی تھیں۔ اِدھر کچھ دنوں سے اِس قصبہ میں خراسانی زیادہ چلتے پھرتے نظر آ رہے تھے۔ اُن دنوں عباسی تحریک زوروں پر تھی اور تحریک کے قائد امام ابراہیم بن محمد بن علی اسی قصبہ میں مقیم تھے۔ یہ تحریک دراصل عرب کے دو قبائل بنو ہاشم اور بنواُمیہ کے قبائلی اختلاف کا نتیجہ تھا جو بنوعباس کے سر اتفاقیہ طور پر آ گیا تھا۔

محمد بن علی کی وفات پر اُن کے بیٹے ابراہیم اِس تحریک کے اِمام ہوئے، اُس وقت تک یہ تحریک جو اب عباسی تحریک کے نام مشہور تھی، کافی زور پکڑ چکی تھی۔ محمد بن علی نے اِس تحریک کے نگران اعلیٰ کے طور پر بارہ نقیبوں کی ایک مجلس قائم کر لی تھی۔ اِس مجلس کے تحت ستر سرداروں کی ایک مجلس شوریٰ تھی۔ یہ مجلس ہر بات کو پوشیدہ رکھتی۔ نقیبوں اور داعیوں کا انتخاب کرتی۔ یہ داعی تاجروں اور فقیروں کے بھیس میں خراسان اور عراق کے گلی کوچوں میں پھرتے، لوگوں کو بنواُمیہ کے ظلم وستم سے آگاہ کرتے اور عباسی تحریک میں شرکت کی دعوت دیتے۔

پھر جیسے آسمانوں پر یہ فیصلہ ہوا کہ بنواُمیہ کو ختم کر کے خلافت اسلامی کا تاج بنوعباس کے سر پر رکھا جائے۔

امام ابراہیم کے زمانہ میں یہ تحریک کافی مضبوط ہو چکی تھی اور یہی وہ وقت تھا کہ امام ابراہیم کو ابومسلم خراسانی نام کا ایک شخص ہاتھ آیا جس نے عباسی تحریک کو وہ قوت عطا کی کہ وہ ایک فوجی طاقت بن کے پس منظر میں آ گئی اور آخرکار بنوامیہ کا زمانہ اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔

ابومسلم خراسانی تاریخ اسلام کی ایک ایسی شخصیت ہیں جن کے کارناموں کو کبھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ اِس سیماب صفت ذہین اور شجاع انسان کا اصل نام ابومسلم عبدالرحمٰن بن مسلم خراسانی تھا۔ ابومسلم دراصل اصفہان میں پیدا ہوا وہ نسلاً پارسی نژاد مُسلم تھا۔ ہر بڑے آدمی کے بچپن اور ترقی سے پہلے کے دنوں کی عجیب وغریب روایتیں مشہور ہوتی ہیں، ایسے ہی لوگوں میں ابومسلم خراسانی بھی تھا۔ تاریخ اِس کے بچپن کے بارے میں

بالکل خاموش ہے۔ بعض اُسے آزاد کہتے ہیں اور بعض کے خیال میں وہ غلام تھا۔ ایک روایت کے مطابق ابومسلم خراسانی کی پرورش کسی نقیب عیسٰی بن موسٰی سراج نے کی تھی اور اُسی کے ذریعہ ابومسلم اِس تحریک میں شامل ہوا تھا۔

بہر حال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ ابومسلم خراسانی ایک عالی دماغ ایرانی تھا اور امام محمد بن علی کے زمانہ میں وہ ایک مشہور داعی بن چکا تھا۔ پھر امام ابراہیم نے ۱۲۹ھ میں اُسے عراق اور خراسان میں عباسی تحریک کا داعی اعظم مقرر کیا ابومسلم کو اپنی قابلیت دکھانے کا پورا موقع ہاتھ آیا۔ اُس نے پورے عراق اور خراسان میں عباسی نقیبوں کا جال بچھا دیا۔ ہر مقام عباسی تحریک کے نعروں سے گونج اُٹھا۔ ابومسلم نے اپنی قابلیت سے عباسی تحریک کے ساتھ ساتھ ایک چھوٹی سی فوج بھی اکٹھی کر لی جو خراساں کے مختلف علاقوں میں عباسی تحریک کے لئے مسلح جدوجہد بھی کرتی تھی۔

جب ابومسلم کے فوجی دستوں اور خراساں کے اموی گورنر نصر بن سیار کے فوجی دستوں کے درمیان جگہ جگہ جھڑپیں شروع ہوئیں تو گورنر کو عباسی تحریک کا اندازہ ہوا۔ پہلے تو اُس نے خراساں کی فوج سے ابومسلم کو دبانا چاہا مگر جب اُسے اِس بڑھتی ہوئی طاقت کے مقابلے میں کوئی کامیابی نہ ہوئی تو اُس نے اِس کی اطلاع اموی خلیفہ مروان ثانی کو دی اور اُس سے مدد کا طالب ہوا۔ خلیفہ کی عمر اسی سال کے قریب ہو چکی تھی لیکن وہ اِس قدر جفاکش تھا کہ لوگ اُسے الحمار کے لقب سے پکارتے تھے۔ حمار کے معنی گدھے کے ہوتے ہیں لیکن عرب اُسے محنتی اور جفاکش کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ مروان الحمار اُس زمانے میں خارجیوں کی بغاوت دبانے میں مصروف تھا۔ فوری طور پر وہ نصر بن سیار کی کوئی مدد نہ کر سکا۔ خلیفہ کی اِس کمزوری سے نصر بن سیار بڑا دل برداشتہ ہوا۔ اُدھر ابومسلم خراسانی نے اموی خلافت کی کمزوری دیکھتے ہوئے حکومت سے بغاوت اور مسلح مقابلے کا فیصلہ کیا۔

ابومسلم اُس وقت ہرات کے مضافات میں تھا۔ اُس نے ۲۵ رمضان ۱۲۹ھ جمعرات کی شب اموی خلافت کے خاتمہ اور عباسی حکومت کے قیام کا اعلان کیا۔ اُس مقام کا نام سفید نج تھا۔ اُس شب ایک بہت بڑا الاؤ روشن کیا گیا۔ اُس وقت کسی بڑی مجلس کا اعلان اِسی طرح کیا جاتا تھا۔ ابومسلم نے عباسی تحریک کے شیدائیوں کو کہہ رکھا تھا کہ جس وقت وہ آگ کی روشنی اور دھواں دیکھیں تو سمجھ لیں کہ عباسی خلافت کا اعلان ہو گیا۔ چنانچہ وہ خود بھی اپنے گھروں میں الاؤ روشن کریں تا کہ دوسروں کو اِس اعلان کی اطلاع ہو جائے۔ آگ کے روشن ہوتے ہی لوگ مسلح ہو کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے پہلے اپنے گھروں میں آگ روشن کی پھر سفید نج کی طرف چل پڑے۔

دوسرے دن صبح سے عباسی فداکاروں کے گروہ کے گروہ سفید نج میں آنا شروع ہوئے۔ جب تحریک کے تمام بڑے بڑے سردار اکٹھا ہو گئے تو ابومسلم نے ایک پرجوش خطبہ دیا اور عباسی تحریک اور خلافت کا کھلم کھلا اعلان کر دیا۔ خلافت کے اعلان کی خبر بہت جلد امام ابراہیم کو ہو گئی جو حمیمہ میں مقیم تھے۔

اِس اعلان کے ساتھ ہی حمیمہ کی رونق بڑھ گئی۔ چونکہ عباسیوں کے امام ابراہیم وہاں تھے اِس لئے لوگوں نے امام کے حضور میں حاضر ہونا شروع کر دیا۔ امام ابراہیم اور ابومسلم خراسانی میں برابر رابطہ قائم تھا۔ امام نے حمیمہ کو ہیڈ کوارٹر بنایا تھا اور وہاں سے ابومسلم کو احکامات پہنچتے تھے۔ حمیمہ آنے والوں میں امام ابراہیم کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی۔ امام کے دو بھائی ابوالعباس سفاح اور ابوجعفر اُن کے ساتھ ہی رہتے تھے مگر امام ابراہیم نے احتیاط

کے طور پر اُن سے کہہ دیا تھا کہ وہ دونوں رات کے وقت خیمہ میں نہ رہا کریں بلکہ دن میں کسی وقت آ کے ضروری احکام لے جایا کریں۔ امام ابراہیم جانتے تھے کہ اموی خلیفہ انہیں کسی وقت بھی گرفتار کر کے قتل کرا سکتا تھا پس اگر اُن کے بھائی اُن کے ساتھ پکڑے گئے تو وہ بھی قتل ہو جائیں گے۔

اِن حالات میں امام ابراہیم کے دونوں بھائیوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ ابوجعفر تو امام سے ملنے نصف شب گزرنے کے بعد آتا تھا اور دوسرا بھائی ابوالعباس روزانہ نصف دن گزرنے کے بعد دوپہر کو آیا کرتا تھا اور یہی وہ ابوالعباس تھا جسے اُمّ سلمٰی روز جھروکے سے دیکھا کرتی تھی...... اور......وہ...... جو اُم سلمٰی کی زلف گرہ گیر کا شکار ہو گیا تھا۔ ابوالعباس نہایت تنومند اور رعنا جوان تھا اور کوئی وجہ نہ تھی کہ ایک دوشیزہ یا عورت اُسے ایک بار دیکھ لیتی تو دوبارہ دیکھنے کی خواہش نہ کرتی۔

☆

کیا آپ کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں؟

اگر آپ شاعر/مصنف/مولف ہیں اور اپنی کتاب چھپوانے کے خواہش مند ہیں تو ملک کے معروف پبلشرز ''علم و عرفان پبلشرز'' کی خدمات حاصل کیجئے، جسے بہت سے شہرت یافتہ مصنفین اور شعراء کی کتب چھاپنے کا اعزاز حاصل ہے۔ خوبصورت دیدہ زیب ٹائٹل اور اغلاط سے پاک کمپوزنگ، معیاری کاغذ، اعلیٰ طباعت اور مناسب دام کے ساتھ ساتھ پاکستان بھر میں پھیلا کتب فروشی کا وسیع نیٹ ورک...... کتاب چھاپنے کے تمام مراحل کی مکمل نگرانی ادارے کی ذمہ داری ہے۔ آپ بس میٹر (مواد) دیجئے اور کتاب لیجئے......

خواتین کے لیے سنہری موقع......سب کام گھر بیٹھے آپ کی مرضی کے عین مطابق......

ادارہ علم و عرفان پبلشرز ایک ایسا پبلشنگ ہاؤس ہے جو آپ کو ایک بہت مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے کیونکہ ادارہ ہذا پاکستان کے کئی ایک معروف شعراء/مصنفین کی کتب چھاپ رہا ہے، جن میں سے چند نام یہ ہیں......

عمیرہ احمد	ماہا ملک	فرحت اشتیاق	رخسانہ نگار عدنان	قیصرہ حیات	انجم انصار
نازیہ کنول نازی	نگہت عبداللہ	رفعت سراج	نبیلہ عزیز	نگہت سیما	میمونہ خورشید علی
اقراء صغیر احمد	ہاشم ندیم	طارق اسماعیل ساگر	ایم۔اے۔راحت	اعتبار ساجد	شیما مجید (تحقیق)
محی الدّین نواب	علیم الحق حقی	امجد جاوید	جاوید چوہدری	ایس۔ایم۔ظفر	

مکمل اعتماد کے ساتھ رابطہ کیجئے۔ علم و عرفان پبلشرز، اُردو بازار لاہور ilmoirfanpublishers@yahoo.com

اُمّ سلمٰی آج بھی جھروکے میں جھکی ہوئی تھی۔

اُمّ سلمٰی نے اپنا یہ دستور بنا رکھا تھا کہ جہاں دوپہر ہوئی اور سورج نصف النہار پر پہنچ کے چنگاریاں برسانے لگتا تو امّ سلمٰی جھٹ سے جھروکے میں آ بیٹھتی تھی پتہ نہیں وہ کون جوان تھا جس کی رعنائی نے امّ سلمٰی کو اس قدر بے چین کر دیا تھا کہ وہ ہر کام چھوڑ کر اس وقت جھروکے میں آ جاتی اور اس وقت تک کھڑکی کے پیچھے سے جھانکتی رہتی جب تک وہ وجیہہ جوان پوری گلی پار کر کے دوسری طرف مڑ نہ جاتا۔

اُمّ سلمٰی نے رات کو فیصلہ کیا تھا کہ اگلے دن یعنی آج جب اس کا منظورِ نظر گزرے گا تو وہ اپنی خادمہ اس کے پیچھے بھیج کر اس کا اتہ پتہ معلوم کروائے گی مگر جب وہ اپنے مقررہ وقت پر گلی میں داخل ہوا تو امّ سلمٰی جیسے اپنے حواس کھو بیٹھی اور اسے دیکھنے میں ایسی محو ہوئی کہ ایک لمحہ کے لئے تو اس پر سے نظریں نہ ہٹا سکی۔ آنے والا جیسے کسی دھن میں مست یا کسی الجھن میں گرفتار تھا اس نے اس دن کے بعد ایک دن بھی اس گلی سے گزرتے ہوئے دوبارہ نظریں اوپر نہ اٹھائی تھیں ورنہ یہ ممکن نہ تھا کہ اس کی گھائل نظر اس دومنزلہ مکان پر نہ پڑتی جس کے جھروکے سے اُم سلمٰی کی پراشتیاق نظریں اس کا تعاقب کرتی تھیں۔ اُم سلمٰی کا اس گلی میں واحد مکان تھا جو پختہ بنا ہوا تھا اور صرف اس مکان کے اوپر ایک اور منزل تعمیر تھی جس کے جھروکے سے امّ سلمٰی گلی میں جھانکتی تھی۔

آج بھی امّ سلمٰی نے سارا وقت اس شخص کے گلی کے ایک طرف سے داخل ہونے اور پوری گلی کو سر جھکائے ہوئے نپے تلے قدموں کے ساتھ پار کرنے میں گزار دیا تھا اور اُسے ایک لمحے کو بھی اپنی کنیز کا خیال نہ آیا کہ اُسے آواز دے کر اس بے پرواہ گزرنے والے کے پیچھے دوڑائے۔ اس میں امّ سلمٰی کا شوقِ دید کا وہ اہم جذبہ تھا جو اُسے گزرنے والے پر سے نظریں نہ ہٹانے دیتا تھا دوسری بات یہ بھی تھی کہ ایک بار اُس کا شعور اُس وقت پوری طرح بیدار تھا جب وہ بالکل اُس کے جھروکے کے نیچے سے گزر رہا تھا مگر اُس نے جان بوجھ کے کنیز کو آواز نہ دی تھی۔ اُس گھڑی اُم سلمٰی کی انا نے اُسے جھنجھوڑا تھا اور اُسے یہ بات یاد کرانے کی کوشش کی تھی کہ کسی اجنبی سے یہ دریافت کرنا کہ وہ کون ہے دراصل حُسن کی توہین تھی اور اگر اُس نے کنیز کے ذریعہ اُس سے یہ دریافت کرا لیا تو پھر اُس وقت ہمیشہ کے لئے بتانے والے کی نظروں میں گر جائے گی اور شاید پھر وہ کبھی اُس سے گفتگو بھی نہ کر سکے۔ اُسے یہ بھی خدشہ تھا کہ اگر اُس نے کنیز کو اپنے اور ایک اجنبی کے درمیان ایک بار واسطہ بنا لیا تو پھر کہیں کنیز اُس پر حاوی نہ ہو جائے اور ''منہ لگائی ڈومنی ناچے تال بے تال'' کے مانند اپنی ہر جائز اور ناجائز خواہش پوری کرانے کی کوشش نہ کرے۔

سب کچھ تھا مگر آج اُمّ سلمٰی اپنے محبوب کے اپنے سامنے سے گزرنے کے بعد کچھ پریشان اور گھبرائی ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ اُس محبت کا اثر ہو جو اُسے ایک غیر آدمی سے خود بخود ہو گئی تھی اور روز بروز اس میں اضافہ بھی ہو رہا تھا مگر کیا محبت کے معاملہ میں اُس کی یہ روش درست تھی اُم سلمٰی نے جیسے اپنے دل سے سوال کیا اور دل جیسے:

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق کی مثال بنا ہوا تھا اس کے دل کی گہرائی سے فوراً آواز آئی:

''اے نادان عشق کے کوچہ میں آنا اور خودداری بھی برتنا نہیں چلتا اور عشق تو اصل میں محبوب کے دل میں پہلے پیدا ہوتا ہے۔''

''شمامہ'' اُس نے جیسے خواب میں اپنی کنیز کو آواز دی۔ اور اُس کی وفادار کنیز شمامہ شیطان کی طرح جیسے فوراً نازل ہو گئی۔

''فرمایئے آقازادی! کنیز حاضر ہے'' اور کنیز نے سینے پر ہاتھ باندھ کر نظریں نیچی کرلیں۔

''کل سے تم ہمارے قریب رہو گی'' امّ سلمیٰ نے ایک غیر واضح حکم دیا۔

''میں آپ کے قریب ہی رہتی ہوں آقازادی!'' شامہ نے تعجب سے مالکن کو دیکھا۔ اُم سلمیٰ اُس کی مالکن تھی مگر شامہ اُسے مالکن کہنے سے نہ معلوم کیوں جھجکتی تھی۔

''آقازادی! جب بھی آواز دیں گی مجھے اپنے قریب ہی پائیں گی آپ کی ملازمت میں آنے کے بعد میں نے آج تک حویلی کی ڈیوڑھی کے باہر کبھی قدم نہیں رکھا۔''

''شامہ میری بات سمجھنے کی کوشش کرو'' اُم سلمیٰ نے نرمی اور سختی کے ملے جلے لہجے میں سمجھایا۔

''تمہیں میرے پاس رہنا چاہئے۔''

''جی میری آقازادی!'' شامہ نے بغیر سوچے سمجھے فوراً جواب دیا۔ اُسے محسوس ہوا تھا جیسے اُس کی مالکن اُس کے پہلے جواب سے کچھ ناراض ہوگئی ہے اور مالکن کی ناراضگی کسی کنیز کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہوتا ہے اس لئے شامہ نے جواب دینے میں بڑی تیزی دکھائی تاکہ مالکن کے دل میں اُس کی طرف سے آتا ہوا میل دوٗر ہو جائے اور اُس کی وفاداری میں کوئی شبہ پیدا نہ ہو۔

''میں نے تم سے کیا کہا تھا؟'' اُم سلمیٰ نے ایک اور اُلٹا سوال کیا۔

''آپ نے؟'' شامہ نے ذہن پر فوراً زور ڈالا۔

''آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ہر وقت آپ کے پاس موجود رہوں۔''

''ہاں۔ میں نے یہی کہا تھا مگر تمہیں کس وقت موجود رہنا چاہیے؟''

شامہ پریشان ہوگئی۔ آج اُس کی مالکن نہ معلوم کیسے آڑے ترچھے سوال کر رہی تھی۔

کنیز نے عاجزی سے کہا ''میں آپ کی کنیز ہوں اور کنیز کو ہر وقت آقازادی کی نظروں کے سامنے رہنا چاہیے۔''

''شامہ! تم اب بھی میری بات نہیں سمجھیں۔''

اور شامہ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اُسے اپنی وفاداری پر بہت ناز تھا۔ حویلی کی دوسری کنیزیں صاف الفاظ میں کہتی تھیں کہ شامہ تو مالکن کی ناک کا بال ہے اور وہ اپنی مالکن کی بات اب تک نہ سمجھ سکی تھی اس لئے وہ بے بسی سے آقازادی کا منہ دیکھنے لگی۔

''مجھے تمہاری وفاداریوں پر فخر ہے شامہ!'' آقازادی نے نرمی سے کہا ''اس لئے میں نے تم سے کہا تھا کہ تم اُس وقت میرے پاس ضرور رہا کرو جس وقت وہ گلی سے گزر رہا ہو، آیا تمہاری سمجھ میں؟''

''جی جی بالکل آگیا۔'' شامہ نے فخر سے کہا۔

''کیا سمجھ میں آگیا؟'' شامہ کی آقازادی نے پوچھا۔

''اُس وقت میں آپ کے پاس رہا کروں جب وہ گلی سے گزر رہا ہو'' اور شامہ نے ایک اطمینان کا سانس لیا۔

''کون گزر رہا ہو؟'' اُم سلمیٰ آقازادی نے پوچھا۔

''کون گزر رہا ہو......'' شامہ پھر گڑبڑا گئی۔...... ''کون گزر رہا ہو......کون گزر رہا ہو......؟''

اور اُس کی آقازادی اُم سلمیٰ کو اس کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آ گئی۔

''مجھے معاف کر دیجئے آقازادی! میں بھول گئی...... بالکل بھول گئی میں اچھی طرح سن نہ سکی...... کیا نام لیا تھا آپ نے......'' شامہ کی بوکھلاہٹ جیسے پھر لوٹ آئی وہ انگلیاں چٹخاتے ہوئے بولی ''آپ نے بتایا تھا....اچھا سا نام لیا تھا۔''

آقازادی (اُم سلمیٰ) کو پھر ہنسی آئی اور وہ ہنستے ہوئے بولیں ''ابھی میں نے اُس کا نام بتایا کب ہے؟''

''اچھا ابھی آپ نے اُس کا نام نہیں بتایا اور میں آپ ہی آپ بوکھلا گئی۔''

اُم سلمیٰ نے مسکرا کے کہا ''تم مجھ سے زیادہ گھبرائی ہوئی ہو بیٹھ جاؤ اور غور سے میری بات سنو۔''

شامہ سنبھل کے بیٹھ گئی اور بولی:

''میں غور سے آپ کی بات سُن رہی ہوں۔''

''مجھ سے مل کے بیٹھ جاؤ اور میرے ساتھ جھروکے سے نیچے دیکھو۔''

شامہ نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور اُم سلمیٰ کے ساتھ جھروکے سے نیچے دیکھنے لگی۔

''کہاں نظریں اٹک گئیں شامہ؟ میں نے صرف دیکھنے کو کہا تھا۔'' اُم سلمیٰ نے جھکی ہوئی شامہ کی پشت پر ہاتھ رکھا اور شامہ اُچھل کے سیدھی ہو گئی۔

''میں آپ کے حکم کے مطابق صرف نیچے دیکھ رہی تھی نظریں کہیں نہیں اٹکائیں'' پھر سر کے اوپر پڑے ڈوپٹے کو درست کرتے ہوئی بولی ''اس طرح جھروکے سے دیکھنا بڑا اچھا لگتا ہے۔''

''کچھ نظر بھی آیا تمہیں؟'' اُم سلمیٰ مسکرائی۔

''سب کچھ نظر آیا مگر وہ ''کون'' نظر نہیں آیا جس ''کون'' کا آپ نے ذکر کیا تھا۔''

''وہ کون؟'' اُم سلمیٰ چونکی۔

''وہی جس کے دیکھنے کے لئے آپ نے حکم دیا تھا۔''

اُم سلمیٰ کھلکھلا کے ہنس پڑی ''ابھی تم نے اُسے دیکھا ہی کہاں ہے میں نے بات شروع کی تھی اور تم بیچ میں بول پڑیں بات تو اُسی وقت کٹ گئی۔''

شامہ ہونق بنی مالکن کا منہ دیکھے جا رہی تھی۔

''اُس وقت وہ گزر چکا تھا'' اُم سلمیٰ نے بات پوری کرتے ہوئے کہا ''کل اس وقت وہ پھر جھروکے کے نیچے سے گزرے گا تم میرے

پاس رہنا میں اُس کی طرف اشارہ کروں گی تم نیچے اُتر جانا اور گلی کے سرے پر جا کر اُس سے اُس کا نام اور پتہ سمجھ لینا یا لکھ لینا۔''

ثامنہ نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔

''آپ فکر نہ کیجئے میں نام پتہ پوچھے بغیر اُسے ایک قدم آگے نہ بڑھنے دوں گی۔''

''تو کیا تو بیچ بازار میں اُس سے ہاتھا پائی کرے گی؟'' اُم سلمٰی نے ثامنہ کو گھور کے دیکھا۔

''ہاتھا پائی کیا اگر مجھے اُس کا سر بھی پھاڑنا پڑا تو بھی پیچھے نہ ہٹوں گی۔'' ثامنہ نے اپنے عزم کا اعلان کیا۔

''احمق پاگل کہیں کی'' اُم سلمٰی غصے سے بڑبڑائیں۔

''تو کیا میں اُسے یونہی چھوڑ دوں گی؟ آخر اُس کی کسی نہ کسی طرح زبان تو کھلوانا پڑے گی۔''

''خواہ اس سے پورے محلے میں اُم سلمٰی کی رسوائی کیوں نہ ہو۔'' اُم سلمٰی غصے سے کھڑی ہو گئیں۔

''بخشو ثامنہ! تم نے تو حد کر دی، زندگی میں پہلا کام تمہیں بتایا اُس کا بھی تم بیڑا غرق کرنے پر تُل گئی ہو۔''

''اے بی بی اُم سلمٰی! آپ ہی نے حکم دیا ہے کہ اُس سے نام پتہ پوچھ کے آنا۔''

''ارے ثامنہ! ذرا غور تو کرو تمہیں نام پتہ معلوم کرنے اس لئے بھیج رہی ہوں تا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو اور تم ہو کہ مجمع لگانے کے ڈول ڈال رہی ہو! اپنا مطلب نکالنے کے لئے انسان گدھے کو بھی باپ بنالیتا ہے۔ میں تمہیں عقلمند سمجھتی تھی لیکن تم تو بڑی بدھو نکلیں۔''

ثامنہ بھی ایک جھرجھری لے کے کھڑی ہو گئی۔

''آپ نے پہلے ہی کہہ دیا ہوتا کہ یہ راز کی بات ہے۔''

''میری ہر بات راز کی بات ہوتی ہے اور جس کام کے لئے تم سے کہا جائے تو ضرور راز کی بات ہو گی۔'' اُم سلمٰی نے غصہ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ناراض نہ ہوئیے آقازادی! مجھے اپنی کارگزاری دکھانے کا ایک موقعہ تو دیجئے؟''

''میں خود بھی تمہیں ایک موقعہ دینا چاہتی ہوں'' اُم سلمٰی کا انداز بالکل فیصلہ کن تھا ''اگر تم نے کوئی حماقت کی تو بس پھر تمہاری چھٹی ہو جائے گی۔ میں اگر چہ تمہیں ملازمت سے الگ نہیں کروں گی مگر میں تمہیں اپنی خدمت سے علیحدہ کر کے حویلی کی کسی اور خدمت پر لگا دوں گی۔''

ثامنہ کو ایک نالائق کنیز کہنا کسی طرح درست نہ تھا۔ اُس کی دیانتداری اور وفاداری کی اُم سلمٰی خود تعریف کرتی تھی اور اسے خاص محبوب کنیز کا درجہ دیتی تھی تو ثامنہ بھی امّ سلمٰی کی تمام ضرورتوں کا خاص خیال رکھتی تھی۔ صبح کو بھی وہ ایک مقررہ وقت پر بیدار کرتی پھر ایک طے شدہ نظام اوقات کے تحت وہ اُم سلمٰی کے کام نہ صرف خود کرتی بلکہ امّ سلمٰی کو بھی مجبور کرتی کہ وہ بھی اپنے مقررہ کام کو وقت سے ذرا بھی ادھر سے اُدھر نہ ہونے دے۔ اس نظام کار نے ثامنہ کو چکر گھنّی بنا کر رکھ دیا تھا۔ اُسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ رہ گیا تھا بس وہ بیٹھی گھڑیاں گنتی رہتی اس گھڑی یہ کام کرنا ہے اور اُس گھڑی وہ کام، یہ کام اُسے خود کرنا ہے، اس کے لئے اُسے آقازادی سے مدد لینا ہو گی۔

پچھلے ہفتہ سے اُم سلمٰی کا دوپہر کے وقت جھروکے کے سامنے بیٹھنا ایک نیا کام اُس کے سپرد ہو گیا تھا۔ سورج پوری طرح بلند بھی نہ ہوتا کہ شامہ لپکتی جھپکتی اُم سلمٰی کے سر پر جا کر سوار ہو جاتی۔

آقازادی، دوپہر، جھروکہ اور یہ تین الفاظ کہہ کے شامہ اپنا کام پورا کر دیتی۔

ایسے وقت اُم سلمٰی عام طور سے اپنے سولہ سنگھار میں منہمک ہوتی شامہ بے دلی سے آسمان کو دیکھتی پھر ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر اور شوخی اُس کی آنکھوں میں لرزتی۔

''مجھے یاد ہے شامہ!......اُسی کی تیاری کر رہی ہوں۔''

اُم سلمٰی کے سولہ سنگھار سے تو یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے گھر کوئی مہمان آنے والا ہے اور مہمان بھی کوئی خاص ہی ہوگا جس کے لئے ام سلمٰی اتنا سنگھار کر رہی ہے۔ اس بھاگا دوڑی کی وجہ سے شامہ کو اپنا ہوش نہیں رہ گیا تھا مگر غریب شامہ کی آنکھیں گھر کا دروازہ اور دہلیز دیکھتے دیکھتے پتھرا جاتیں۔ لیکن اس حویلی میں کوئی خاص مہمان داخل نہ ہوتا۔ پھر عصر کی اذان اُسے دن کے ڈھلنے کا پتہ دیتی اور وہ آقازادی کی فکر سے نکل کے دوسرے کاموں میں لگ جاتی۔ آنے والے کے انتظار میں بیچاری شامہ تھک جاتی۔ اُس کا دل چاہتا کہ وہ آقازادی سے دریافت کرے کہ کیا آنے والا آج بھی نہ آئے گا مگر پھر وہ جلد ہی اپنی اس سوچ پر شرمندہ اور کھسیانی ہو جاتی تھی اُس کے غلام ذہن سے ایک غلامانہ آواز اُٹھتی:

''خبردار تو نے جو آقازادی کے کسی کام میں خود دخل دیا۔ کنیزیں سر جھکا کر خدمت میں لگی رہتی ہیں سوائے حکم کی بجا آوری کے باقی تمام باتوں کے لئے کنیزیں اور غلام گونگے، بہرے اور اندھے ہوتے ہیں اُن کی ذہانت اور وفاداری کی یہی سچی نشانیاں ہیں۔''

مگر آج تو اُسے آنکھیں اور کان کھلے رکھنے تھے۔ زبان پر بھی اُسے تالا نہیں لگانا تھا اور یہ سب کچھ اُسے اُم سلمٰی کے لئے کرنا تھا۔ آقازادی کا یہی حکم تھا۔

''آقازادی! دوپہر ہو رہی ہے جھروکہ۔''

اُم سلمٰی نے بالوں میں پہلا موتی پرویا ہی تھا کہ شامہ نے فقیر کی طرح صدا لگائی اُم سلمٰی نے گردن اونچی کر کے اُسے گھورا۔

''کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو میں نے بھی تیاری شروع کر دی ہے۔''

''آقازادی! اگر آپ ایک دن تیاری نہ کریں گی تو بھی کیا فرق پڑے گا'' شامہ نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

''گزرنے والا تو اُوپر دیکھے بغیر ہی نکل جاتا ہے ایسے سنگھار سے کیا فائدہ؟''

اُم سلمٰی کے موتی پروتے ہاتھ رُک گئے ''آج تمہیں بھی تو کچھ کرنا ہے شامہ!''

''جی ہاں آقازادی مجھے یاد ہے'' شامہ نے فوراً رٹا ہوا سبق پڑھا۔

''جب وہ نکڑ پر پہنچ کے دوسری طرف گھومے گا تو میں اُس کا نام پتہ معلوم کروں گی۔''

''اور اگر وہ رضامند ہو جائے تو ساتھ ہی لے آنا'' ام سلمٰی نے جیسے گرہ لگائی۔

''اس کا حکم تو نہیں دیا تھا آپ نے مجھے'' شامہ پریشان ہوتی ہوئی اُمّ سلمٰی کو دیکھنے لگی۔

''پہلے حکم نہیں دیا تھا تو اب اسے ہی حکم سمجھ لو'' اور اُم سلمٰی پھر سے موتی پرونے میں لگ گئی۔

شامہ نے کچھ اور پوچھنا چاہا مگر اُم سلمٰی کو کام میں مصروف دیکھ کر اُس کی ہمّت نے جواب دے دیا۔

''آج کا دن بھی پہاڑ ہو گیا کسی طرح کاٹے ہی نہیں کٹتا۔'' شامہ بڑبڑاتی ہوئی ادھر اُدھر گھومنے لگی۔ سورج کو تو اپنے وقت پر ہی نصف النہار پر پہنچنا تھا مگر شامہ کی بے چینی ہر دم بڑھتی جا رہی تھی۔ اُس کی آقازادی نے اب تک اُس کی وفاداریوں پر کوئی توجہ نہ دی تھی۔ شامہ چاہتی تھی کہ وہ آج ایسے سلیقے سے کام کرے کہ بس آقازادی کھل اُٹھے اور اُسے گلے لگا کر کہے کہ شامہ آج تو نے کمال کر دیا تُو واقعی بہت وفادار کنیز ہے۔ اُس کے کان آقازادی کے یہ الفاظ سننے کے لئے تڑپ رہے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اُسے محسوس ہوتا جیسے واقعی آقازادی اُس کی وفاداری کی تعریف کر رہی ہے مگر یہ سورج تھا کہ کمبخت اپنی جگہ سے ہل ہی نہ رہا تھا بس چیونٹی کی چال چل رہا تھا بد بخت۔

''شامہ'' آقازادی کی آواز گونجی اور شامہ ٹھٹھک کے کھڑی ہو گئی۔

''ذرا دیکھنا گلی میں کچھ رونق ہوئی۔''

اور یہ آواز سنتے ہی شامہ کے پیروں میں جیسے پہیے لگ گئے۔

شامہ بھاگ کے جھروکے میں پہنچی آہستہ سے چق ہٹا کر نیچے جھانکا چق کی تیلیوں میں گھنگرو ٹنکے ہوئے تھے، وہ سب کے سب اک دم بج اُٹھے۔ گلی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا تیمہ کا یہ بازار اس علاقہ میں بہت مشہور تھا۔ اس میں زیورات اور قیمتی پارچہ جات کی بہت سی دکانیں تھیں۔ دن بھر میں ہزاروں درہم کا لین دین ہوتا تھا۔ سوائے اُم سلمٰی کے مکان کے دوسرا کوئی مکان دو منزلہ نہ تھا۔ اُم سلمٰی چاہتی تو اپنے مکان کے نیچے کے حصے میں بہت سی دکانیں نکلوا کے کرایہ پر دے سکتی تھی مگر اُم سلمٰی خاندانی رئیس زادی تھی۔ روپے پیسے کا اُسے کوئی لالچ نہ تھا۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں کا بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ اور اب باپ بھی ساتھ چھوڑ گیا کیونکہ وہ جنگ میں مارا جا چکا تھا مگر باپ نے تعلیم و تربیت کا خاص اہتمام کیا تھا۔ باپ کے مرتے ہی اُم سلمٰی نے سارے گھر اور جائیداد کا پورا انتظام خود سنبھال لیا۔ فلسطین کی کئی بڑی بڑی چراگاہیں اور نخلستان اُم سلمٰی کے تھے۔ اس کے علاوہ اس گلی کے بیشتر مکانات بھی اُس کے تھے جن میں سے کچھ کرایہ پر اور باقی یونہی اُم سلمٰی نے لوگوں کو دے رکھے تھے۔

اُس کی حویلی کا نیچے کا حصّہ مہمان خانہ کا کام دیتا تھا جس میں دوسرے شہروں سے آنے والے اُس کے باپ کے دوست و احباب قیام کرتے تھے مگر اب یہ سلسلہ بند ہو گیا تھا اور نیچے کے زیادہ کمرے اُم سلمٰی کے غلاموں اور کنیزوں کے قبضے میں تھے۔

''بڑی رونق ہے آقازادی'' شامہ نے چق سے منہ کھینچ کر کہا۔

''کیا نیچے دیکھتے دیکھتے سو گئی تھی'' اُم سلمٰی نے ہنس کے پوچھا کیونکہ شامہ پھر گلی کی بھیڑ بھاڑ دیکھنے میں لگ گئی تھی۔ اس نے اُسے کافی دیر بعد جواب دیا تھا۔

''جی ہاں آقازادی'' شامہ اُس کے سامنے بیٹھتے ہوئے بولی ''رونق ہی ایسی ہے گلی میں جھروکے سے ہٹنے کو جی نہیں چاہتا۔''

''کوئی جاننے والا بھی دکھائی دیا؟'' اُم سلمٰی نے جان بوجھ کے اُسے چھیڑا۔

شامہ بھی اُم سلمٰی کی عمر کی تھی مگر بہت سیدھی سادی۔ بیوقوفی کی حد تک نیک مزاج۔ یہ اسی حویلی میں پیدا ہوئی تھی۔ اُس کے ماں باپ حویلی کے دوسرے کاموں پر لگے ہوتے تھے شامہ نک سُک کی درسُت اور صاف ستھری لڑکی تھی اس لئے اُم سلمٰی نے اُسے اپنی خدمت میں رکھا تھا۔ اُم سلمٰی کو وہ اس لئے بھی پسند تھی کہ وہ اکثر اوقات اپنی حماقت انگیز باتوں سے اُم سلمٰی کے لئے سامان ظرافت مُہیا کرتی رہتی تھی۔

شامہ نے اُم سلمٰی کے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔ اُس کے سوال پر دوبارہ غور کیا پھر جواب دیا۔

''یہ اپنی گلی ہے آقازادی! سب ہی جاننے والے لوگ ہیں۔ رحمان بابا عبدالملک، شموئیل میکائل کئی بار آتے جاتے دکھائی دیئے۔

''تو کب بڑی ہو گی شامہ؟'' اُم سلمٰی سمجھ گئی کہ اُس کے سوال کا مطلب خاک بھی شامہ کی سمجھ میں نہیں آیا۔

''میں بڑی ہو گئی ہوں آقازادی'' شامہ نے آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

اُم سلمٰی بناؤ سنگھار کر کے جھروکے کے پاس جا بیٹھی تھی۔ شامہ کے جواب پر اُس نے ذرا تعجب سے دیکھا۔

''اچھا تمہیں اپنے بڑے ہونے کا احساس ہے'' اُم سلمٰی نے سر ہلایا ''مگر تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ تم بڑی ہو گئی ہو کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس اس کا؟''

''آقازادی!'' شامہ کپڑے سمیٹ کے اُم سلمٰی کے پیروں میں بیٹھ گئی ''ایک دن میری ماں نے میرے باپ سے کہا تھا کہ شامہ اب بڑی ہو گئی ہے اس کی فکر کرو۔''

''تو پھر تمہارے باپ نے کیا جواب دیا؟''

اُم سلمٰی کی دلچسپی بڑھ گئی۔

''میرے باپ نے جواب دیا تھا کہ شامہ کی ماں، تمہاری بیٹی بڑی ہو کر تم سے زیادہ خوبصورت ہو گئی ہے'' شامہ نے سر اُٹھا کر بڑے فخر سے کہا۔

''لیکن مجھے تو ذرا بھی خوبصورت نہیں لگتی'' اُم سلمٰی نے از راہ مذاق کہا۔

''یہی میں بھی کہتی ہوں آقازادی!'' شامہ کے چہرے پر پریشانی طاری ہو گئی تھی۔

''پتہ نہیں بابا نے یہ کیوں کہا تھا؟''

''تو یونہی بدھو رہے گی'' اُم سلمٰی نے ہاتھ پکڑ کے اُسے جھروکے کے قریب کھینچا۔ ''یہاں بیٹھ اور میرے ساتھ جھروکے سے نیچے دیکھ۔''

شامہ نے جلدی سے سر پر پلو کھینچا اور وہ اس طرح مؤدب ہو گئی۔ جیسے کوئی بزرگ یا غیر مرد اُس کے سامنے آنے والا ہو۔

اُم سلمٰی ایک متمول گھرانے کی خودمختار خاتون تھی۔ اُس کے والدین کا انتقال ہو چکا تھا اور دُور نزدیک کا کوئی عزیز بھی نہ تھا جو اُم سلمٰی پر

روک ٹوک کرتا یا اُس کی طویل وعریض حویلی میں اُس کے ساتھ رہتا۔ اُم سلمٰی دولتمند ہونے کی وجہ سے کچھ خوددار بھی تھی لیکن تنہا رہنے کے باوجود آج تک کسی نے اُس کے کردار پر انگلی نہ اٹھائی تھی۔

اُم سلمٰی کی حویلی کے نیچے پھیلے ہوئے بازار کی رونقیں دم بدم بڑھتی جا رہی تھیں مگر آج جھروکے میں دیکھنے کے دوران کسی وقت اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور وہ یوں شرماتی جیسے کوئی اجنبی ایک دم اُس کے سامنے آ گیا ہو۔ اُم سلمٰی کی کنیز شامہ اُس سے زیادہ گھبرائی اور شرمائی ہوئی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی آقازادی نے جس اجنبی کا ذکر کیا تھا وہ اُسی کو دیکھنے آ رہا ہے۔

دوپہر کچھ ہی ڈھلی تھی کہ امام ابراہیم کا بھائی ابوالعباس، جو اِن دونوں کے لئے اجنبی تھا، گلی کے ایک سرے سے اپنے مقررہ وقت پر داخل ہوا اور اپنے خیالوں میں کھویا ہوا آہستہ آہستہ گلی سے گزرنے لگا۔ اُم سلمٰی نے آپ ہی آپ شرما کر جھروکے سے اپنا سر پیچھے کر لیا۔ اُس کا پورا چہرہ پسینے سے تر ہو گیا تھا مگر عجیب بات یہ تھی کہ شامہ کی نظریں جھروکے سے نیچے لگی تھیں، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ نظریں کسی متحرک چیز کا تعاقب کر رہی ہیں۔

''شامہ!'' اُم سلمٰی نے پسینہ پونچھتے ہوئے جیسے خواب میں آواز دی۔

''ہوں'' شامہ نے بھی اُسی طرح خوابوں میں جواب دیا۔

اُم سلمٰی نے چونک کے شامہ کو دیکھا کنیز نے آج تک اُسے کبھی اس انداز سے جواب نہ دیا تھا۔ اُم سلمٰی جب بھی اُسے پکارتیں وہ جواب میں ہاں جی ہاں یا پھر آ رہی ہوں آقازادی کے الفاظ سے جواب دیتی تھی اِس وقت تو اُس نے یوں جواب دیا تھا جیسے اُم سلمٰی نہیں بلکہ شامہ خود آقازادی ہے۔

''کیا دیکھ رہی ہے نیچے؟'' اُم سلمٰی کا لہجہ سخت ہو گیا۔

''جی آقازادی'' اور شامہ نے گھبرا کے سر پیچھے کر لیا۔

''میں پوچھتی ہوں کیا دیکھ رہی تھی نیچے؟'' اُم سلمٰی کو اُس پر غصہ آ رہا تھا۔

''جی میں، میں، میں اُسے دیکھ رہی تھی آقازادی!'' شامہ نے بوکھلائے لہجے میں جواب دیا اور پھر جھک کر جھروکے میں دیکھنے لگی۔

اُم سلمٰی نے بھی جھروکے سے سر لگا دیا ''اچھا تو تُو اُسے دیکھ رہی تھی؟''

''جی ہاں آقازادی! دیکھئے نا کیسا لمبا تڑنگا خوبصورت جوان ہے!'' شامہ نے جھروکے سے بغیر نظریں ہٹائے جواب دیا۔

''میری بات سُن'' اُم سلمٰی نے اُسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا ''معلوم ہے میں نے تجھے یہاں کیوں بٹھایا ہے؟''

شامہ کو فوراً ہوش آ گیا ''جی ہاں آقازادی! مجھے گلی کے نکڑ پر اجنبی کو روک کے اُس کا نام پتہ معلوم کرنا ہے۔''

''تو پھر یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہے؟ جا اپنا کام کر۔''

''مگر وہ اجنبی.........؟''

''وہی ہے یہ اجنبی جسے تو آنکھیں پھاڑ کے دیکھ رہی ہے۔''

''اچھا یہ ہے مگر ہے بڑا اچھا'' شامہ ڈوپٹہ سر پر ڈالتے ہوئے بولی۔

''مگر دیکھ'' اُم سلمٰی نے اُسے تاکید کی۔

''خبردار کوئی گستاخی نہ ہونے پائے گفتگو میں۔''

''ٹھیک ہے آقازادی آپ فکر نہ کیجئے۔''

شامہ فٹافٹ زینہ اُتر کے گلی میں پہنچ گئی۔

ابوالعباس نے حسب معمول گلی پار کی اور اُس کے اختتام پر دائیں جانب گھوما۔ اُدھر ایک چھوٹا سا میدان تھا پھر کھجوروں کا ایک باغ' باغ کے اُس طرف ایک کچی پکی آبادی دکھائی دیتی تھی اس پُر رونق گلی کا اختتام دراصل اِس محلے کا اختتام تھا جہاں سے ایک پگڈنڈی کھجوروں کے باغ کی طرف جاتی تھی۔ ابوالعباس اس پگڈنڈی پر چل رہا تھا۔ ابھی وہ دس قدم چلا ہوگا کہ اُس کی پشت کی طرف سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔ ابوالعباس نے پلٹ کر تو نہیں دیکھا مگر اُس کے قدم ایک دم رک گئے۔

''سنئے ذرا ٹھہریئے۔''

آواز اِس قدر واضح اور قریب سے آئی تھی کہ ابوالعباس کو پلٹ کر دیکھنا پڑا۔ ایک معمولی مگر معقول شکل وصورت کی دوشیزہ تیز تیز قدموں سے اُس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ابوالعباس کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے پریشانی کے آثار پیدا ہوئے مگر جوں جوں وہ دوشیزہ اُس سے قریب ہوتی گئی، ابوالعباس کے شکوک وشبہات دُور ہوتے گئے۔ دوشیزہ اُس کے قریب آ کر رک گئی مگر بجائے ابوالعباس سے گفتگو کرنے کے سر کا ڈوپٹہ درست کرنے لگ گئی جس کا شوخ پلّو اُس کے سر پر ٹھہر ہی نہیں رہا تھا۔

''کیا آپ نے مجھے آواز دی تھی؟'' ابوالعباس نے بڑے مہذب لہجے میں کہا۔

''میں...... ہاں...... نہیں۔'' شامہ بُری طرح بوکھلا گئی تھی۔

ابوالعباس اُسے چند لمحے اُسی دلچسپی سے دیکھتا رہا پھر مسکرایا۔

''آپ نے مجھے روک کے میرا وقت بھی خراب کیا اور اب میں آپ کی طرف نہیں دیکھ رہا ہوں جو کہنا ہے سلیقے سے فرمایئے۔''

شامہ نے نظریں اٹھا کر ابوالعباس کو دیکھا۔ اِس وقت اُس کی پشت شامہ کی طرف تھی اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ شامہ واقعی ابوالعباس کے اِس طرح بے دھڑک دیکھنے سے گھبرائی تھی۔ پوری حویلی میں سوائے آقازادی کے اور کوئی اُس سے آنکھ ملا کر بات نہ کرتا تھا۔ تمام ملازمین جانتے تھے کہ شامہ مالکن کی منہ چڑھی کنیز ہے اِس لئے ہر ایک اُس سے نظریں نیچے کر کے بات کرتا تھا پھر شامہ کو شاید پہلی مرتبہ اپنا احساس ہوا تھا۔ ابوالعباس کو وہ اپنی گلی میں داخل ہوتے دیکھ چکی تھی اور اُس کے دیکھنے میں ایسی محو ہوگئی تھی کہ اگر اُم سلمٰی اُسے آواز نہ دیتی تو اُس کی نظریں اُس خوبرو جوان پر سے نہ ہٹتیں۔ اُس کی گھبراہٹ بھی فطری تھی اِس لئے کہ جس جوان کو وہ جھروکے سے دیکھ رہی تھی وہ اِس وقت اُس سے صرف پانچ قدم کے فاصلے پر تھا اور جس کی شوخ نظریں اُس کے سراپا پر مرکوز تھیں۔

''میں آپ کا نام پوچھنا چاہتی ہوں اجنبی'' آخر شامہ نے خود پر قابو پالیا۔

''میرا نام مگر کیوں؟'' تعجب کے ساتھ ابوالعباس کے لہجے میں گھبراہٹ بھی تھی۔

''میں نہیں پُوچھ رہی ہوں بلکہ میری آقازادی نے پُوچھا ہے'' شامہ نے فوراُ وضاحت کی یا اپنی صفائی پیش کی۔ پہلے تو اُس کا یہی دل چاہا کہ کہہ دے کہ اے اجنبی تم کتنے بھولے ہو یہ بھی نہیں جانتے کہ کوئی دوشیزہ صرف اُس وقت کسی غیر مرد کا نام پوچھتی ہے جب وہ اُسے اچھا معلوم ہوتا ہو مگر اُسے فوراُ ہی خیال آیا کہ کہیں یہ بات اُس کی آقازادی تک نہ پہنچ جائے۔ آقازادی نے چلتے وقت اُسے تاکید کی تھی کہ گفتگو میں کوئی بدتمیزی نہ ہونے پائے۔

''مگر میں تمہیں اپنا نام کیوں بتاؤں؟'' ابوالعباس کا تعلق کیونکہ امام ابراہیم سے تھا اِس لئے وہ نام بتانے میں تکلّف کر رہا تھا۔

''جی یہ کیا بات ہوئی؟'' شامہ قدم بڑھا کے اُس کے مقابل آکے کھڑی ہوگئی ''بھلا نام بتانے میں کیا حرج ہے؟ میں اپنا نام بتاتی ہوں میرا نام شامہ ہے اب آپ بھی اپنا نام بتا دیجئے میں وعدہ کرتی ہوں کہ سوائے آقازادی کے اور کسی کو آپ کا نام نہیں بتاؤں گی۔''

''میں کیوں بتاؤں جبکہ میں نہ آپ کو جانتا ہوں اور نہ آپ کی آقازادی کو۔'' ابوالعباس نے ٹالنے کی کوشش کی۔

''دیکھئے... میں نے اپنا نام پہلے ہی بتا دیا ہے'' شامہ نے بڑے بھولے پن سے کہا ''میری آقازادی کا نام اُمِ سلمیٰ ہے وہ اِس شہر کی سب سے زیادہ مالدار خاتون ہیں اب تو آپ کو اپنا نام بتا دینا چاہیے۔''

''آپ کی آقازادی کے والد کا کیا نام ہے؟'' ابوالعباس نے مزید تحقیق کی۔

''اُن کا انتقال ہو چکا ہے۔''

''اور والدہ کس خاندان سے ہیں؟''

''وہ بھی وفات پا چکی ہیں۔''

''آقازادی کے شوہر کیا کام کرتے ہیں؟''

''میں نے کہہ دیا ہے کہ اُن کے آگے پیچھے کوئی نہیں'' شامہ الجھنے لگی۔ ''حویلی میں وہ اکیلی رہتی ہیں اور صرف اُن کا حکم چلتا ہے اب تو اپنا نام بتا دیجئے۔''

''اِس کا مطلب ہے کہ آپ کی مالکن کا نام اُمِ سلمیٰ ہے جو حویلی میں آپ کے ساتھ تنہا رہتی ہیں۔''

''تنہا کیوں رہتی ہیں درجنوں کنیزیں اور غلام ہیں اُن کے'' شامہ چنک کے بولی۔

''ماشاءاللہ ماشاءاللہ'' ابوالعباس کو اِس کی معصومیت پر ہنسی آگئی ''آخر یہ آپ کی یا آپ کی آقازادی کی حویلی ہے کس جگہ؟''

''ہماری حویلی کی خاص پہچان یہ ہے کہ اِس حویلی کے اُوپر ایک اور پوری حویلی بنی ہوئی ہے جس کے ایک جھروکے سے نیچے جھانک کے میں نے آپ کو دیکھا تھا۔'' شامہ نے بڑی سادگی سے تفصیل بتائی۔

''جب آپ نے مجھے جھانک کے دیکھا تھا تو آپ کی آقازادی کہاں تھیں؟''

''واہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ میں اور آقازادی دونوں جھرو کے سے لگے بیٹھے تھے'' شامہ نے پوری وضاحت کردی۔

''یعنی آپ کی آقازادی نے بھی مجھے جھرو کے سے دیکھا ہے؟'' ابوالعباس نے ذرا گھبرا کے پُوچھا۔

''آقازادی نے آپ کو پہلے بھی دیکھا ہے بلکہ وہ تو آپ کو روز دیکھتی ہیں۔'' شامہ نے پوری تصدیق کردی۔''

''پہلے دیکھا ہے، کہاں دیکھا ہے مجھے؟'' ابوالعباس کی حیرت و پریشانی اور بڑھ گئی۔

ابوالعباس کو بتایا گیا تھا کہ خلافت کے کئی جاسوس حمیمہ کے قرب و جوار میں دیکھے گئے ہیں۔امام ابراہیم کے قیام کی وجہ سے حمیمہ عباسیوں کے مرکز کے نام سے مشہور ہو گیا تھا اس لئے اموی خلافت کی نظریں اس چھوٹے سے قصبہ کی طرف تھیں تو کوئی تعجب کی بات بھی نہ تھی خراساں کا گورنر نصر بن سیاّر اموی خلیفہ کو کئی بار لکھ چکا تھا کہ عباسی تحریک روز بروز زور پکڑتی جا رہی ہے۔اِس کا تدارک ضروری ہے لیکن اموی خلیفہ خارجیوں کے جھگڑے کی وجہ سے اِدھر توجہ نہ دے سکا تھا۔ابوالعباس کو خیال ہوا کہ اموی خلافت کی طرف سے کوئی جاسوس عورت اُس کے پیچھے نہ لگا دی گئی ہو جو اُسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے حمیمہ تک آ پہنچی ہو۔

''آپ گھبرا کیوں رہے ہیں؟ میری آقازادی کوئی ایسی ویسی خاتون نہیں ہیں پورا شہر اُن کی عزت کرتا ہے'' شامہ نے ابوالعباس کی پریشانی بھانپ لی'' آقازادی نے چلتے ہوئے تاکید کی تھی کہ آپ سے گفتگو میں کوئی بدتمیزی نہ ہونے پائے صرف نام اور پتہ پوچھنے کے لئے بھیجا گیا ہے مجھے آپ کے پاس۔''

''آپ کی آقازادی میرا نام کیوں معلوم کرنا چاہتی ہیں؟'' ابوالعباس نے فکرمندی سے کہا'' مجھے کس طرح جانتی ہیں وہ؟''

''آپ بڑے چالاک معلوم ہوتے ہیں'' شامہ نے ایک بار پھر ڈوپٹے کا پلّو سر پر ڈالا'' ہماری سب باتیں معلوم کرلیں اور اپنا نام بھی نہیں بتایا۔''

ابوالعباس نے واقعی کنیز اور آقازادی کے بارے میں سب کچھ معلوم کرلیا مگر اب بھی اپنا نام بتانے سے گھبرا رہا تھا۔شامہ کے سامنے وہ کچھ شرمندہ سا ہو گیا تھا آخر اُس نے بہت سوچ کے جواب دیا۔

''دیکھو شامہ یہی نام بتایا تھا تم نے اپنا؟''

''جی ہاں یہی بتایا تھا اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ آپ کا نام پتہ میری آقازادی اُم سلمٰی جاننا چاہتی ہیں مجھے آپ کے نام اور پتے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' شامہ نے منہ پھلا لیا اُس کے لہجے سے ناراضگی کا صاف اظہار ہو رہا تھا۔

''شامہ! تمہیں ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔'' ابوالعباس نے نرمی سے سمجھایا'' تمہاری آقازادی ایک خودمختار خاتون اور حویلی کی مالک ہیں مگر میری حالت تمہاری ہی طرح ہے۔میرے آگے پیچھے کوئی نہیں اور نہ کوئی پتہ ٹھکانہ۔تم خود ہی سوچو ایسا بیکار آدمی کسی کے کیا کام آ سکتا ہے پھر بھی اگر تمہاری آقازادی مجھ سے کوئی کام لینا چاہتی ہیں تو تم اُن سے کام کی نوعیت پوچھنا اگر میرے بس کا کام ہوا تو میں انکار نہ کروں گا اور اگر کوئی کام ایسا ہوا جو میری طاقت سے باہر ہے تو میں صاف انکار کردوں گا سمجھ میں آ گئی میری بات؟''

''بات تو تمہاری بس تھوڑی تھوڑی ٹھیک معلوم ہوتی ہے۔'' شامہ نے بھی آپ کے تکلف کو چھوڑ دیا۔ اگر تم میری طرح کسی کے پاس نوکر ہوتو تمہاری نوکری پکی معلوم ہوتی ہے ورنہ پکی نوکری والے تو اپنے مالکوں کے ساتھ رہا کرتے ہیں۔ میری بات بھی تمہاری سمجھ میں آ گئی ہوگی۔''

''تم بالکل صحیح کہہ رہی ہو شامہ!ابوالعباس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب تم جاؤ اور اپنی آقا زادی سے معلوم کرو کہ وہ مجھ سے کونسا کام لینا چاہتی ہیں؟''

''تو کیا تم میری واپسی تک یہیں کھڑے رہو گے؟'' شامہ نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''یہاں کھڑے ہونے کی کیا ضرورت ہے تم پوچھ رکھنا آئندہ جب ہم ملیں گے تو پھر باتیں ہوں گی۔'' ابوالعباس اب الجھنے لگا تھا اور کسی طرح پیچھا چھڑا کر بھاگنا چاہتا تھا۔

''تو پھر اب تم کب آؤ گے؟''

''جب میں نے تم سے کہہ دیا ہے تو پھر آنا ہی پڑے گا۔''

''کیا کل مجھ سے ملنے آؤ گے یا پھر.....'' اور شامہ اپنی سادگی کی وجہ سے بہکنے لگی۔

''پتہ نہیں تمہاری آقا زادی کیا جواب دیں بہرحال آئندہ تو تم سے ملاقات ہوگی۔''

''ٹھیک ہے میں آقا زادی سے پوچھ لوں گی کہ وہ تم سے۔ ارے تم نے اپنا نام نہیں بتایا اپنا کچھ تو اتہ پتہ بتاؤ میں آقا زادی کو تمہارا کیا حوالہ دوں گی؟''

''یہ سب آئندہ ہی بتاؤں گا'' ابوالعباس نے کہا۔

''آئندہ کب...... کس وقت.... کہاں؟''

''بس آئندہ.... یہیں۔''

''دیکھو مجھے دھوکہ مت دینا اگر تم نہ آئے تو میں خود تمہارے پاس آ جاؤں گی.... ہائے کہاں آ جاؤں گی' میں۔ تم نے اپنا گھر تو بتایا ہی نہیں، میرا مطلب ہے تم کس کے پاس رہتے ہو؟ اِس باغ کے اُس پار صرف ایک ہی محلّہ ہے وہاں تم کس کے پاس رہتے ہو؟''

''تم جاؤ شامہ'' ابوالعباس نے باغ کی طرف قدم بڑھائے'' آئندہ سے پہلے میں اور کچھ نہ بتاؤں گا۔''

اِس کے ساتھ ہی ابوالعباس کے قدم تیز ہو گئے اور اُس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

☆

عباسی تحریک کے امام ابراہیم فلسطین کے حمیمہ جیسے غیر معروف قصبہ میں آباد تھے۔ اُن کی ذاتی کوششوں اور ابو مسلم خراسانی کی ذہانت کی وجہ سے تحریک کافی مضبوط ہو گئی تھی مگر امام ابراہیم اب بھی بہت محتاط تھے۔ جب تک ملاقاتی کی پوری تفصیل نہ معلوم کر لیتے اُس سے ملاقات سے گریز کرتے تھے۔ امام کی اِس احتیاط کی وجہ سے دور دراز علاقوں کے اکثر داعی بغیر امام سے ملے واپس چلے جاتے تھے۔ ابوالعباس نے جب امام

ابرہیم سے آج کے واقعے کی تفصیل بیان کی تو امام ابرہیم پریشان ہو گئے اور بہت دیر تک سر جھکائے کچھ سوچتے رہے۔

ابوالعباس سے امام ابرہیم سر اُٹھا کر فکر مند لہجے میں بولے" یہ تو تم نے اچھا کیا کہ اپنا نام نہیں بتایا مگر سوال یہ ہے کہ تم گھر میں گھُس کے کب تک بیٹھے رہو گے اس سے تو تحریک کا بڑا نقصان ہو گا اس طرح تو......؟"

"بھائی جان! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں چند دنوں کے لئے کوفہ چلا جاؤں؟"

اِس معاملے میں اِس کی سمجھ میں یہ آیا کہ کچھ دنوں کے لئے حمیمہ سے کہیں دوُر چلا جائے تا کہ جب بات آئی گئی ہو جائے تو پھر حمیمہ واپس آ جائے۔

"خیال تو ٹھیک ہے، کوفہ زیادہ محفوظ ہے وہاں ہمارا داعی ابو مسلم خلال ہے۔ وہ شخص کافی قابل اعتماد ہے لیکن تمہارے جانے سے میرا بیرونی لوگوں سے رابطہ ختم ہو جائے گا۔"

امام ابراہیم کو بھائی کی بات رد کرنا پڑی۔

"خراسان کی طرف سے میں زیادہ فکر مند ہوں۔ ابو مسلم خراسانی کا عرصہ سے کوئی خط نہیں آیا، اُدھر سے اطمینان ہو تو پھر کوفہ کی فکر کی جائے۔ تم یہ کرو کہ دو چار دن میرے پاس آنے کا ناغہ کر دو ظاہر ہے اگر حکومت کے جاسوس تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں تو وہ تمہیں تلاش کرتے ہوئے میرے پاس ضرور آئیں گے اگر اِس عرصہ میں کوئی نہ آیا تو یہ سمجھ لیا جائے گا کہ تمہارا پیچھا کرنے والی عورت کا تعلق حکومت سے نہیں ہے پھر میں اُس عورت کے بارے میں معلومات بھی حاصل کر لوں گا۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے۔ میں ایک ہفتے کی غیر حاضری کر کے دیکھتا ہوں۔"

ابوالعباس نے امام کا کہنا تسلیم کر لیا اور رات گئے تک اُن کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ عام طور سے مغرب کی اذان سے پہلے حمیمہ سے واپس چلا جاتا تھا مگر اُس دن وہ دیر تک اُن کے پاس بیٹھا رہا۔ اُسے خطرہ تھا کہ واپسی کے وقت کہیں شامہ پھر اُس کا تعاقب نہ کرے۔ جب ہر طرف اندھیرا پھیل گیا اور کافی رات ہو گئی تو ابوالعباس امام سے رخصت ہو کر واپس ہوا۔ گلی نیم تاریک ہو چکی تھی سوائے قہوہ خانوں کے اور تمام دکانیں بند ہو چکی تھی۔ گلی میں گزرتے ہوئے غیر ارادی طور پر ابوالعباس کی نظر حویلی کے اُس بالا خانہ کی طرف اُٹھ گئی جس جھروکے میں اس کے دل کی دنیا آباد تھی۔

ابوالعباس جب بالا خانہ دیکھتا ہوا بالکل اُس کے نیچے آ گیا تو اُسے محسوس ہوا جیسے جھروکے میں کوئی کھڑا تھا جو اُسے دیکھ کے ہٹ گیا۔ ابوالعباس قدم بڑھاتا ہوا ایک ایسی تاریک جگہ جا کر کھڑا ہو گیا جہاں وہ کسی کو نظر نہ آ سکتا تھا اُس نے پلٹ کے حویلی کی طرف دیکھا تو حیران رہ گیا جھروکہ کے نیچے شامہ کھڑی پر تجسس نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ ابوالعباس کا دل مچل گیا اُس نے چاہا واپس جا کر شامہ کی آقازادی سے ملاقات کرے مگر اُسے فوراً امام ابراہیم کی تاکید یاد آ گئی۔ انھوں نے اُسے چند دن کے لئے اپنے یہاں آنے سے روکا تھا۔ اگر وہ اِس وقت ام سلمٰی کی کنیز خاص شامہ سے ملاقات کرتا تو یہ امام ابراہیم کی بات کی کھلی خلاف ورزی ہوتی۔ وہ اپنے اوپر جبر کئے اندھیرے میں کھڑا رہا۔ شامہ دیر تک آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے چاروں طرف دیکھتی رہی پھر بھاری بھاری قدموں سے واپس ہو گئی۔ شامہ منہ پھلائے اوپر پہنچی تو دوسری ملازمہ نے اُسے حکم سنایا۔

''آقازادی بہت دیر سے تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔''

ملازمہ نے شامہ کو تیزی سے زینہ اترتے دیکھ لیا تھا۔ اُس نے شامہ کے گلی میں جاتے ہی آقازادی اُمِ سلمٰی کو خبر دی تھی کہ شامہ باہر گلی میں گئی ہے اور اس اطلاع پر امّ سلمٰی چونک اُٹھی تھیں۔ اُس نے ملازمہ کو حکم دیا تھا کہ شامہ جس وقت واپس آئے اُسے فوراً اُس کے پاس بھیجا جائے۔ کوئی اور ہوتی تو شاید وہ آقازادی کے حکم کو سُن کر پریشان ہو گئی ہوتی مگر اِس گھڑی تو وہ خود آقازادی سے ملنا چاہتی تھی۔

''کہاں ہیں آقازادی؟'' شامہ کا لہجہ ذرا تلخ تھا۔

''مجھے کیوں آنکھیں دکھا رہی ہو؟'' ملازمہ نے غرا کر جواب دیا'' گلی میں تم گئی تھیں بس اب جا کے جواب دو آقازادی کو۔''

''جواب تو میں آقازادی کو ہی دوں گی مگر وہ ہیں کہاں میرا مطلب ہے حویلی کے اوپر والے حصہ میں ہیں یا نیچے کے حصہ میں؟'' شامہ ذرا نرم پڑ گئی۔ جس وقت وہ نیچے اُتری تھی تو اُس نے اُمِ سلمٰی کو چند خادماؤں کے ساتھ حویلی کے نچلے حصہ میں دیکھا تھا۔ حویلی کا وہ حصہ جو گلی کی طرف تھا۔

صبح کو جب شامہ نے واپس آ کر اپنی ناکامی کی داستان سے اپنی آقازادی کو آگاہ کیا تھا تو اُم سلمٰی نے ڈانٹا پھٹکارا تھا۔ شامہ نے دل برداشتہ ہو کے منہ پھلا لیا تھا اور صبح سے اب تک اُس نے حویلی کے نچلے حصے میں قدم بھی نہ رکھا تھا۔ وہ ہر گھڑی دو گھڑی بعد جھروکے سے نیچے دیکھتی تھی جیسے اُسے اجنبی کے آنے کی اُمید ہو۔ اُم سلمٰی کو اُس کے اس دیوانے پن کی خبر تھی تاہم اُس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی تھی مگر جب بتایا گیا کہ شامہ بغیر کسی کو کچھ بتائے اُتر کے نیچے چلی گئی ہے تو اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور اُس نے بڑے غصہ میں اُسے طلب کیا۔

شامہ کے ساتھ والی ملازمہ اُسے جواب دینے کے بجائے بڑبڑاتی ہوئی ایک طرف چلی گئی۔ آقازادی اُس وقت نیچے کے ایک کمرے میں تھی۔ شامہ وہیں اُس کے پاس پہنچ گئی۔ شامہ نے اُسے دیکھتے ہی اندازہ کر لیا کہ آقازادی اس وقت غصّے میں ہیں۔ مثل مشہور ہے ''گنوار گنوں کے یار'' یعنی گاؤں کے لوگ بظاہر سیدھے سادے بیوقوف نظر آتے ہیں مگر اپنے مطلب کو کسی وقت نظر انداز نہیں کرتے۔ شامہ نے سوچا کہ اگر اُس نے لمبی چوڑی بات شروع کی تو آقازادی کا غصہ اور زیادہ تیز ہو جائے گا۔ اِس لئے وہ بات کرے گی مختصر مگر ایسی کہ جسے سُن کر آقازادی کا غصہ دور ہو جائے اور وہ مسکرا دے۔ وہ آقازادی کے سامنے جا کر چپ چاپ کھڑی ہو گئی۔

آقازادی انتظار کرتی رہی کہ شاید شامہ خود اپنی صفائی میں کچھ کہے گی مگر شامہ نے جیسے چپ کا روزہ رکھ لیا تھا۔

''چپ کھڑی ہے منہ سے کچھ بولتی کیوں نہیں؟''

آقازادی کچھ پوچھیں تو بتاؤں شامہ نے سننے کی کوشش کی۔

''بتا کیا خوشخبری لینے گئی تھی نواب زادی؟'' آقازادی کا لفظ لفظ جل رہا تھا۔

''وہ آئے تھے آقازادی!'' شامہ نے سوکھے سے منہ سے کہا اور سر جھکا لیا۔

اُم سلمٰی چونک پڑی۔

''کون آئے تھے؟''

''وہی آقازادی! جن کے پیچھے آپ نے مجھے صبح کو بھیجا تھا۔''

آقازادی جلدی سے کھڑی ہوگئی اُسے جیسے پنکھے لگ گئے۔

''کہاں ہیں وہ کدھر بٹھایا ہے تو نے اُنھیں؟''

''میں اُن کے پاس پہنچ گئی تھی مگر وہ اندھیرے میں نہ جانے کدھر نکل گئے؟'' اور شامہ نے انگلیاں چٹخا کے افسوس کا اظہار کرنا شروع کر دیا۔

اُم سلمٰی نے اُسے اپنے پاس بٹھالیا۔

''اب ٹھیک سے بتاوہ کب آئے، کیسے آئے اور کدھر چلے گئے؟''

''آقازادی.....!'' شامہ نے رونے والا منہ بنالیا۔

آپ نے مجھے صبح کو بہت ڈانٹا تھا حالانکہ میں نے اُن سے نام پتہ پوچھنے کی بہت کوشش کی تھی۔ آپ کی باتیں میرے دل پر کچھ ایسی لگی تھیں کہ میں دن بھر جھروکے سے نیچے جھانکتی رہی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ آئے ہیں تو ضرور واپس جائیں گے۔ شام گزری اور رات ہوگئی مگر میں جھروکے کے پاس سے نہیں ہٹی۔ میری اُمید ٹوٹ رہی تھی کہ وہ ایک دم آتے ہوئے دکھائی دیئے مگر وہ جلدی میں معلوم ہوتے تھے میں اُوپر سے بھاگ کے زینہ پر پھر گلی میں نکل گئی۔ وہ حویلی کے پاس سے گزر چکے تھے، گلی میں اندھیرا تھا صرف کہیں کہیں پر روشنی پڑ رہی تھی وہ دُور پرے دکھائی دیئے اور پھر اندھیرے میں گم ہو گئے۔ میں نہ انہیں دوبارہ دیکھ سکی اور نہ ہی پکار سکی۔ مجھے اُن کا نام بھی نہیں معلوم تھا پھر پکارتی کیسے آپ ہی بتایئے میں کیا کروں؟''

اُم سلمٰی نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''اب وہ کبھی نہیں آئیں گے شامہ!......''

اور پھر اُم سلمٰی ایسی خاموش ہوئی کہ گویا اس کے دل کی دنیا لٹ گئی ہو۔

کافی دیر بعد خاموشی کے طلسم کو شامہ نے توڑا۔

''آقازادی! آپ نے یہ کیسے سوچا کہ وہ نہ آئیں گے؟''

شامہ کے دماغ میں الجھن پیدا ہونے لگی۔

''شامہ انھیں آنا ہوتا تو دن کو آتے'' اُم سلمٰی نے ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا۔ وہ تمہاری صبح کی گفتگو سے مطمئن نہیں ہو سکے اِس لئے دن میں واپس ہونے کے بجائے رات کو آئے تا کہ اندھیرے میں انہیں کوئی نہ دیکھ سکے میرا خیال ہے کہ وہ اپنے آپ کو تم پر کبھی ظاہر نہ کریں گے۔''

''آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں آقازادی! وہ آئیں گے اور ضرور آئیں گے'' شامہ نے بڑے یقین سے کہا ''میں وعدہ کرتی ہوں کہ اُن کا نام اور پتہ آپ کو لا کے ضرور دوں گی۔''

''شامہ! تم نے صبح و شام کے دونوں موقعے ضائع کر دیئے۔'' اُم سلمٰی نے بڑے دکھ سے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ کوئی بہت ہی اہم آدمی ہیں۔ اُن کا ایک وقت پر اس گلی سے گزرنا پھر اپنے نام اور پتے کے بارے میں اِس قدر

احتیاط برتنا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کا تعلق حمیمہ کی بستیوں سے نہیں ہے یہ پنچھی کسی اور دیس کا ہے شامہ پردیسی تو ہوا کا جھونکا ہوتے ہیں ادھر آئے اُدھر گئے۔"

شامہ اب بھی اپنی بات پر اڑی تھی۔

"آقازادی! دیکھیے گا وہ ضرور آئیں گے انہوں نے آنے کا وعدہ کیا ہے اور وہ بہت سچے آدمی محسوس ہوتے ہیں۔"

اُم سلمیٰ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر آئے اور اس نے طمانیت محسوس کی۔

شامہ بھی اپنی آقازادی کو مطمئن دیکھ کر شاد ہوگئی۔

پھر وہی دوپہر، وہی جھروکہ اور وہی انتظار۔ جوں جوں دن گزرتے جارہے تھے اُم سلمیٰ کی بے قراری بڑھتی جارہی تھی۔ انہیں نہ صبح کا ہوش تھا اور نہ رات کا خیال۔ اُم سلمیٰ انتظار کی بھٹی میں سلگ رہی تھی اور اس کی تپش شامہ بھی محسوس کررہی تھی۔ اُم سلمیٰ کیونکہ مالکن تھی اس لیے وہ رکھ رکھاؤ رکھتی تھی لیکن شامہ جو اس کے بہت قریب تھی اس کی خاص کنیز تھی وہ اپنی آقازادی کے دل کو سنبھالتی رہتی تھی اور ہر وقت یہی کہتی تھی "آقازادی! وہ ضرور آئیں گے۔"

ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا اُم سلمیٰ کسی کسی وقت جھروکہ میں آبیٹھتی مگر شامہ جو دوپہر کو جھروکہ پکڑتی تو جب تک رات کا اندھیرا نہ پھیل جاتا وہ وہاں سے نہ ہلتی۔ دن رات عجب سے ہوگئے تھے۔ اور دونوں کی مصروفیات بھی بے ترتیب۔

اور پھر ایک دن شامہ کے دل کا کہنا واقعی سچ ہوگیا۔ وہ اپنی ضدی طبیعت کے تحت جھروکے سے دوپہر کے وقت جھانک رہی تھی۔ اُم سلمیٰ اُس وقت دوسرے کمرے میں تھی۔ شامہ نے دیکھا کہ وہی اجنبی گلی کے اندر ایک طرف سے داخل ہورہا ہے۔ اُس نے وہیں بیٹھے بیٹھے آواز لگائی:

"آقازادی! جلدی آیئے، دیکھئے۔"

شامہ کی آواز اُم سلمیٰ تک پہنچی یا نہیں مگر اُس کمرے میں کام کرتی ایک خادمہ نے ضرور سنی۔ وہ شامہ سے پہلے ہی جلی ہوئی تھی۔ وہی کیا اُم سلمیٰ کی تمام کنیزیں اُس کے اس عروج سے جلتی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے شامہ نے پھر آواز دی۔

"جلدی آیئے آقازادی! آقازادی!"

"کیوں گدھے کی طرح ہینگ رہی ہے؟" کمرے میں موجود خادمہ چیخ اُٹھی "آقازادی تیری کنیز نہیں کہ تیری آواز پر دوڑی چلی آئیں۔ تجھے کام ہے تو خود اُن کے پاس جا۔"

شامہ نے جھروکے سے منہ ہٹا کر دیکھا اُسے غصہ تو بہت آیا مگر وہ اس وقت بات نہیں بڑھانا چاہتی تھی اس لئے خون کے گھونٹ پی کے رہ گئی چونکہ وقت کم تھا اس لئے شامہ آقازادی کو تلاش کرکے اطلاع دینے کے بجائے خود چپکے سے زینہ اُتر گئی۔ خادمہ کی تو اُس پر نظریں جمی تھیں۔ شامہ کے نیچے اُترتے ہی اُس نے پہلے خود جھانک کے نیچے دیکھا مگر سوائے شامہ کے اُسے کوئی اور صورت آشنا نظر نہ آئی صرف شامہ اُسے گلی میں بھاگتی دوڑتی نظر آئی۔ ملازمہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر آقازادی کی طرف اس کی شکایت کرنے چلی۔

''دیکھا آپ نے؟'' خادمہ نے آقازادی کے سامنے پہنچ کے جیسے بڑا تیر مارا'' وہ آج پھر نیچے گئی ہے میں نے اُسے گلی میں بھاگتے دیکھا ہے۔''

اُم سلمٰی کا دل جیسے اچھل کر باہر آ گیا اور وہ سمجھ گئی کہ شامہ کا اِس وقت نیچے جانا مصلحت سے خالی نہیں۔ ملازمہ کا انداز اور لہجہ اُسے بڑا ناگوار گزرا مگر جواب دینے کے بجائے وہ سیدھی جھروکے کے پاس پہنچ کر گلی میں جھانکنے لگی شامہ اُس وقت تک نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

''شامہ اُس طرف جارہی تھی آقازادی۔'' امّ سلمٰی کے پیچھے کھڑی ہوئی خادمہ نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔

اُم سلمٰی نے پلٹ کے دیکھا۔ یہ وہی خادمہ تھی جس نے شامہ کی شکایت کی تھی اِس سے پہلے بھی وہ ایک دو بار شامہ کی چغلی کر چکی تھی۔ اُم سلمٰی کو اُس پر پہلے ہی غصہ آیا ہوا تھا اب تو وہ آگ بگولہ ہوگئی۔

''دُور ہو جاؤ میری نظروں سے'' اُم سلمٰی نے اُسے پھٹکار دیا۔'' تجھے چغلی کھانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں، خبردار جو تو نے آئندہ شامہ کے بارے میں کوئی بات کی۔''

خادمہ کھسیانی ہوگئی۔

''آقازادی! میں نے چغلی کب کھائی؟ میں نے تو شامہ کے باہر جانے کی خبر آپ کو دی ہے۔''

''وہ میرے کام سے باہر گئی ہے جاؤ تم اپنا کام کرو۔''

اور خادمہ منہ لٹکائے جلدی سے ایک طرف چلی گئی اتنے غصے میں تو اس نے اپنی مالکن کو پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

دوسری طرف شامہ نے آج ابوالعباس کو جا پکڑا۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ ابوالعباس شامہ کی گرفت میں آ گیا۔ شامہ بجائے ابوالعباس کا تعاقب کرنے کے اُس سے پہلے ہی بھاگ کر گلی پار کر گئی اور موڑ پر ایک طرف ہو کے کھڑی ہوگئی پھر جیسے ہی ابوالعباس گلی سے مُڑ کر کھجور کے باغ کی طرف چلا، شامہ لپک کے اُس کے سامنے ہوگئی۔

''میں اجنبی کو سلام عرض کرتی ہوں۔'' شامہ مسکرا رہی تھی۔

''وعلیکم السلام کیسی ہو شامہ!'' ابوالعباس اُس کے ایک دم سامنے آنے سے گھبرا تو گیا تھا مگر فوراً ہی سنبھل گیا۔

''میں اچھی ہوں مگر آپ نے وعدہ خلافی کی'' شامہ کا انداز شکایت آمیز تھا۔

''وعدہ خلافی؟'' ابوالعباس نے اُسے حیران نظروں سے دیکھا'' میں نے کونسا وعدہ کیا تھا جو پورا نہیں کیا؟''

''آپ اُس دن دوپہر کے وقت مجھ سے ملے تھے مگر جاتے وقت آپ گلی سے چپکے سے گزرے اور اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ میں آپ کے پیچھے دوڑی تھی مگر آپ اندھیرے میں گُم ہو گئے'' شامہ جلدی جلدی ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گئی۔

''دیکھو شامہ!'' ابوالعباس نے اطمینان سے کہا'' پہلی بات تو یہ کہ میں نے اُس دن تم سے ملاقات کی تھی حالانکہ اُس روز بھی تم نے مجھے اسی جگہ روک کے باتیں کی تھیں دوسری بات یہ کہ میں واپسی میں چپکے سے نکل گیا؟ میں نے تم سے کب کہا تھا کہ میں واپسی میں ڈھول بجاتا ہوا گزروں گا تا کہ تمہیں اطلاع ہو جائے میں نے اپنی واپسی کا وقت نہیں بتایا تھا پھر تمہیں کس طرح مجھ سے شکایت پیدا ہو سکتی ہے؟''

شامہ اُس کے لہجے کی تلخی سے گھبرا گئی۔

''میں معافی چاہتی ہوں دراصل جب رات میں آپ واپس جا رہے تھے، اُس وقت میں جھروکے میں کھڑی تھی۔ اتفاقاً میری نظر آپ پر پڑ گئی۔ میں زینہ سے اُتر کر فوراً آپ کی طرف بڑھی مگر ہر طرف اندھیرا تھا، میں آپ کو نہ پا سکی۔''

''یہ تو اچھا ہوا خدا کا شکر ہے کہ میں تم کو نہ مل سکا۔''

''کیوں؟'' شامہ نے حیران نظروں سے ابوالعباس کو دیکھا ''کیا مجھ سے ملنا آپ کو بُرا لگتا ہے؟''

''کچھ ایسا اچھا بھی نہیں لگتا'' ابوالعباس نے بے پروائی سے کہا ''اگر اُس رات تمہاری گلی کا کوئی آدمی مجھے اور تمہیں گفتگو کرتے دیکھ لیتا تو کیا سوچتا؟ ممکن ہے کہ کوئی فتنہ کھڑا ہو جاتا۔''

''واہ کس کی مجال ہے کہ میری طرف آنکھ اُٹھا کے دیکھ سکے'' شامہ بڑے فخر سے بولی ''ہماری آقازادی کا اِس بازار میں اتنا رعب ہے کہ آج تک کسی نے جھروکے کی طرف آنکھ اُٹھا کے نہیں دیکھا۔ آدھے سے زیادہ بازار اُن کی ملکیت ہے۔ بڑے بڑے دکاندار اُن سے وقت پڑنے پر قرض لے جاتے ہیں، کیا سمجھتے ہیں آپ ہماری آقازادی کو؟''

ابوالعباس پر اُس وقت اُم سلمیٰ کا بڑا رعب پڑا۔

نرمی سے بولا۔

''شامہ! میں جانتا ہوں کہ تمہاری آقازادی ایک بہت ہی باعزت خاتون ہیں مگر احتیاط کرنے میں کیا حرج ہے؟ کیا ضرورت ہے کہ تم رات کے وقت حویلی سے باہر غیر مرد سے گفتگو کرو؟ لوگ اگر منہ سے نہ کہیں لیکن اُن کے دل میں غلط قسم کے شبہات تو پیدا ہو سکتے ہیں۔''

''ہاں یہ بات تو آپ نے ٹھیک کہی'' شامہ بدھو ہوتے ہوئے بھی ابوالعباس کی یہ بات سمجھ گئی ''مجھ سے غلطی ہو گئی معاف کر دیجئے اب ایسی غلطی نہیں کروں گی۔''

''خیر اب پریشان ہونے کی ضرورت نہیں'' ابوالعباس نے اُسے اطمینان دلایا ''میں نے اُس رات تمہیں دیکھ لیا تھا مگر جان بوجھ کے اِس وجہ سے نہیں ملا تھا کہ اِس میں میری اور تمہاری بدنامی کا خطرہ تھا۔''

''آپ بہت عقلمند ہیں اجنبی!'' شامہ خوش ہو گئی۔ پھر ذرا سوچتے ہوئے بولی ''اجنبی! آپ اپنا نام اور پتہ بتا دیجئے آقازادی روز مجھ سے پوچھتی ہیں روز آپ کو یاد کرتی ہیں۔''

''تمہاری آقازادی بھی مجھے بہت یاد آتی ہیں'' ابوالعباس نے نہ جانے کس خیال سے کہا۔

''اچھا......'' شامہ کھِل اُٹھی ''آپ نے انہیں دیکھا ہے کتنی خوبصورت ہیں میری آقازادی؟''

''ہاں دیکھا ہے مگر ملنے کی آرزو ہے۔''

''چلئے میں آپ کو ابھی ملائے دیتی ہوں۔'' پھر شامہ جیسے چونکی ''نہیں نہیں میں پہلے آقازادی سے پوچھ لوں پھر لے چلوں گی۔''

ابوالعباس مسکرایا۔

ٹھیک ہے ثمامہ! پہلے پوچھ لو پھر چلے چلیں گے۔''

ثمامہ نے فوراً کہا ''اب آپ اپنا پتہ اور نام بتایئے میں آقازادی کا پیغام لے کر حاضر ہوں گی۔''

ابوالعباس کو اب انکار کرنا مشکل ہو رہا تھا ''مجھے عبداللہ کہتے ہیں سامنے کے محلّے میں میرے پیرومرشد رہتے ہیں میں بس اُن کی زیارت کو آتا ہوں۔''

''بس مجھے معلوم ہو گیا، میں آقازادی کو سب کچھ بتا دوں گی پھر وہ جو پیغام دیں گی، وہ آپ کے پاس پہنچا دوں گی۔'' ابوالعباس اپنا نام ظاہر کر کے پریشان ہو رہا تھا اب جو ثمامہ نے پیغام لانے کا ذکر کیا تو گھبرا گیا جلدی سے بولا:

''مگر تم اپنی آقازادی کا پیغام کہاں پہنچاؤ گی میں اُن سے مل کے پتہ نہیں کس وقت واپس چلا جاؤں؟''

''پھر میں آپ سے کب اور کہاں مل سکوں گی؟'' ثمامہ نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔

''میں.... میں......'' ابوالعباس چند لمحے رک کے بولا ''میں تین دن بعد اِسی جگہ تم سے ملوں گا بس اب تم جاؤ مجھے دیر ہو رہی ہے۔''

''پیر صاحب کا نام بھی بتا دیجئے اگر تین دن بعد نہ آ سکے تو میں وہاں سے دریافت کر لوں گی'' ثمامہ نے احتیاط کے طور پر پوچھا۔

وہاں جانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے پیر صاحب کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا اور پیر صاحب ہر وقت مراقبہ میں رہتے ہیں، وہ کسی سے بات نہیں کرتے۔

ثمامہ اور کیا پوچھتی اُس نے عبداللہ کو رخصتی سلام کیا اور خوش خوش واپس ہوئی۔

اُم سلمٰی اپنے دل کو پکڑے جھروکے میں کھڑی ثمامہ کا انتظار کر رہی تھی ایک ایک لمحہ سو، سو برس کا محسوس ہو رہا تھا اسے یقین تھا کہ آج اس کے دل کی ریاضت کوئی معجزہ ضرور دکھائے گی۔ ثمامہ پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ واپس آئی اور اس نے آتے ہی دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

''ثمامہ تم یقیناً اُس اجنبی سے مل کے آ رہی ہو۔ اُس نے اپنا نام اور پتہ بتایا؟'' اُم سلمٰی نے پوچھا۔

''میں نے نام ٹھکانہ سب معلوم کر لیا ہے وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں آقازادی!''

اُم سلمٰی کے دل کی کلی کھل گئی اور اس نے اپنی خاص سہیلی، خاص کنیز ثمامہ کو بے ساختہ چوم لیا اور پھر ثمامہ نے آقازادی کو سارا احوال سنایا۔

☆

پھر ایک روز عبداللہ ابوالعباس دل کے ہاتھوں مجبور لوگوں کی نظریں بچا کر اُم سلمٰی کی حویلی میں ثمامہ کے ساتھ آ گیا۔ ثمامہ نے اسے مہمان خانہ میں ٹھہرایا اور خود بھاگی بھاگی اُم سلمٰی کو اطلاع دینے اوپر چلی گئی۔ اُم سلمی جس نے اس روز بہت زیادہ بناؤ سنگھار کیا ہوا تھا وہ اس خبر سے یک دم گھبرا گئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا جسے اس نے بڑی مشکل سے قابو میں کیا اور بڑے وقار کے ساتھ سر پر ڈوپٹہ ڈالے قدم اٹھاتی ہوئی نیچے آئی۔ چونکہ وہ پہلی مرتبہ اپنے محبوب کا سامنا کر رہی تھی اس لئے شرم وحیا سے اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔

دوسری جانب ابوالعباس جو کہ پہلی مرتبہ کسی کے گھر میں داخل ہو کر کسی خاتون کا تنہائی میں سامنا کر رہا تھا۔ اس لئے اس کے اوپر بھی بہت

زیادہ گھبراہٹ طاری تھی جس پر اس نے بہت زیادہ جی کڑا کر کے قابو پایا۔ گو وہ اندر سے ایک انجانے خوف سے گھبرا رہا تھا لیکن اس نے دل کی دھڑکن کو اپنے قابو میں کر لیا تھا اور اس طرح وہ بھی بے تابی سے دید محبوب کا متلاشی تھا۔

بہر حال دونوں ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ کر پہلے تو بہت زیادہ سٹپٹائے۔ دونوں کے دل کی دھڑکنیں یکلخت بہت بڑھ گئیں تھیں۔ نظریں ایک دوسرے کا طواف کرنے کی بجائے جھکی ہوئی تھیں۔ جسموں پر ایک قسم کا لرزہ طاری تھا۔ بہر حال کافی دیر تک وہ سکتے کی حالت میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے کھڑے رہے۔ پھر ابوالعباس کو ذرا ہوش آیا تو اس نے آہستہ سے مگر پیار بھرے لہجے میں اُم سلمٰی کو پکارا۔

اُم سلمٰی کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اس کے کانوں میں جلترنگ بج اٹھے ہوں اور اس کا دل چاہا کہ وہ اس آواز کی مدھر دھن میں ہمیشہ کے لئے گم ہو جائے پھر کافی دیر بعد اس نے بھی اپنی آنکھیں کھولیں اور پھر جیسے ہی ان کی نظریں آپس میں ٹکرائیں تو دونوں پر ہی عجیب سا نشہ اور خمار طاری ہو گیا اور دونوں نظروں ہی نظروں میں نہ جانے کیا کیا جام و پیام دیتے رہے۔ بہر حال کافی دیر بعد جب دونوں کے حواس بحال ہوئے تو ایک دوسرے کے بارے میں تعارفی باتوں کا سلسلہ چلا اور ابوالعباس پھر آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلے گئے۔

ابوالعباس نے اگلے روز اپنے بھائی امام ابراہیم سے بات کی جنہوں نے اپنے خاص داعیوں کے ذریعہ اُم سلمٰی کے خاندان کی مکمل چھان بین کی ہوئی تھی انہوں نے ابوالعباس کو اُم سلمٰی کے ساتھ شادی کی اجازت دے دی۔

اس طرح ایک روز ابوالعباس اور اُم سلمٰی باہمی رشتہ ازدواج میں انتہائی سادگی کے ساتھ منسلک ہو گئے اور اُم سلمٰی کی حویلی میں خوشی کے شادیانے بجنے لگے اور امام ابراہیم بن محمد، ابوالعباس کی طرف سے مطمئن ہو گئے۔

اُم سلمٰی کے محبوب شوہر عبداللہ جن کا پورا نام عبداللہ ابوالعباس محمد بن علی تھا امام ابراہیم کے پاس گئے اور پھر وہ وقت آیا کہ ایک دن اُن کے امام نے خود اُن سے کہا:

''میں بتاتا ہوں آج سے تم دونوں میرے ڈیرے سے دور رہو گے۔ ابوالعباس کا ٹھکانہ ہے، اُم سلمٰی کی حویلی میں رہ سکتا ہے ابوجعفر کسی سرائے میں مقیم ہو جائے گا۔ یہاں آنے کی کبھی کوشش نہ کرنا۔ میرا دل کہہ رہا ہے کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔''

اُم سلمٰی نے سنا تو اُس کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔ اُس نے رو رو کے برا حال کر لیا۔ ابوالعباس جتنا اُسے سمجھاتا اُس کی آنکھیں اتنی ہی زیادہ برستیں۔

بات بھی تو غضب کی تھی آخر امام ابراہیم نے فیصلہ کیا کہ ابوالعباس اپنی بیوی اُم سلمٰی کی حویلی میں اور اُس کا بھائی جعفر سرائے میں قیام کرے گا مگر اِن دونوں کو پھر امام کا حکم ملا:

''تم دونوں فوراً حمیمہ چھوڑ دو اور دو الگ الگ شہروں میں چلے جاؤ۔

اور انھیں امام کے حکم پر عمل کرنا پڑا۔

ابوالعباس اپنی بیوی اُم سلمٰی کو لے کر حمیمہ سے کوفہ چلے گئے۔

☆

ایک روز ابو مسلم کو امام ابراہیم بن محمد کا خط ملا کہ وہ اپنی دعوت کا کھلم کھلا اعلان کرے اور خراسان میں جتنے بھی عربی نژاد ہوں ان سب کو قتل کر دے لیکن یہ خط راہ میں پکڑا گیا اور خلفیہ مروان کے پاس پہنچا دیا گیا۔

خلفیہ مروان نے ولید بن معاویہ بن عبدالمالک کو جو دمشق کا حاکم تھا، لکھا کہ تم بلقاء کے گورنر کو لکھو کہ فوراً کرار الحمید جا کر ابراہیم بن محمد کو گرفتار کر کے بیڑیاں پہنا دے نیز تم اسے رسالہ کے ساتھ گرفتاری کے لئے بھیجنا۔

ولید نے عامل بلقاء کو اس کام کے لئے روانہ کیا۔ یہ ابراہیم کے پاس آیا جو گاؤں کی مسجد میں تھا اس نے اسے گرفتار کر کے اس کی مشکیں باندھ لیں اور ولید کے پاس بھیج دیا مروان نے اسے جیل میں بند کر دیا۔

جب ابو مسلم کو اس بات کا پتہ چلا کہ امام ابراہیم بن محمد گرفتار ہو گیا ہے تو اس نے نصر بن نعیم کی قیادت میں نصر بن سیار کے علاقہ ہرات پر حملہ کر دیا اور نصر کے عامل کو گرفتار کر کے وہاں قبضہ جما لیا۔

دوسری طرف عبداللہ بن معاویہ جو کہ عامل شیراز تھا اپنے خلفیہ کے عتاب کے ڈر سے کرمان کی جانب بھاگ گیا لیکن اسے بعد میں ابو مسلم کے حکم سے ہرات سے گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا گیا۔

تقریباً چھ ماہ بعد ابو مسلم نے مرو پر قبضہ جما لیا۔ ابو مسلم نے سلیمان بن کثیر یمنی اور مغری عربوں کے درمیان اختلاف بیان کرنے کے لئے چپکے سے دونوں فریقوں کو بلایا اور ان میں اپنا ہی ایک خط اس طرح پھیلا دیا کہ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی جس کے بعد یمنی عربوں نے کہا کہ۔

مضر آلِ رسول اللہ ﷺ کے قاتل ہیں۔ بنی امیہ کے اعوان اور مروان الجمدی کے انصار ہیں ہمارے خون ان کے گردنوں پر ہیں۔ ہمارا مال ان کے قبضہ میں ہے اور اس کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ نصر خراسان پر مروان کا عامل ہے اور اس کے احکام کو اجراء کرتا ہے۔ منبر پر اس کے لئے دُعا مانگتا ہے اور امیر المومنین کے لقب سے اسے یاد کرتا ہے ہم سے بالکل بے تعلق ہیں چاہے مروان امیر المومنین ہو اور چاہے حق وانصاف پر ہی کیوں نہ ہو۔ اس لئے ہم علی بن الکرمانی اور اس کے ربیعہ اور قحطانی طرف داروں کی حمایت کرتے ہیں۔ خود مسلم اور اس کے تمیں شیعان نے بھی اسی بات کی تائید کی۔ یہ رنگ دیکھ کر مصری وفد اٹھ کر ذلت وخواری کے ساتھ چلا گیا اور قحطانی وفد قاسم بن مجاشع کے رسالہ کے ساتھ محفوظ مقام پر چلا گیا اس دوران ۲۹ یوم تک ابو مسلم آلین میں ٹھہر رہا اور پھر اس نے شیعوں کو موسم سرما کے لئے مکان بنانے کا حکم دیا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے عربوں میں پھوٹ ڈال کر اب تم کو ان کی طرف سے مامون کر دیا ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے مقدر ہو چکا ہے کہ ہماری وجہ سے ان کے درمیان افتراق پیدا ہو۔

ابوالعباس کو کوفہ میں امام ابراہیم کی گرفتاری کی اطلاع ملی کہ انہیں حران جیل میں قید کر کے ایک روز خلفیہ مروان نے انہیں زہر دے کر مروا دیا اور اس طرح امام ابراہیم اس دار فانی سے رخصت ہو گئے ہیں۔ رخصت ہوتے ہوئے انہوں نے اپنے اہل خانہ کو بالواضح بتا دیا تھا کہ آئندہ ان کا جانشین ابوالعباس عبداللہ بن محمد ہوگا اور اس کی اطاعت ہر ایک پر لازم قرار دی گئی۔

جب کوفہ میں یہ اطلاع ملی تو ابوالعباس کو چالیس یوم تک اِدھر اُدھر چھپ کر اپنی تیاریاں کرنا پڑیں اور پھر اس کے تمام داعیوں نے اس سے رابطہ کیا اور پھر ۱۲ ربیع الاول ۱۳۲ ہجری کو لشکریان اور ہوا خان دولت عباسیہ مسلح ہو کر خالی سواریاں لئے ہوئے ابوالعباس کی خدمت میں حاضر

ہوئے اور ان کو معہ اہل بیعت کے سوار کرا کر دارالامارت لے گئے۔ ابوالعباس دارالامارت سے مسجد میں آئے خطبہ دیا، نماز باجماعت پڑھی' حاضرین نے بطیب خاطر بیعت کی۔ ابوالعباس بیعت لینے کے بعد دوبارہ منبر پر چڑھے ان کے چچا داؤدان کے ساتھ نیچے کے زینہ پر کھڑے ہوئے تھے۔ عبداللہ ابوالعباس نے خطبہ دیا جس میں اپنے کو مستحق خلافت اور وارث ہونا بیان کیا انہوں نے لوگوں کے وظائف بڑھا دیے اور خطبہ میں اور دوسرے اعلانوں کے علاوہ یہ بھی کہا:

''اے لوگو! واللہ ہم اس لئے حکومت کو حاصل کرنے کے لئے نہیں نکلے بلکہ ہم نے اس وجہ سے خروج کیا ہے کہ بنی امیہ نے ہمارے حقوق چھین لئے ہیں اور ہمارے چچا کے لڑکوں کو ستایا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تم پر ظلم کیا ہے اور وہ ناعاقبت اندیشی سے حکومت کرنے کا مظاہرہ کر رہے تھے اور ہم خاموش بیٹھے ان کے اس ظلم وستم کو دیکھ رہے تھے حالانکہ بنوامیہ کا یہ برتاؤ کہ تم لوگوں سے وہ کج اخلاقی سے پیش آئے اور تم کو ذلیل سمجھے اور تمہارے مال وغنیمت اور صدقات کو دبائے ہم کو سخت ناگوار اور شاق گزرا اللہ تبارک وتعالیٰ' اس کے رسول اللہ ﷺ اور عباس ابن عبدالمطلب کا ذمہ ہے کہ ہم تم میں وہی احکام جاری کریں جو اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائے ہیں۔ تمہارے قضایا ومحصولات میں کتاب اللہ پر عمل کریں اور خاص و عام سب کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا سا برتاؤ کریں......''

بنوعباس اور بنوامیہ کے درمیان جھڑپیں جاری رہیں اور بالآخر بنوعباس نے مکمل کامیابی حاصل کی اور دمشق پر قبضہ کرلیا۔ دمشق کی گلیوں میں خون کی ندیاں بہادی گئیں اور دمشق کو تقریباً نہتا کر دیا گیا۔

۲۶ ذی الحجہ ۱۳۲ ہجری وہ سنہری دن تھا جب عبداللہ بوالعباس' محمد بن علی بنوعباس کے سربراہ کے علاوہ تمام اسلامی مملکت کے خلفیہ قرار پائے۔

جلیل القدر شہزادی اُم سلمیٰ وہ خوش نصیب محترم خاتون ہیں جنہیں عبداللہ ابوالعباس جیسے عظیم خلفیہ کے دل کی ملکہ بننے کا شرف حاصل ہوا تاریخی واقعات کے مطابق شہزادی اُم سلمیٰ کو خلفیہ عبداللہ ابوالعباس کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

عشق کا شین (II)

کتاب گھر پر علیم الحق حقی کے تحریر کردہ ناول **عشق کا عین** اور **عشق کا شین (I)** کی بے پناہ کامیابی، اور قارئین کے پرزور اصرار پر اب پیش خدمت ہے **عشق کا شین (II)**۔ ان تمام قارئین کے لیے تحفہ خاص، جو اس ناول کا دوسرا حصہ علیم الحق حقی کا تحریر کردہ پڑھنا چاہتے تھے۔ عشق مجازی کے ریگزاروں سے عشق حقیقی کے گلزاروں تک کے سفر کی روداد...... علیم الحق حقی کی لازوال تحریر۔ **عشق کا شین(II)** کتاب گھر کے **معاشرتی رومانی ناول** سیکشن میں دستیاب ہے۔

شہزادی فلپائن......ایک تعارف

سرزمین افریقہ ایک ایسی سرزمین جوصدیوں سے اپنے اندر حیرت انگیز خزانے چھپائے دنیا کو آج بھی محوحیرت کرتی ہے ایک ایسی سرزمین جومختلف تہذیبوں اور مذہبوں کو ہرآنے والے دور کے لئے اپنے اندر سمیٹنے کی لازوال قوت رکھتی ہے اور جس سرزمین پر فرامین مصر کے علاوہ بربریوں، فاطمیوں، رومی حکمرانوں، ہسپانوی شاہ سواروں کی لاکھوں رومانوی تاریخی داستانیں چھپی ہوئی ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور رومانوی اور تاریخی داستان ملکہ قلوپطرہ، حسن مصر، حسن افریقہ کی داستان ہے جس نے صدیوں تک لوگوں کو اپنی رنگین مزاجی خاصیتوں سے حسن کے لازوال خزانے کی خوبصورت اداؤں میں محو کئے رکھا۔

اسی طرح بعد کے زمانہ میں جب مسلمانوں نے خلیفہ دوم کے عہد میں براعظم افریقہ کی جانب تیزی سے یورش کی تو اس وقت تک ان کا سامنا کئی غیر ملکی قابض حکمرانوں سے پڑا اور جس سے تاریخ کے اندر کئی انقلابی تغیر وتبدل آئے اور ساتھ ہی کئی رومانوی داستانوں میں بھی اضافہ ہوا خلیفہ دوم کے بعد جیسے جیسے اسلامی سلطنت کا دائرہ فتوحات وسیع ہوتا گیا ویسے ویسے مسلمان سپہ سالار اور سالاروں کے عجیب وغریب واقعات سے دوچار ہونا پڑا۔

خلیفہ سوم حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور حکومت میں جب مسلمان فاتحین نے شمالی افریقہ کے بہت وسیع تر حکمران ٹیونس شاہ جرجیر کے علاقوں میں یورش کی تو اس نے رومی، ہسپانی اور افریقی بربر فوجوں کے ساتھ مسلمانوں کے اس سیلاب بے پناہ کو روکنے کی بھرپور کوشش کی اور جب اس کو اپنی شکست کے آثار نظر آنے لگے تو اس نے آخری حربے کے طور پر ملکہ قلوپطرہ کے حسن ثانی کے مرقع اور ولی عہد سلطنت شہزادی فلپائن کو بھی داؤ پر لگا دیا اور اعلان کر دیا کہ شہزادی اس شخص کی بیوی بنے گی جو مسلمان سپہ سالار ابن ابی سرح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سر کاٹ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کرے گا نیز اس کو آدھی سلطنت بھی انعام میں دینے کا اعلان کیا گیا اس روشنی میں مسلمانوں کے لئے اپنے سپہ سالار کی حفاظت کرنا از حد مشکل ہو گیا اور وہ بڑی مشکل سے اس صورتحال سے نکل پائے۔

دوسری جانب شہزادی فلپائن جو حسن کا ایک ایسا مرقع تھی کہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر اس کا دیدار کرنا از حد مشکل تھا نیز وہ رعب وجلال اور آداب فن جنگ سے بخوبی واقف تھی کسی کو بھی اس کی منہ زور جوانی، دلفریبی حسن اور غرور طاقت دلیری کے سامنے ٹھہرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی ایسی شہزادی جس کے حسن وخوبصورتی کا چرچا سارے افریقہ اور سارے یورپ میں مشہور تھا اور جو بہادری کا لازوال نمونہ بھی تھا جس کے سامنے بڑے بڑے دلیروں کی دلیری ہوا کے جھونکے کی طرح خاک بسر ہو جاتی تھی وہی شہزادی مسلمان نائب سپہ سالار ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حسن، رعب، دبدبے، بہادری اور جانثاری کے ساتھ ساتھ ان کی دلفریب نظروں کا ایسا شکار بنتی ہے کہ بالآخر وہ خود ہی اپنے باپ کو مجبور کر دیتی ہے کہ وہ شکست کھا جائے لیکن اس کے دلبر پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔

☆ ☆ ☆

شہزادی فلپائن

روپال نے بھری محفل میں شہزادی کا ہاتھ پکڑلیا۔

ہر شخص حیران اور ہر چہرہ سوالیہ نشان بن گیا۔ یہ شہزادی کی کھلی توہین تھی۔ اتنی جرأت تو اب تک آرنلڈ بھی نہ کر سکا تھا جس کے متعلق عوام کا خیال تھا کہ شہزادی اس پر مہربان ہے۔ روپال' آرنلڈ کے بعد تیونس کا سب سے بہادر نوجوان تھا۔ صحرائی جنگوں میں اس نے کافی شہرت حاصل کر لی تھی لیکن شہزادی تو بہرصورت شہزادی تھی۔ بغیر اجازت تو کوئی شہزادی کے قریب تک نہ پھٹک سکتا تھا۔

شہزادی کا ہاتھ اب تک روپال کے ہاتھ میں تھا اور اس کے چہرے پر کئی رنگ آئے اور گئے۔ کئی تاثرات ابھرے اور مٹے۔ وہ خود بھی پریشان تھی کہ یہ کیا ہوا۔ تمام نظریں اُسی پر مرکوز تھیں۔ محفل کا رنگ ہی بگڑ گیا تھا۔ سازوں کی جھنکار ٹوٹ گئی تھی اور ساغر و مینا کی گردش رک کر رہ گئی تھی۔

لیکن حیرت اور استعجاب کے یہ لمحے زیادہ طول نہ کھینچ سکے۔ نظریں جواب تک شہزادی کے چہرہ کا ہالا کئے ہوئے تھیں۔ ان میں حرکت پیدا ہوئی۔ کچھ حاضرین نے گردن گھما کر شاہ جرجیر کو دیکھا اور کچھ نظریں آرنلڈ کی طرف اٹھیں۔ آرنلڈ رومی لشکر کا سب سے طاقتور' جانباز اور مشہور سردار تھا۔ گٹھیلا بدن' دراز قامت' چہرے کے سرخ و سفید رنگ میں چمکتی ہوئی آنکھیں جو نیلی تھیں اور بے وفائی کی مظہر بھی تھیں۔ تیونس کی کتنی ہی کنواریاں ان کی گہرائیوں میں غوطے کھا چکی تھیں۔

آرنلڈ جھومتا ہوا اٹھا۔ ہاتھ میں دبا ہوا ساغر مٹھی ہی میں چُر مُرا کر ٹوٹ چکا تھا۔ شراب میں اس کا خون شامل ہو کر سنگی فرش پر ایک لکیر بن گیا۔ روپال نے بھی شہزادی کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ اس کی اور آرنلڈ کی نظریں ملیں اور اس کے ساتھ ہی دو تلواریں بے نیام ہو کر ایک دوسرے سے ٹکرائیں ہر شخص دم بخود اور سناٹے میں تھا۔

قبل اس کے کہ ساکت سازوں سے کوئی نغمہ ابھرے ایک آواز بلند ہوئی۔

''خبردار یہ میدان جنگ نہیں محفل نشاط ہے۔''

یہ آواز شاہ جرجیر کی تھی۔ جرجیر ریاست تیونس کا عیسائی گورنر تھا لیکن اپنے بے پناہ اختیارات کی وجہ سے ''شاہ تیونس'' کہلاتا تھا۔ اپنا حکم' اپنا قانون اور اپنی فوج شرقی سلطنت روما کا وہ برائے نام باج گزار تھا۔ شاہ ایک اونچی جگہ پر اپنی چاندی کی مخصوص چوکی پر بیٹھا ساغر و مینا سے شغل کر رہا تھا کہ تلواروں کی جھنکار نے اسے چونکا دیا۔ اس نے ساتھ بیٹھے ہوئے اپنے سپہ سالار فلپ پر ایک معنی خیز نظر ڈالی پھر اٹھ کے آرنلڈ اور فلپ کے پاس آیا۔

شاہ نے سر سے بلند کی ہوئی تلواروں اور بہادروں کو دلچسپی سے دیکھا مسکرایا اور بولا۔

''تیونس کو ایسے ہی گرم خون کی ضرورت ہے لیکن ابھی نہیں۔ تلواریں نیام میں کرلو۔ ان سے رومی خون نہیں بہہ سکتا انھیں ظالم مسلمانوں کا

خون پینے کے لئے محفوظ رکھو۔

رومی جوانوں کی تلواریں نیام میں چلی گئیں اور دشمن دوست بن کر ایک دوسرے کے گلے لگ گئے۔ ساز نغمے بکھیرنے لگے۔ صراحی گردش میں آئی اور ساغر چھلکنے لگے۔ اس محفل نشاط کا اہتمام شاہ جرجیر کے ایک حکم کے تحت اور خاص موقع پر کیا گیا تھا۔ مصر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ مسلمان کسی وقت بھی تیونس کے دروازے پر دستک دے سکتے تھے۔ مصر سے اس کی سرحدیں ملی ہوئی تھیں۔ جب تک لشکرِ اسلام مصر کے رومی صوبہ دار مقوقس سے الجھارہا' جرجیر کے کان پر جوں تک نہ رینگی لیکن اب اسے اپنی خیر نظر نہ آتی تھی۔

مسلمانوں کے خطرے کے پیش نظر جرجیر نے بلاد ومغرب کی تمام عیسائی ریاستوں میں اپنے سفیر دوڑائے۔ بلاد ومغرب، شمالی مغرب افریقہ کے ایک بڑے حصہ پر محیط تھا۔ اس کی سرحدیں مشرق میں مصر اور مغرب میں بحر اوقیانوس سے ملتی تھیں۔ طرابلس' تیونس' الجزائر اور فارس اس خطہ کی خاص خاص ریاستیں تھیں۔ جرجیر کو اپنی تگ و دو میں کافی کامیابی حاصل ہوئی۔ ہر ریاست نے فوجی دستے روانہ کئے۔ شاہ جرجیر کا لشکر اس وقت ایک لاکھ بیس ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ لشکر کسی وقت بھی کوچ کر سکتا تھا۔ یہ جشن اس لشکر کی روانگی کی ایک کڑی تھی۔

شہزادی فلپائن' ولی عہد سلطنت تھی۔ قدرت نے اسے حسن صورت کے ساتھ ساتھ تدبر اور شجاعت سے نوازا تھا لیکن وہ اتنی ہی مغرور بھی تھی۔ آرنالڈ نے اس کی زلفوں سے کھیلنا چاہا۔ روپال نے اپنی بہادری کے سہارے شہزادی کی قربت کی آرزو کی لیکن فلپائن نے ہمیشہ فاصلہ برقرار رکھا اور دونوں میں سے کسی کو بھی قریب نہ آنے دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ روپال نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کے پندار کو ٹھیس پہنچائی۔ یہ اس کی اور اس کے حسن بیگانہ کی توہین تھی۔ کوئی اور محفل ہوتی تو شہزادی قیامت برپا کر دیتی لیکن اس محفل میں آنے سے پہلے شاہ جرجیر نے اسے خاص ہدایات دی تھیں۔ صبر و تحمل' خوش خلقی اور خوش مزاجی کے اظہار پر مجبور کیا تھا۔ اس نے شہزادی کے بارے میں ایک خاص فیصلہ کیا تھا۔ فیصلہ کیا تھا اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔

محفلِ نشاط آہستہ آہستہ شباب کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شہزادی دل برداشتہ ہو کر ہال کے برابر ایک کمرے میں جا بیٹھی تھی۔ لیکن ہال کی ہر دوشیزہ شہزادی بنی ہوئی تھی۔ ساز و آواز اب رقص میں شامل ہو گیا تھا۔ جوانیاں ناچ رہی تھیں۔ دوشیزگی اچھل رہی تھی۔ جسم کے تمام اعضاء ایک ساتھ متحرک تھے۔ جوڑے جوڑے' نوخیز اور جوان جوڑے۔ سانسوں کا زیر و بم، چہرے جھلسائے دے رہا تھا۔ بدن تپ رہے تھے اور یہ تپش آنکھوں سے ابلی پڑی تھی۔ کبھی دن کبھی رات کا منظر۔ جب فانوسوں کے سامنے پردے کھینچ کر اندھیرا کر دیا جاتا تو رقص میں گرمی ہی آجاتی۔

بادہ خوار اپنے رنگ میں مست تھے۔ کسی کے ہاتھ ساغر تو کوئی صراحی منہ میں لگائے ہوئے تھا۔ لرزتے ہاتھ جام کی طرف بڑھتے تو کئی کئی جام و صراحیاں فرش پر گر کر ایک خوشگوار جھنکار پیدا کرتیں۔ مسکراہٹیں بکھر جاتیں اور قہقہے بلند ہوتے اور رقص کرتے ہوئے پیر الجھ کر رہ جاتے تھے۔

شاہ جرجیر نے محفل میں ادھر ادھر نظریں دوڑائیں مگر شہزادی نظر نہ آئی تو اس نے فکر مند ہو کر غلام سے پوچھا۔ اس نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کر دیا۔ شاہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا دروازے پر پہنچا۔ چاہا کہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو لیکن اس نے دروازے کی طرف بڑھا ہوا اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ کہیں کوئی شہزادی کے ساتھ تو نہیں......؟ مگر...... مگر پھر اُسے فوراً اپنے بادشاہ ہونے کا احساس ہوا اور وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

شہزادی فلپائن کہنی پر سر رکھے میز کے سہارے اکیلی بیٹھی تھی۔ اس نے چونک کر شاہ کو دیکھا اور تعظیم کے لئے کھڑی ہو گئی۔ شاہ چند لمحے

شہزادی کے مغموم چہرے کو دیکھتا رہا پھر بولا۔

''لخت جگر تم افسردہ ہو؟''

''نہیں پاپا حضور!'' شہزادی نے مسکرانے کی کوشش کی، ناکام کوشش۔''ایسی کوئی بات نہیں ہے پاپا۔''

شاہ اس کے برابر بیٹھ گیا۔

''تم چاہو تو روپال کے ہاتھ قلم کئے جا سکتے ہیں۔''

''لیکن کیوں؟'' شہزادی کا چہرہ احساس توہین سے پھیکا پڑ گیا۔ پر وہ سنبھل کے بولی۔

''میں شہزادی ہوں'' اس کی تلوار مجھ سے زیادہ تیز نہیں۔ میں بزدل بھی نہیں شاہ پاپا......''

شہزادی کا گلا رندھ گیا اور تمام غصہ آنسو بن کر بہنے لگا۔

شاہ نے شہزادی کو محبت سے چمٹا لیا۔

''تم بہت قیمتی ہو فلپائن'' شاہ جوش سے بولا۔

''کوئی ہاتھ تم تک نہیں پہنچ سکتا اور جو ہاتھ تمہارے ہاتھوں میں ہوگا اس کے قدموں کے نیچے تیونس کے علاوہ مصر کی حکومت بھی ہوگی۔''

''مصر'' شہزادی فلپائن آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔

''پاپا کیا ہم مصر پر قبضہ کر سکیں گے......؟......''

اس وقت شاہ جرجیر بڑے جلال سے بولا:

''ہم مصر پر ضرور قابض ہوں گے۔''

شہزادی کچھ سوچ رہی تھی۔ جرجیر نے اسے خاموش دیکھ کر کہا:

''اٹھو شہزادی: باہر چلتے ہیں۔'' جرجیر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا:

''محفل گرم ہے تم اسے اور گرما سکتی ہو۔ جب تک ہم میدان جنگ میں نہیں پہنچتے تمہیں شاہی وقار کے تخت سے نیچے قدم اتارنا ہوں گے۔ تمہیں بہادروں کے قہقہوں میں اپنی آواز شامل کرنا ہوگی۔ ان کی دل جوئی کرنا ہوگی۔ تمہیں بے ہودگیاں اور گستاخیاں برداشت کرنا پڑیں گی۔ ان کی ہوس کی آگ کو تیز کرنا ہوگا لیکن دامن بچا کر۔ محبت کے چند شبنمی قطرے ان کی تشنگی کو بجھا سکتے ہیں پھر مصر ہمارے قبضے میں ہوگا۔''

شہزادی نے رخساروں سے آنسوؤں کی لکیریں صاف کیں۔ لباس درست کیا۔ بکھرے بال سمیٹے اور قد آدم آئینہ میں اپنا سراپا دیکھا پھر یوں مسکرائی جیسے اپنے آپ پر خود عاشق ہو گئی ہو وہ کمرے سے باہر آئی تو شعلہ جوالا بنی ہوئی تھی۔

خرام میں بہاروں کی مستی' لبوں پر شگوفوں کی مسکراہٹ' قدم قدم فتنہ' نظر نظر غمزہ' شہزادی فلپائن ناز وادا اور مسکراہٹیں لٹاتی باد بہاری کی طرح ہال میں جب داخل ہوئی تو اونگھتی محفل جیسے جاگ پڑی۔ ہوس پرست اور ہوس آلود نظروں نے اس کے ملکوتی حسن و پیکر کو گھیر لیا۔ فلپائن کا چہرہ'

برسات میں دھلے ہوئے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔

شہزادی مسکراتی' پیروں سے جادو جگاتی آرنلڈ کے پاس پہنچی۔ میز سے خالی ساغر اٹھایا۔ صراحی سنبھالی پھر ساغر بھرا اور آرنلڈ کی طرف بڑھاتے ہوئے سرگوشی کی۔

''پی جاؤ آرنلڈ۔ اس میں میری محبت شامل ہے۔''

آرنلڈ آواز کی نغمگی میں کھو گیا۔ اس نے شہزادی کی طرف نظریں بھی نہ اٹھائیں اور ایک ہی سانس میں ساغر خالی کر دیا۔ روپال کی کدورت کا غبار' شہزادی کی دی ہوئی شراب محبت سے دُھل گیا۔

شہزادی نے ایک اور نوازش کی جب آرنلڈ نے پشت کی طرف اپنی بانہیں شہزادی کے گلے میں ڈال دیں۔ آرنلڈ کی آنکھیں نامعلوم کیف سے بند ہونے لگیں تو شہزادی لپک کر آگے بڑھ گئی۔

اب شہزادی روپال کے قریب تھی۔ روپال کا دل کھل اٹھا۔ چہرہ دمکنے لگا۔ ایک لمحہ پہلے آرنلڈ کے خلاف حقارت کا اٹھتا ہوا دھواں' دھواں' دھواں ہو گیا۔ فلپائن نے جام پیش کرنے کی بجائے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھا دیا۔ یہ دعوتِ رقص کی خواہش تھی۔ روپال ہربڑا کر اٹھا اور شہزادی کا ہاتھ احترام سے تھام کر چوبی فرش پر پہنچ گیا۔

چاندی کی چوکی میں حرکت ہوئی۔ شاہ جرجیر' شہزادی کی شوخیاں بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ آرنلڈ کو نوازنے کے بعد جب شہزادی نے روپال کے ساتھ رقص شروع کیا۔ تو وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا اور آواز دبا کر ہنسنے لگا۔ شاہ جرجیر مضبوط اور اچھے تن و توش کا مالک تھا اس کی ہنسی میں چوکی کے پائے بھی شامل ہو گئے اور ڈولنے لگے۔

شاہ نے سپہ سالار سے کہا:

''دیکھتے ہو فلپ۔ شہزادی نے ایک تیر سے دو شکار کئے ہیں۔''

بوڑھا سپہ سالار عمر کی آخری منزل میں تھا۔ اسے نہ تو شہزادی کے حسن و جمال سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ یہ محفل نشاط اس کے خون کو گرم کر سکتی تھی۔ اس کی دور بین نظریں مسلمانوں کے بادو باراں کی طرح بلاد مغرب کی طرف بڑھتے ہوئے لشکر کو دیکھ رہی تھیں۔ دارالسلطنت مصر' فسطاط سے دارالسلطنت تیونس کا فاصلہ کم از کم نوے (9) دن کا تھا لیکن اسے مسلمان شتر سواروں اور گھڑ سواروں کے قدموں کی چاپ' فیتر واں کے دروازے پر سنائی دے رہی تھی۔

شاہ کی آواز پر وہ چونکا اور بولا۔

''شاہ معظم! شہزادی کا حسن بے شک ملکوتی ہے۔ شہزادی آسمانی دیوی ہے۔ میری دُعا ہے کہ اس کی پاکیزگی پر مصلحت کا گرد و غبار کبھی نہ پڑے۔ جتنی شفاف یہ آج ہے ہمیشہ ایسی رہے۔''

شاہ کو فلپ کا یہ فلسفیانہ انداز پسند نہ آیا اور صرف

''ہوں۔''

کہہ کراس نے سپہ سالار کی طرف سے منہ پھیر لیا ادھر فلپ پھر اپنے خیالوں میں ڈوب گیا۔

تمام ہال رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ کیا بوڑھے۔ کیا جوان سب ہی ایک رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ رقص کرتی 'بل کھاتی ساقی لڑکیاں جب کسی بڑھے ہوئے ہاتھ کی گرفت سے پہلو بچا کر تیزی سے نکل جاتیں تو پورا ہال بے ہنگم قہقہوں سے گونج اٹھتا۔ بوڑھا فلپ اور شاہ جرجیر اپنے خیالوں سے چونک پڑتے۔ دونوں کی سوچ ایک تھی۔ تصور کی آنکھیں انھیں میدان طرابلس کی سیر کرا رہی تھیں۔ صرف چار سال پہلے مسلمانوں نے طرابلس کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا یہ اور بات تھی کہ مسلمان اپنی مجبوریوں کی وجہ سے وہاں اپنا قبضہ برقرار نہ رکھ سکے اور شاہ جرجیر نے اپنا علاقہ واپس لے لیا لیکن خطرہ تو ہر صورت برقرار تھا اور اب یہ خطرہ سر پر آ گیا۔ جرجیر کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ فسطاط (قاہرہ) میں مسلمان جنگی تیاریاں کر رہے ہیں اور طرابلس پر ان کا حملہ یقینی ہے۔

جرجیر نے سر کو جھٹکا دیا جیسے وہ اُٹھتے ہوئے وسوسوں کو دور کرنا چاہتا ہو۔ ہم پھر مسلمانوں کو شکست دیں گے جرجیر نے جیسے اپنے آپ سے کہا لیکن اس کی آواز میں اتنی گرج تھی کہ فلپ اچھل پڑا اور گھبرا کر جرجیر کو دیکھنے لگا۔

''تم بتاؤ فلپ! کیا ہم مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتے؟'' جرجیر نے تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔

''ہم پہلے بھی شکست دے چکے ہیں شاہ معظم!'' فلپ نے بھی اُسی جوش کا اظہار کیا لیکن ہمیں بھی اپنے لشکر میں وہی جوش پیدا کرنا ہوگا جس جوش اور جذبہ سے مسلمان لڑتے ہیں۔''

جرجیر نے اسے گھور کے دیکھا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو تم، ہم مسلمان تو نہیں ہو سکتے۔''

''مسلمان ہونے کا تو تصور بھی گناہ ہے شاہ معظم!'' فلپ گھبرا کے بولا۔ ''لیکن مرض کی دوا کے ساتھ اگر دُعا بھی کی جائے تو مریض کو جلد شفا ہوتی ہے۔ ہم عبادت گاہوں میں جانے کے بجائے رقص و موسیقی کی محفلیں آراستہ کرتے ہیں۔ کیا یہ ہماری کمزوری نہیں؟''

شاہ کا جلال فلپ کی باتوں سے کم ہو گیا۔ وہ سنجیدگی سے بولا۔

تمہارے مشورے کا شکریہ فلپ! ہم حکم جاری کئے دیتے ہیں کہ ہمارے لشکر کے ساتھ راہب اور پادری بھی جائیں گے لیکن یہ بھی سوچنا چاہئے کہ جوانوں میں شجاعت کے جذبات ابھارنے کے لئے دُعا سے کہیں زیادہ راگ و رنگ کی یہ محفلیں ضروری ہوتی ہیں۔''

شاہ کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا لیکن بیٹھے بیٹھے تنگ آ گیا تھا وہ ہال کے باہر آیا۔ فلپ اس کے ساتھ تھا۔ شاہ میدان طے کر کے فصیل کے پاس آیا اور سیڑھیاں چڑھ کے اوپر پہنچا۔

قیتر واں' شاہ جرجیر کی ریاست تیونس کا صدر مقام تھا۔ یہ شہر بیک وقت فوجی چھاؤنی اور ایک زبردست قلعہ تھا۔ اسے بلادِ مغرب کا دروازہ بھی کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کی نظریں بلادِ مغرب کے اس دروازے پر لگی تھیں۔ شمالی افریقہ کی تمام ریاستیں اس سے واقف تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کی لشکر کشی کی اطلاع ملتے ہی انھوں نے اپنے فوجی دستے قیتر واں روانہ کر دئے تھے۔

قیتر واں کا شہر قلعہ کے اندر ہی آباد تھا۔ اس زمانہ کا عام دستور تھا کہ قلعہ کی حدود اس قدر طویل وعریض ہوتی تھیں کہ پورا شہر اس میں سما جاتا۔ جرجیر اور فلپ اوپر پہنچے تو ان کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا ہوگئی۔ قلعہ اور پورا شہر بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ ہر طرف روشنی ہی روشنی، رونقیں ہی رونقیں، راہداریاں روشن، برج، مینار روشن، شہر کے کوچہ و بازار روشن۔

جرجیر کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ اس نے کہا۔

''روشنی خوشی کی علامت ہے۔ ہماری رعایا خوشیاں منا رہی ہے۔''

''شاہ معظم'' فلپ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''روشنی خوشی کی علامت اور فتح کی نوید ہے۔ اس لئے اس روشنی کو دیکھ کر میرے دل کو بڑی تقویت ہوئی۔ جو ریاست اندرونی طور پر خوش حال ہو۔ اس کا بادشاہ دشمن کو آسانی سے شکست دے سکتا ہے اور مجھے امید ہے کہ خداوند یسوع مسیح کی برکت سے ہم ایک بار پھر دشمن کو شکست دیں گے اور.....................''

فلپ کی بات ختم نہ ہوئی تھی کہ آرنلڈ بھاگتا ہوا اوپر آیا اور وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔

''کیا ہوا آرنلڈ! اس قدر پریشانی کی کیا بات ہے؟ شاہ جرجیر اسے دیکھ کر خود بھی پریشان ہوگیا۔

''شاہ معظم!.....................شاہ معظم'' گھبراہٹ کی وجہ سے آرنلڈ کی آواز پوری طرح حلق سے نہ نکل رہی تھی۔ اس نے خود کو سنبھالا اور پھر ٹھہر ٹھہر کر کہا۔

''طرابلس کی مشرقی سرحد سے ایک تیز رفتار سوار آیا ہے اور.....................اور اسی وقت آپ سے ملنا چاہتا ہے؟''

''اس میں اس قدر پریشانی کی کیا بات ہے۔'' شاہ جرجیر نے بڑے سکون سے کہا حالانکہ اس کا دل خود بھی زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

آرنلڈ شرمندہ ہو کر شاہ کا منہ دیکھنے لگا۔ پھر جرجیر نے حکم دیا۔

''قاصد کو حاضر کیا جائے۔''

اس وقت قاصد خود ہی حاضر ہوگیا۔

قاصد شاہ سے ملنے کے لئے اس قدر بے چین تھا کہ اس نے آرنلڈ کی واپسی اور شاہ کی اجازت کا بھی انتظار نہ کیا اور روپال کو ساتھ لے کر فصیل پر آگیا۔

قریب پہنچ کر قاصد بڑے ادب سے تعظیم بجالایا۔

''تمہارا آنا بڑا مبارک ہو قاصد۔ کیا خبر لائے ہو۔'' شاہ اپنی پریشانی چھپاتے ہوئے بولا۔

''شاہ طرابلس اور تیونس کا اقبال بلند ہو۔'' قاصد نے کہا پھر اس نے آرنلڈ اور روپال پر نظر ڈالی۔

شاہ جرجیر قاصد کی بے اطمینانی کو بھانپ گیا اس نے قاصد کو اطمینان دلایا۔

''جو کہنا ہو۔ بے فکر ہو کے کہو۔'' پھر شاہ نے فلپ کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بالکل دوستانہ انداز میں کہا۔ ''یہ ہمارے دور اندیش سپہ سالار

فلپ ہیں اور یہ دونوں جوان ہمارے قابل اعتماد بہادروں میں شامل ہیں۔''

قاصد کو اطمینان نہ ہوا۔

''شاہ معظم مجھے حاکم سرحد نے تاکید کی ہے کہ سوائے شاہ تیونس اور سالار فوج کے کسی اور کے آگے زبان نہ کھولوں۔ اگر آپ کا یہ حکم ہے تو مجھے حاکم سرحد کی تاکید کو نظر انداز کرنے میں کوئی پس و پیش نہ ہوگا۔''

شاہ جرجیر کچھ سوچنے لگا۔ شاید وہ آرنلڈ اور روپال کو ناراض نہ کرنا چاہتا تھا۔ کچھ سوچ کے اس نے سر اٹھایا تو آرنلڈ اور روپال زینے کے قریب پہنچتے ہوئے دکھائی دیے۔ اسے اطمینان ہوا۔ مسکراتے ہوئے بولا۔

''تم نے ہمارے سرداروں کو دیکھا۔ بہادری کے ساتھ ساتھ عقل و دانش میں بھی یہ اپنا جواب نہیں رکھتے۔''

قاصد کچھ گھبرایا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔

شاہ معظم آپ کے سرداروں کی توہین مجھے مقصود نہ تھی لیکن اپنے سردار کی تاکید سے میں مجبور تھا۔ حکم ہو تو میں آپ کے معزز سرداروں سے جا کے معافی مانگ لوں؟''

''نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔'' شاہ نے قاصد کو اطمینان دلایا۔ ''ہم سردار سرحد کی اس احتیاط کی دل سے قدر کرتے ہیں۔''

سپہ سالار فلپ اس فضول گفتگو کو بڑی بے دلی سے سن رہا تھا۔ اس نے جھلا کے بادشاہ کو ٹوکا۔ ''شاہ معظم قاصد کوئی خبر لے کر آیا ہے۔''

''ہاں ہاں۔ کہو۔ کہو'' شاہ جلدی سے بولا۔ ''کیا یہ پیغام سپہ سالار سرحد نے بھیجا ہے۔''

قاصد کا سر اک دم جھک گیا۔ اس نے دبی آواز میں کہا۔ ''شاہ معظم کا تخت و تاج سدا سلامت رہے۔ ہمارے سالار کو معتبر ذرائع سے خبر ملی ہے کہ ظالم اور وحشی مسلمانوں کا ایک بڑا لشکر فسطاط سے چل پڑا ہے۔ دشمن کے لشکر کا رخ طرابلس کے ان ہی علاقوں کی طرف ہے جو چار سال پہلے ہم نے مسلمانوں کو شکست دے کر حاصل کیے تھے۔

شاہ جرجیر پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اس کا خیال تھا وہ اپنے لشکر کے ساتھ مصر پر حملہ کرے گا اور یہ جنگ مصر کی سرزمین پر ہوگی لیکن اب تو بساط ہی الٹ گئی تھی۔

شاہ کو خاموش دیکھ کر فلپ نے پوچھا:

''لشکر کی تعداد کتنی ہے؟''

''صحیح علم نہ ہو سکا سالار محترم'' قاصد نے جواب دیا۔ ''پھر بھی مخبر کی اطلاع کے مطابق مسلمان لشکر چالیس ہزار سے کسی طرح کم نہیں۔''

''فکر نہ کرو قاصد! ہم مسلمانوں کے مقابلہ پر ڈیڑھ لاکھ فوج لا سکتے ہیں۔'' شاہ بڑی تمکنت سے بولا۔

''لیکن شاہ معظم!'' قاصد نے ایک اور خبر سنائی۔

''سالار نے درخواست کی ہے کہ انہیں فوری کمک روانہ کی جائے ورنہ وہ ایک دن بھی مقابلہ نہ کر سکیں گے۔''

شاہ جرجیر نے جھک کر سپہ سالار کے کان میں کچھ کہا۔ فلپ نے جواب میں اپنا سر ہلایا پھر شاہ نے قاصد کو مخاطب کیا۔

ہم کمک تمہارے ساتھ بھیج رہے ہیں اور بہت جلد پورے لشکر کے ساتھ سرحد پر پہنچ جاؤ گے۔ تم تھکے ہوئے ہو۔ نیچے چلو اور محفلِ نشاط کا لطف اٹھاؤ۔''

شاہ چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔ قاصد حیران نظروں سے تیونس کے حکمران کو دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے چلنے لگا۔ اس بزم آرائی سے کہیں زیادہ قاصد کو اس خطرے کا احساس تھا جو طرابلس اور تیونس پر منڈلا رہا تھا لیکن وہ مجبور تھا۔

نیچے ہال میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ساز بے آواز تھے۔ تھرکتی ہوئی ٹانگیں شاید لرز کر ساکت ہو گئی تھیں۔ چہرے اُداس اُداس اور آنکھیں خالی خالی۔ ساغر و مینا یوں لڑھکے پڑے تھے جیسے وہاں کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔ شراب اور شباب لٹانے والی لڑکیاں کونوں میں دبی اور سہمی سہمی کھڑی تھیں۔

شاہ نے یہ منظر دیکھا تو غصہ سے جل اٹھا۔

''بزدلو!'' شاہ شیر کی طرح گرجا۔ ''یہ قبرستان نہیں محفل نشاط ہے۔ تم پر کونسا پہاڑ گرا ہے۔ کیا قیامت ٹوٹی۔ سانپ کیوں سونگھ گیا تمہیں۔ سرحد سے قاصد آیا تو تمہارے چہرے فق ہو گئے۔ تم چوکڑی بھول گئے۔ قاصد کوئی خبر نہیں لایا۔ سردار سرحد نے ہم سے درخواست کی ہے کہ ہم فوراً مصر پر حملہ کر دیں کیونکہ مسلمان اس وقت آپس میں لڑ رہے ہیں۔ مصر پر حملہ کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔

شاہ جرجیر کا یہ سفید جھوٹ سپہ سالار فلپ اور سرحد کے قاصد نے حیرت انگیز مسرت کے ساتھ برداشت کیا۔ جرجیر کی پرفریب باتوں کا حاضرین پر فوری اثر ہوا۔ ان کے چہروں پر رونق آ گئی۔ خوف و دہشت سے پیلے رخسار شفق رنگ ہو گئے۔

''ناچو۔ گاؤ۔ شراب کے جام لنڈھاؤ۔''

شاہ جرجیر نے حکم دیا۔

''اور۔ اور یہ کہ کل دو پہر ڈھلے ہم مصر کی طرف کوچ کریں گے۔ پچھلی جنگ میں ہم نے اپنے علاقے واپس لئے تھے۔ اب مصر پر ہمارا قبضہ ہو گا۔''

مردہ دلوں میں جیسے جان پڑ گئی۔ جرجیر نے ان کے پست حوصلوں کو سہارا دیا تھا۔ انھوں نے اس اعلان کی تائید میں خوب تالیاں بجائیں۔ اب پھر وہی دور ساغر تھا اور رقص مینا۔ ساز جھنجھنا اٹھے۔ آواز میں جوانی کا رس آ گیا۔ شہزادی نے دو قدم بڑھ کے ایک ہاتھ سے آرنلڈ اور دوسرے ہاتھ سے روپال کو پکڑا۔ پھر اس نے دونوں کے ساتھ بیک وقت رقص کرنا شروع کیا۔ شہزادی کا یہ انداز بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ حاضرین نے تالیاں پیٹ پیٹ کے ہال کو سر پر اٹھا لیا۔

رقص اب بھی ہو رہا تھا مگر اعضا تھکے تھکے سے لگتے تھے۔ ساز بج رہے تھے مگر آواز دبی دبی تھی۔ مسکراہٹیں لبوں پر تھرتھرا رہی تھیں اور قہقہوں میں خوف کی آمیزش محسوس ہوتی تھی۔ شمعوں کی جگمگاہٹ، جھلملاہٹ میں بدل گئی تھی۔ فانوس بار بار بھڑکتے جیسے دم توڑ رہے ہوں۔ وہی محفل تھی۔ وہی اہلِ محفل لیکن رنگِ محفل مختلف تھا۔ بھیگتی رات کی دھمک نامعلوم خوف کے سایوں کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔

اور پھر............پھر............یہ محفلِ نشاط۔ وقت سے پہلے ہی اجڑ گئی۔ صبح کی بیداری سے پہلے ہی بزمِ عشرت اجڑ گئی۔ جیسے خوابوں میں ڈوب گئی ہو۔

شاہ جرجیر اور سپہ سالار فلپ باقی رات چین سے نہ گزار سکے۔ ان کی آنکھیں بیدار تھیں' دل بیدار تھے لیکن زبانوں پر تالے پڑے تھے۔ وہ گم صم بیٹھے ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ دیکھتے ہی چلے جا رہے تھے اور پھر یونہی دیکھتے دیکھتے سویرا ہو گیا۔

شاہ کی آنکھوں میں خمار تھا۔ کچھ شراب کا کچھ بیداری کا۔ اس نے ہاتھوں کو جھٹک کر انگڑائی لی اور حکم دیا۔

''فلپ! دس ہزار کا لشکر قاصد کے ساتھ روانہ کر دو۔ ہم آج ہی کوچ کریں گے۔''

فلپ کھڑے ہو کر پہلے تعظیم بجالایا پھر بولا:

''حکم ہو تو چند راہبوں کو بھی ساتھ کر دیا جائے۔''

''ہاں فلپ۔ اب ہمیں دُعاؤں کی ضرورت ہے۔''

اور شاہ جرجیر نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

شاہ جرجیر کو صحیح اطلاع ملی تھی کہ مسلمانوں کے لشکر کی تعداد چالیس ہزار کے قریب ہے۔ یہ تعداد شاہ کے لشکر سے ایک تہائی تھی۔ پھر بھی شاہ جرجیر گھبرایا ہوا تھا۔ اسے اپنے دور اندیش سالار اور نوجوان آرنلڈ اور روپال پر بڑا ناز تھا۔ لیکن سب سے بڑا سہارا اور اعتماد اپنی حسین شہزادی بیٹی ''فلپائن'' پر تھا۔ اسے معلوم تھا کہ تیونس اور طرابلس کا ہر جوان' فلپائن کا عاشق ہے۔ وہ جوانوں کی اس دلچسپی سے بھی فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ فلپائن بہت بہادر لڑکی تھی۔ چار سال سے مسلسل وہ باپ کے ساتھ افریقی ریاستوں کی آپس کی لڑائیوں میں حصہ لے رہی تھی۔

فلپائن نے کسی مسلمان کو آج تک نہ دیکھا تھا لیکن اسے مسلمانوں سے شدید نفرت تھی۔ اس نفرت کی وجہ وہ جھوٹے قصے اور کہانیاں تھیں جو عیسائی راہبوں کے ذریعہ عوام و خواص تک پہنچتی تھیں۔ اس کے ذہن میں بٹھا دیا گیا تھا کہ ہر مسلمان جاہل' اجڈ اور وحشی ہوتا ہے۔ مال و زر لوٹنا اور عورتوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنا ان کا مشغلہ تھا۔ چنانچہ جب وہ لشکر کے ساتھ قیرواں سے نکلی تو اس نے قلعہ کے مشرقی دروازے پر کھڑے ہو کر قسم کھائی کہ وہ مسلمانوں کے خلاف لڑتے لڑتے جان دے دے گی لیکن قیرواں واپس نہ آئے گی۔

شاہ جرجیر نے اپنے سوار دستے ساحل کے ساتھ ساتھ روانہ کئے تا کہ ان کی رفتار تیز رہے۔ آدھا لشکر اونٹوں پر سوار ہو کے۔ ریگستان کا سینہ چیرتا آگے بڑھا۔ جرجیر، سوار دستوں کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھا سفر کر رہا تھا۔ اس نے شہزادی کو بھی گاڑی میں بٹھانے کی کوشش کی لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ روپال اور آرنلڈ کے درمیان گھوڑے پر سوار ہو کر چلتی رہی۔ راستے بھر روپال اور آرنلڈ اس پر نثار ہوتے رہے۔ فلپائن بھی اپنے حسن کی تپش سے دونوں کے دلوں میں شجاعت اور سرفروشی کی آگ بھڑکاتی رہی۔ وہ بہت زیادہ مہربان نظر آتی۔ اس نے دونوں عاشقوں کو اپنے شانوں پر ہاتھ رکھنے کی اجازت دے دی تھی۔ آرنلڈ اور روپال کو فلپائن کے کاندھے پر ہاتھ رکھنا ہی ان کے لئے جنت سے کم نہ تھا۔ چنانچہ جب وہ کسی منزل پر قیام کرتے تو وہ ان دونوں پر بہت زیادہ مہربان نظر آتی تھی۔ اس تکلیف دہ اور لمبے سفر میں فلپائن نے بڑے سرداروں کے علاوہ عام

سواروں پر بھی نوازش کی بارش کی۔ وہ سواروں میں گھل مل جاتی، مسکراتی۔ قہقہے لگاتی۔ اس طرح فوجیوں کو سفر کی تکلیف محسوس نہ ہوتی۔

شاہ جرجیر کا خیال تھا کہ وہ اسلامی لشکر کو اپنی سرحدوں پر روک لے گا۔ لیکن اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ جب وہ یعقوبیہ کے قریب پہنچا تو مخبروں نے اطلاع دی کہ مسلم سپہ سالار رُومی چوکیوں کو روندتا ہوا یعقوبیہ سے صرف ایک منزل دور رہ گیا ہے تو شاہ جرجیر کو بڑا قلق ہوا۔ اسے یعقوبیہ سے پہلے ہی پڑاؤ کرنا پڑا۔ اس کے شتر سوار دستے اب تک وہاں نہ پہنچے تھے دونوں لشکروں کو یعقوبیہ میں ملنا تھا۔

دوسرے دن شاہ کے ریگستانی دستے اس سے آملے۔ شاہ نے ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیا اور پورا لشکر یعقوبیہ کی طرف بڑھا۔ عبداللہ بن ابی سرح پہلے ہی یعقوبیہ پہنچ چکے تھے۔ ان کا لشکر یعقوبیہ کے جنوبی میدان میں خیمہ زن تھا۔ انھیں شاہ جرجیر کے آنے کی خبر مل چکی تھی اس لئے انھوں نے اس میدان کو فیصلہ کن جنگ کے لئے منتخب کر کے خیمے لگا دیئے تھے۔ شاہ جرجیر بھی سوا لاکھ فوج کے ساتھ اس میدان میں پہنچ گیا اور ساتھ ہی خیمے ڈیرے لگا دیئے۔

حسب دستور ابن ابی سرح نے شام کے وقت شاہ جرجیر کی خیمہ گاہ میں سفارت بھیجی۔ چار مسلمان سوار سفید جھنڈا لئے رومی لشکر میں پہنچے۔ شاہ جرجیر نے انھیں اپنے عظیم الشان خیمے میں شرف باریابی بخشا۔ اس خیمے کی شان وشوکت اگرچہ دیدنی تھی لیکن مسلم سرداروں نے اس کی ذرا پروانہ کی اور خاموشی سے فرش پر بیٹھ گئے۔ خیمے کا فرش بھی بہترین قالینوں کا تھا۔

شاہ جرجیر اپنی مخصوص چاندی کی چوکی پر بیٹھا تھا۔ یہ چوکی سامان کے ساتھ لائی گئی تھی اس کے برابر دائیں جانب ایک اور چھوٹی چوکی پر شہزادی فلپائن بڑی شان سے براجمان تھی۔ دائیں طرف سپہ سالار فلپ اور آرنلڈ اور روپال ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔

شاہ جرجیر نے بڑے رعب دار آواز میں پوچھا۔

''اے امن کے سفیرو!...... بیان کرو۔ تم اپنے مسلم سردار کی طرف سے شاہ تیونس اور طرابلس کے لئے کیا پیغام لائے ہو؟......''

شاہ کی آواز میں اس وقت بڑی شاہانہ تمکنت تھی۔

ایک مسلم سردار نے کہا۔

''اے معزز شاہ جرجیر!...... ہم اپنے سپہ سالار عبداللہ بن ابی سرح کی طرف سے آپ کو امن وصلح کا پیغام دیتے ہیں۔ رومیوں اور مسلمانوں کے درمیان یہ پہلا معرکہ نہیں۔ شام سے مصر تک ہم ایک دوسرے کے مقابل ہوتے چلے آئے ہیں۔ آپ بھی یہ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے آگے بڑھتے ہوئے قدم پیچھے نہیں ہٹا کرتے؟

مسلم سردار اتنا کہہ کر خاموش ہوگیا۔ بات کچھ نامکمل سی تھی۔ شاہ نے چند لمحے انتظار کیا جب مسلم نے کچھ نہ کہا تو وہ بولا:

''تمہاری باتیں الجھی ہوئی ہیں۔ صاف کہو تم کن شرائط پر صلح کرنا چاہتے ہو......؟

دوسرے مسلم سردار نے فوراً کہا:

''اے شاہ! میرے ساتھی کی بات بالکل مکمل تھی یہ اور بات ہے کہ آپ اس کا مطلب نہ سمجھ سکے۔ ہمارے سپہ سالار کی پیش کش ہے کہ

مسلم لشکر طرابلس اور تیونس کے جتنے علاقہ پر قبضہ کر چکا ہے اور جہاں پر وہ اس وقت خیمہ زن ہے اس تمام علاقے پر سلطنت مصر کی حاکمیت تسلیم کر لی جائے۔ یہی صلح کی شرط ہے اور یہی ان کا پیغام ہے۔''

شاہ جرجیر سر جھکا کر سوچنے لگا۔ سپہ سالار کا چہرہ سپاٹ تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس محفل میں موجود ہی نہیں ہے۔ آرنلڈ اور روپال قہر آلود نظروں سے مسلمان سفیروں کو دیکھ رہے تھے۔ شہزادی فلپائن کو بھی غصہ آیا لیکن وہ فوجی حکمت عملی سے ناواقف تھی اس لئے اس نے خاموشی ہی میں بہتری سمجھی۔

دوسری طرف مسلمان سفیر بڑی بے پروائی سے اس پر شکوہ خیمے کے ساز وسامان کو دیکھ رہے تھے۔ اب شاہ نے فلپ کو بھی اپنی سوچوں میں شریک کر لیا پھر سر اٹھا کر شاہانہ انداز میں بولا۔

''اے امن کے قاصدو! صلح کے ہم بھی خواہش مند ہیں لیکن تمہارا صلح کا پیغام مشروط ہے۔ ہم تمہیں اس وقت بھی اتنا ہی سخت جواب دے سکتے ہیں جتنی سخت تمہاری شرط ہے لیکن ہم عجلت سے کام نہیں لینا چاہتے۔ تمہیں کل جواب دیا جائے گا۔ تمہیں آنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے نمائندے خود گفتگو کے لئے تمہاری لشکر گاہ میں جائیں گے اور ان کا جواب ہمارا جواب تصور کیا جائے۔''

شاہ جرجیر نے مسلم نمائندوں کو انعام واکرام سے نوازنے کی کوشش کی مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا اور بغیر کچھ قبول کئے واپس ہو گئے۔

وہ رات دونوں لشکروں پر بہت بھاری گزری۔ دونوں طرف تمام رات صلاح ومشورے کا بازار گرم رہا۔ عبداللہ بن ابی سرح کا پہلے خیال تھا کہ ٹیونس پر لشکر کشی کے لئے چالیس ہزار کا لشکر کافی ہوگا لیکن یہاں پہنچ کے انھیں محسوس ہوا کہ سوا لاکھ کے مقابلہ میں ان کا لشکر نا کافی ہے۔ انھوں نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ اس وقت پیچھے ہٹنا شکست کے مترادف تھا۔ ایک رائے یہ بھی تھی کہ اگر رومی یعقوبیہ کو سرحد تسلیم کر لیں تو جنگ ملتوی رکھی جائے۔

ادھر رومی لشکر میں بھی یہی مشورے تھے۔ ان کی محفل مشاورت بہت محدود تھی۔ وہاں بھی اسلامی لشکر کی طرح دو رائیں تھیں۔ رومی جنگ نہیں چاہتے تھے۔ مگر انھیں شکست بھی منظور نہ تھی۔ آخر شاہ جرجیر نے اس بحث کو ختم کیا اس نے کہا۔

اگر مسلمان یعقوبیہ کا علاقہ خالی کر دیں اور طرابلس کے صرف اس رقبہ پر قبضہ برقرار رکھیں جو ہم نے ان سے واپس لئے ہیں۔ اگر مسلمان اس بات پر آمادہ ہوں تو یہ ہمارے حق میں ہوگا ورنہ پھر جنگ۔ جنگ ہی سے فیصلہ ہوگا۔ تمام رات بھر صلاح ومشورے ہوئے پھر جب صبح ہوئی تو چار سوار رومی لشکر سے نکلے۔ آگے آگے شہزادی فلپائن اپنی تمام رعنائیوں اور حشر سامانیوں کے ساتھ سفید پرچم بلند کئے چل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آج نقاب نہیں تھا۔ شہزادی کے پیچھے سپہ سالار فلپ۔ فلپ کے دائیں بائیں آرنلڈ اور روپال۔

مسلمان اس سفارت کے منتظر ہی تھے۔ انھیں رات ہی تیاری کا حکم مل چکا تھا۔ صلح یا جنگ۔ وہ دونوں صورتوں سے نمٹنے کے لئے تیار تھے۔

لشکر اسلام کے ایک خیمے کے سامنے کچھ لوگ زمین پر بیٹھے گفتگو کر رہے تھے۔ ان کی نظریں رومی سواروں پر تھیں۔ سفارت میں ایک جوان عورت کو دیکھ کر مسلمانوں میں قدرے حیرت کے آثار دکھائی دئے۔ سوار قریب آ گئے۔ مسلمان خاموشی سے انھیں دیکھتے رہے۔

شہزادی فلپائن نے بیٹھے ہوئے مسلمان جوانوں سے پوچھا کہ ان کے سردار کون ہیں اور کدھر ہیں؟

بیٹھے ہوئے آدمیوں میں تیس سال کا ایک مضبوط جسم والا جوان بھی تھا۔ اس نے بے پروائی سے کہا۔

''خاتون! یہاں تو سب ہی سردار ہیں۔ تم کس سے ملنا چاہتی ہو۔''

''بحث کی ضرورت نہیں۔ ہمیں اپنے سالار کے خیمے میں پہنچادو۔'' فلپائن نے قدرے غصہ سے کہا۔

''ادب سے گفتگو کرو۔''

اب پہلے جوان کے بجائے ایک دوسرا آدمی قدرے تیز لہجے میں بولا:

میں شاہ جرجیر کی بیٹی شہزادی فلپائن ہوں'' شہزادی نے بھی اسی تندہی سے جواب دیا۔

''شہزادی! گھوڑے سے اتر کے بات کرو۔ ہمارے سپہ سالار عبداللہ بن ابی سرح کا یہی خیمہ ہے اور وہ تمہارے سامنے موجود ہیں۔''

''ابن ابی سرح؟'' شہزادی نے حیرانگی کے عالم میں دہرایا۔ پھر حیران حیران نظروں سے اس جوان کو دیکھنے لگی جسے ایک معمولی آدمی سمجھ کے وہ غصہ دکھارہی تھی۔

ابن ابی سرح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اب انھوں نے نظریں نیچی کر لی تھیں۔

دوسری طرف شہزادی فلپائن جلدی سے گھوڑے سے اتری اور کمال ادب سے بولی۔

''میں سپہ سالار کی خدمت میں سلام پیش کرتی ہوں۔''

ابن ابی سرح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سر جھکائے ہوئے جواب دیا۔

''خاتون! سلام اللہ تعالیٰ کا ہوتا ہے۔ اس لئے میں قبول کرتا ہوں لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں ایک خاتون سے سفارتی گفتگو نہیں کر سکتا۔''

فلپائن کو غصہ آ گیا۔ چڑ کے بولی:

سپہ سالار محترم! ممکن ہے کہ مسلمان اپنی عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں قید رکھتے ہوں لیکن میں رومن ہوں، عیسائی ہوں، میری قوم کی بیٹیاں میدانِ جنگ میں تلوار چلاتی ہیں۔ رومن عورتیں گونگی نہیں وہ محفل میں بولنا جانتی ہیں۔''

''قابلِ احترام شہزادی'' ابن ابی سرح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے متانت سے کہا۔

''ہمارے خلیفہ معظم نے ہمیں شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ احترام کے ساتھ گفتگو کرنے کا حکم دیا ہے۔ آپ سے بحث مفقود نہیں لیکن میں یہ کہوں گا کہ آپ کی معلومات ناکافی ہیں۔ مسلمان خواتین بھی کاندھے پر ترکش ڈال کر تلوار گھماتی میدان میں نکلتی ہیں لیکن وہ نامحرموں سے گفتگو نہیں کرتیں اور اگر انہیں گفتگو پر مجبور ہونا پڑے تو وہ تیر و تلوار کی زبان سے گفتگو کرتی ہیں۔''

شہزادی فلپائن پر ابن ابی سرح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایسا رعب پڑا وہ ساری تیزی بھول گئی اور چپ چاپ مسلم سپہ سالار کے سامنے ادب سے بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھی بھی کچھ کسمسا کر زمین پر بیٹھ گئے۔

''شاہ جرجیر کے جواب سے مطلع کیا جائے۔'' اب ابن ابی سرح کا لہجہ خالص سپاہیانہ تھا۔

آرنلڈ اور روپال دونوں ہی جواب دینا چاہتے تھے لیکن شہزادی نے انھیں اشارے سے منع کر دیا۔ پھر شہزادی نے آہستہ سے فلپ کے کان میں کچھ کہا۔

سپہ سالار فلپ سنبھل کے بولا۔

''اے لشکرِ اسلام کے سپہ سالار! شاہ تیونس اور طرابلس کی یہ خواہش ہے کہ خون ریزی سے اجتناب کیا جائے۔''

''ہماری بھی یہی خواہش ہے۔'' ابن ابی سرح نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

فلپ الفاظ تولتے ہوئے بولا۔

شاہ جرجیر، مسلم سپہ سالار کی اس خواہش کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں انھوں نے پیش کش کی ہے اگر اسلامی لشکر یعقوبیہ سے ہٹ جائے تو اس کے صلہ میں وہ طرابلس کے ان علاقوں پر مصر کی حاکمیت تسلیم کر لیں گے جو پچھلی لڑائیوں میں رومیوں نے واپس لئے تھے۔''

ابن ابی سرحؓ چند لمحے ٹھہر کے بولے۔

ہم جرجیر کی خواہش کا احترام کرتے ہیں اور سفارت کو یقین دلاتے ہیں کہ مسلمان لشکر یعقوبیہ کے قلعہ پر قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کرے گا لیکن اس سے پہلے طرابلس کے ان تمام علاقوں کی نشاندہی کی جائے جن سے شاہ جرجیر دست بردار ہونے پر آمادہ ہیں۔''

ابن ابی سرح کا جواب فلپ کے خیال میں معقول اور حوصلہ افزا تھا۔ وہ ابھی ذہن پر زور دے کر مقبوضہ علاقوں کے نام یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں آرنلڈ کی مہیب آواز گونجی۔

آرنلڈ کہہ رہا تھا۔

''یعقوبیہ کے قلعہ پر تو ہمارا قبضہ ہے۔ مسلمانوں کو یعقوبیہ کا پورا علاقہ خالی کرنا پڑے گا۔''

آرنلڈ کی اس بے جا مداخلت پر ابن ابی سرح کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا انھوں نے لحاظ سے جھکے ہوئے سر کو اٹھایا۔ آرنلڈ کو گھورا اور کڑک کے کہا۔

''نادان نوجوان! تم اس لشکر کے سپہ سالار کو حکم دے رہے ہو جو کہ آسمانوں پر خدائے واحد کا اور زمین پر صرف خلیفہ وقت کا حکم مانتا ہے۔ کان کھول کے سن لو۔ میں عبداللہ بن ابی سرح جسے اس لشکر کا سپہ سالار مقرر کیا گیا ہے وہ امن اور صلح کی پیش کش واپس لیتا ہے۔ اب فیصلہ میدان جنگ میں ہوگا۔ اور جو ہوگا انشاء اللہ بہتر ہی ہوگا۔

ابن ابی سرح اٹھ کے کھڑے ہو گئے۔ فلپ پر سکتہ ساطاری ہو گیا۔ اسے سفارت کی کامیابی کی پوری امید تھی لیکن آرنلڈ کی مداخلت نے اس کے کئے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ شہزادی کو بھی آرنلڈ پر بڑا غصہ آیا۔ وہ دانت پیس کر رہ گئی۔ ابن ابی سرح کی گفتگو کا انداز جس قدر معقول تھا آرنلڈ نے اتنی ہی نامعقولیت کا مظاہرہ کیا تھا۔

ابن ابی سرح اپنے خیمے میں چلے گئے۔ سفارت ناکام ہوگئی۔ شہزادی کو اس کا ملال تھا۔ اس کے تصور میں مسلمانوں کے ہیولے گھومتے رہتے تھے لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ ابن ابی سرح اور ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے مسلمانوں کے چہروں پر نہ وحشت تھی اور نہ دہشت۔ ابن ابی سرح کا نرم اور سادہ انداز گفتگو تو اسے بہت ہی پسند آیا۔ ابن ابی سرح یوں بھی بہت وجیہہ جوان تھے۔

شہزادی فلپائن اپنے لشکر میں ابھی پہنچی نہ تھی کہ لشکر اسلام میں طبلِ جنگ بج گیا۔ دشت وصحرا گونج اٹھے۔ مسلمان فوجیں میدان میں نکل آئیں۔ سوار دستے آگے تھے۔ دائیں بائیں تیر اندازوں نے جگہ سنبھالی۔ پیچھے پیادوں کی صفیں جمنے لگیں۔

شاہ جرجیر کے کانوں میں طبلِ جنگ کی آواز پڑی تو وہ گھبرا گیا۔ ظاہر تھا کہ سفارت ناکام ہوگئی ہے۔ اس نے بھی لشکر کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ سفارت واپس آگئی تھی۔ اب نہ گفتگو کا موقع تھا اور نہ وقت۔ سپہ سالار کہتا بھی تو کیا کہتا۔ بنتی بات کو خود آرنلڈ نے بگاڑا تھا۔ شاہ کا اشارہ پا کر وہ بھی لشکر کی ترتیب میں لگ گیا۔

اوائل اسلام میں مسلمان عرب کے قدیم طریقے پر جنگ کرتے تھے۔ ہر قبیلے کا اپنا سردار ہوتا وہ قبیلے کو لڑاتا تھا۔ پہلے دعوت مبارزت دی جاتی۔ ایک کا ایک سے مقابلہ ہوتا۔ اس انفرادی جنگ کے بعد گروہی لڑائی شروع ہوتی۔ پھر جب عربوں نے عجم میں قدم رکھا تو میدان جنگ میں وہی نقشہ جمایا جو ایرانیوں اور رومیوں میں تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں مزید ترتیب پیدا ہوئی۔ طلیعہ، میمنہ، میسر، قلب اور ساقہ قائم کئے گئے۔ یہ ایرانی اور رومی طریقہ جنگ تھا۔ مسلمان نے وقت اور ضرورت کے مطابق اس میں تبدیلی کی۔

ان تمام باتوں کے باوجود مسلمانوں نے سپہ سالار اور لشکر کی ذمہ داریوں میں کوئی کمی نہ کی' ایرانی اور رومی سپہ سالار خود جنگ سے الگ رہ کر فوجوں کو لڑاتے تھے لیکن مسلم سپہ سالار ایک معمولی سپاہی کی طرح جنگ کرتا وہ فوج کے آگے آگے ہوتا۔ جنگ کا تمام دارومدار اسی پر ہوتا تھا۔ وہ جتنی شجاعت کا مظاہرہ کرتا اتنی ہی شدت سے فوج جنگ کرتی۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کی فتوحات کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہمیشہ لشکر میں آگے رہتے اور دشمن کی صفوں میں بے خوف وخطر گھس جاتے تھے۔

جنگ شروع ہوگئی۔ یہ بڑی خوفناک اور مہیب جنگ تھی۔ صبح سے دوپہر پھر شام ہوگئی لیکن فیصلہ نہ ہوا۔ دونوں لشکر میدان میں جمے رہے۔ کسی کے قدم پیچھے نہ ہٹے۔ اندھیرا ہوگیا۔ دوست دشمن کی تمیز نہ رہی تو واپسی کا بگل بجا۔ فوجیں اپنے اپنے لشکر کو واپس ہوئیں۔ مسلمان اپنے شہیدوں کی لاشیں اٹھا لائے اور انہیں دفن کیا۔ عبداللہ بن ابی سرح نے سرداروں کو جمع کر کے آج کی جنگ کے بارے میں صلاح ومشورہ کیا اور اگلے دن کے لئے نئی حکمت عملی تیار کی۔

رومی لشکر بھی بلاشبہ بہادری سے لڑا تھا لیکن پہلے ہی دن کی جنگ نے جرجیر کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ مسلمانوں کو شکست دینا ناممکن ہے اور جب سپہ سالار فلپ نے اسے آرنلڈ کی سخت گفتگو سے مطلع کیا تو اسے اس کا سخت افسوس ہوا لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اسے آرنلڈ کی دلداری منظور تھی۔ رومی لشکر میں اس سے طاقتور اور کوئی جوان نہ تھا۔ آج بھی اس نے بڑی شجاعت کا مظاہرہ کیا تھا۔

شاہ نے آرنلڈ اور روپال کی بہت تعریف کی۔ شہزادی فلپائن ہر صورت میں جنگ جیتنے کی خواہش مند تھی۔ وہ فتح حاصل کرنے کے لئے تن'

من اور دھن سب کچھ قربان کرنے پر آمادہ تھی۔ اس نے آرنلڈ اور روپال کو خود بھی دادِ شجاعت دیتے دیکھا تھا۔ اس نے اپنے ان دونوں پرستاروں کی حوصلہ افزائی کے لئے کسی بخل سے کام نہ لیا۔ وہ رات دیر تک ان کے درمیان رہی اور اپنے ہاتھ سے جام بھر بھر کے پلاتی رہی۔

شب خون کے خطرے کے تحت رومی لشکر رات بھر جاگتے رہے لیکن اس شب بیداری کی صورت مختلف تھی۔ رومی رات بھر جام لنڈھاتے اور قدحے خالی کرتے رہے۔ دوسری طرف مسلمان، توبہ، استغفار اور درود و وظائف میں مصروف رہے۔ مسلمانوں کے جنگی دستور میں یہ شق شامل تھی۔ مسلمان جب بھی اس راستے سے ہٹے، مغلوب و شرمندہ ہوئے۔

دوسرے دن اور شدید جنگ ہوئی لیکن بے نتیجہ۔ شہید ہونے والوں اور مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ ایک ہفتہ کی جنگ کے بعد دونوں لشکروں میں مایوسی پھیل گئی۔ دونوں ہی اپنی فتح سے ناامید ہو گئے لیکن شکست تسلیم کرنے کے لئے کوئی بھی آمادہ نہ تھا۔ جنگ جاری رہی لیکن یوں معلوم ہوتا تھا جیسے لشکر بے دلی سے لڑ رہے ہیں۔ جارحانہ انداز ختم ہو گیا تھا اور اب مدافعتی جنگ شروع ہوئی۔ کوئی بھی آگے بڑھ کے حملہ نہ کرتا۔ سوار اپنی جگہ جم کر لڑ رہے تھے۔

اب جنگ کے دوسرے ذرائع اور طریقوں پر غور ہونے لگا۔ مقتولین کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی اس لیے کمک کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شاہ جرجیر نے بلاد مغرب کی تمام ریاستوں کی طرف قاصد دوڑائے۔ عبداللہ بن ابی سرح کو بھی کمک کے لئے دربار خلافت سے درخواست کرنا پڑی۔ جنگ کو کسی نہ کسی صورت جاری رکھا گیا۔

ایک رات شاہ جرجیر بہت افسردہ تھا۔ شہزادی فلپائن سامنے بیٹھی باپ کی افسردگی کو دیکھ کر خود بھی افسردہ ہو رہی تھی۔ پھر فلپائن اٹھی۔ باپ کے پاس پہنچی اور اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ جرجیر نے ایک سرد آہ بھر کر بیٹی کو گلے لگا لیا۔

فلپائن بھرائی آواز میں بولی۔

''شاہ بابا! ہم کب تک یہ بے مقصد جنگ لڑتے رہیں گے اور کب تک رومیوں کا خون بہتا رہے گا؟''

''ہم بھی یہی سوچ رہے ہیں فلپائن۔'' شاہ جرجیر غمگین لہجے میں بولا۔ ''ہمیں آرنلڈ اور روپال سے بہت امیدیں تھیں لیکن وہ مسلمانوں کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ یہ ہمارے لشکر ہی کا حوصلہ ہے جو ان وحشیوں کے سامنے اب تک جما ہوا ہے۔''

''پاپا! فتح کی کیا کوئی صورت نہیں۔'' فلپائن نے جیسے خواب میں پوچھا۔

'فتح'' شاہ جرجیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''شکست سے بچ جائیں تو یہی ہماری فتح ہوگی۔''

فلپائن کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

''شکست کی آواز میں نہیں سن سکتی پاپا!...... میں جان دے دوں گی قیرواں واپس نہ جاؤں گی۔''

بیٹی کا یہ حال دیکھ کر شاہ کا کلیجہ پھٹنے لگا۔ بیٹی ہی تو اس کی پونجی تھی۔ وہ تسلی دیتے ہوئے بولا۔

''گھبراؤ نہیں بیٹی۔ بلاد مغرب سے کمک آتے ہی ہم ایک زبردست حملہ کریں گے۔''

''مسلمانوں کو بھی کمک مل سکتی ہے پاپا۔'' فلپائن نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔ ''دمشق کچھ زیادہ دور نہیں۔ مسلمان مدینہ سے بھی کمک حاصل کر سکتے ہیں۔''

شاہ جرجیر چونک پڑا۔ اس نے حیران نظروں سے بیٹی کو دیکھا۔

''عقل مند فلپائن! تم نے ہمیں خواب سے بیدار کر دیا ہے۔ یہ خیال تو ہمارے دور اندیش سپہ سالار کے دماغ میں بھی نہ آسکا تھا۔ ہم بلاد مغرب سے کمک منگا رہے ہیں تو مسلمان بھی ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے ہوں گے ممکن ہی نہیں بلکہ یقیناً انہوں نے بھی مزید لشکر کے حصول کی کوشش کی ہوگی؟''

شاہ جرجیر پر گھبراہٹ طاری ہوگئی۔ وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

''شاہ بابا......'' فلپائن بے چینی سے بولی۔ ''سوچنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا پاپا۔ کچھ کیجئے۔ کوئی قدم اٹھائیے۔ مسلمانوں کو ہم سے پہلے کمک مل گئی تو کیا ہوگا؟''

''نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔'' جرجیر اٹھ کر خیمے میں ٹہلنے لگا۔ ''انھیں کمک نہیں ملنا چاہیئے۔ کمک آنے سے پہلے ہمیں کچھ کرنا ہوگا۔ ہمیں جان کی بازی لگانا ہوگی۔''

شاہ جرجیر پاگلوں کی طرح بڑبڑا رہا تھا۔ فلپائن دوڑ کے اس سے لپٹ گئی۔

پھر جیسے وہ خوابوں میں بولی۔

''شاہ پاپا! کل میں اپنی زندگی کا سب سے بڑا کھیل کھیلوں گی۔ میں مسلمان بھیڑیوں میں گھس جاؤں گی اور..................اور ان کے سردار عبداللہ بن ابی سرح کو قتل کر دوں گی۔ میں نے اسے مار دیا تو فتح میری ہوگی۔ رومیوں کی ہوگی۔ شاہ جرجیر کامیاب ہوں گے۔''

فلپائن پر ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ شاہ جرجیر اس کے سر پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیر رہا تھا۔ اس کے کان فلپائن کی باتوں پر تھے لیکن ذہن کسی اور خیال میں غلطاں تھا۔ پھر فلپائن جیسے بولتے بولتے تھک گئی۔

شاہ جرجیر اسے الگ کرتے ہوئے بولا۔

''فلپائن تم بیٹی نہیں بیٹا ہو۔ تم میری صحیح جانشین ہو۔ ابن ابی سرح مارا جائے گا۔ ضرور مارا جائے گا۔ ہمیں فتح ہوگی۔ اس کا سر کوئی اور اتارے گا لیکن فتح کا سہرا تمہارے سر ہوگا۔''

شاہ جرجیر کے لہجے میں بڑا استقلال تھا۔ افسردگی کے بجائے اب اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ چمک پیدا ہوگئی تھی۔

فلپائن نے پوچھا۔

''شاہ پاپا! یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟''

''تمہیں قربانی دینا ہوگی۔''

''میری جان حاضر ہے پاپا!......''

''ہم تمہارے بارے میں ایک اہم اعلان کرنے والے ہیں۔'' شاہ جرجیر نے فلپائن پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''شاہ پاپا! آپ یوں بھی میری جان کے مالک ہیں۔'' فلپائن مستقل مزاجی سے بولی۔ ''پھر بھی آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ ہر اس قدم اور اعلان کی تائید کروں گی جس کا مقصد رومیوں کی فتح ہو۔''

''میری بیٹی!'' اور شاہ جرجیر نے ہاتھ پکڑ کر محبت سے فلپائن کو لپٹا لیا۔

شاہ جرجیر نے اس وقت سپہ سالار فلپ کو طلب کیا۔ بوڑھا فلپ گھبرایا ہوا خیمے میں داخل ہوا۔ شاہ کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر اس کی پریشانی دور ہوگئی۔

شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''فلپ! جنگ میں کونسی چیز ناجائز ہے؟''

''کوئی چیز نہیں شاہ معظم'' فلپ نے متانت سے کہا۔

''جنگ دو پہلوانوں کا مقابلہ ہے۔ اس مقابلے میں اصول وقواعد نہیں چلتے۔ داؤ پیچ چلتے ہیں۔''

شب خون کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔

''جائز ہے شاہ معظم!''

''قتل وغارت''

''جائز ہے۔'' پھر فلپ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''دشمن، دشمن ہی ہوتا ہے خواہ وہ بچہ، بوڑھا یا عورت ہی کیوں نہ ہو۔ سب کا قتل جائز ہے۔''

خیال رہے کہ یہ طریقہ رومی اور ایرانی استعمال کرتے ہیں۔ مسلمانوں نے اسے کبھی جائز نہ رکھا۔ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں پر مسلمان ہاتھ نہ اٹھاتے تھے۔

''ہم اپنی پیاری بیٹی کو جنگ پر قربان کرنا چاہتے ہیں۔'' شاہ جرجیر نے بوڑھے فلپ کو ششدر کر دیا۔ وہ حیرت سے شاہ جرجیر کا منہ تکنے لگا۔ اسے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

شاہ جرجیر گرجا:

''فلپ بولو! جواب دو!! کیا یہ قربانی جائز نہیں۔''

فلپ کانپ اٹھا۔ لڑکھڑاتے لہجے میں بولا۔

''شاہ معظم! شہزادی عالیہ پر مجھ جیسی ہزاروں جانیں قربان۔ ایسا وقت لشکر پر کبھی نہ آئے گا۔''

''جواب دو فلپ!'' بادشاہ جرجیر غصے سے تھرا رہا تھا۔

''ہم باپ ہو کر بیٹی کی قربانی دے رہے ہیں۔ تمہیں کیا اعتراض ہے۔ بچوں کا قتل جائز ہے۔ عورتوں پر تلوار اٹھانا جائز ہے پھر شہزادی کی قربانی کیوں جائز نہیں۔''

فلپ اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

''اگر یہ قربانی ہمیں فتح سے ہمکنار کر سکتی ہو تو یقیناً جائز ہے۔''

''شاباش فلپ!'' شاہ نے اس کی تعریف کی۔ ''تم ہماری طرح بہادر ہو جاؤ اور ابھی لشکر میں اعلان کر دو کہ جو شخص مسلم سپہ سالار عبداللہ بن ابی سرح کا سر اتارے گا اسے ایک لاکھ دینار انعام ملے گا اور .... اور اسے شہزادی فلپائن سے شادی کرنے کا حق ہوگا۔''

''شاباش پاپا!'' فلپائن حسرت آمیز لہجے میں بولی۔ میں یہ قربانی دوں گی۔ میں اس بہادر کو خوشی سے گلے لگاؤں گی جو ابن ابی سرح کا سر اتارے گا۔ آپ اعلان کروا دیجئے۔ ابھی اعلان کرائیے۔''

اعلان ہو گیا۔ ایک لاکھ دینار اور شہزادی سے شادی۔

شہزادی سے شادی کا مطلب ٹیونس کی امارت اور گورنری۔

تمام رات رومی لشکر میں یہی تذکرہ رہا۔ وہ کون خوش قسمت ہوگا۔ یہ صدائے عام تھی' کوئی بھی یہ انعام حاصل کر سکتا تھا۔ ہر دل میں امنگ پیدا ہوئی۔ دلوں میں ابال آ گیا۔ شوق کا تازیانہ لگا۔ شہزادی کی سیمیں کلائیاں۔ گلنار رخسار۔ مخمور آنکھیں اور شاداب جوانی کے ہیولے لوگوں کے تصور میں رقص کرنے لگے۔ خیالوں پر چھا گئے۔ انہوں نے خیالوں میں خود کو شہزادی کے قریب تر دیکھا۔ اس کی (بانہیں) گلے میں حمائل نظر آئیں۔

صبح کو جنگ کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ ہر رومی جوان بھوکی نظروں سے ابن ابی سرح کو دیکھ رہا تھا۔ ابن ابی سرح حسب معمول قلب لشکر میں سب سے آگے کھڑے تھے۔

جنگ شروع ہوتے ہی جوانوں کا ایک بڑا ریلا ابن ابی سرحؓ کی طرف بڑھا۔ یہ جوان صفیں چھوڑ کر آگے نکل آئے تھے۔ سب سے آگے آرنلڈ اور روپال تھے۔ کئی تلواریں ایک ساتھ مسلم سالار کی طرف لپکیں۔ ابن ابی سرح نے گھوڑے کو پیچھے کھینچ کر بچا لیا۔ لیکن وہ گھبرا گئے۔ مسلمانوں نے سالار فوج کو خطرے میں دیکھا تو وہ گھوڑے بڑھا کر پاس پہنچ گئے۔

ایسی شدید جنگ ہوئی الامان والحفیظ۔ زمین و آسمان کانپ کانپ اٹھے۔ مسلمانوں کو جلدی اندازہ ہو گیا کہ رومی مسلم سپہ سالار کو قتل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ بھلا مسلمان یہ کیسے برداشت کر سکتے تھے۔ پس مسلم جوانوں نے عبداللہ بن ابی سرح کو اپنے حلقے میں لے لیا۔ رومیوں کا حملہ جتنا شدید ہوتا گیا۔ مسلمان جوانوں کا حلقہ بھی سنگ و آہن بنتا گیا۔ رات کو جب جنگ رکی تو معلوم ہوا کہ مسلمان لشکر کے چار بڑے بڑے سردار' ابن ابی سرح پر قربان ہو گئے۔ اس کے علاوہ کئی درجن عام سوار بھی اپنے سپہ سالار کو بچاتے بچاتے شہید ہو گئے۔ رومی مقتولین کی تعداد چار گنا تھی لیکن وہ

آخری وقت تک حملہ کرتے رہے۔

رات کو تمام مسلم سردار۔ ابن ابی سرحؓ کے خیمے میں جمع ہوئے آج کی جنگ پر غور کر رہے تھے۔ اس غور وفکر کے دوران جاسوسوں نے اطلاع دی کہ رومیوں میں ابن ابی سرح کے سر کی قیمت لگائی گئی ہے۔ ایک لاکھ دینار اور شہزادی فلپائن سے شادی۔ ہر رومی جوان کے سر پر فلپائن کے عشق کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ یہ صورت حال بڑی سنگین تھی اور اتنی ہی سنگینی سے غور وفکر کی دعوت دیتی تھی۔

''سپہ سالار کے گرد پانچ سو سواروں کا حلقہ بنا دیا جائے۔'' ایک سردار نے رائے دی۔

''نہیں۔ ایک ہزار سواروں سے سپہ سالار کی حفاظت کی جائے۔'' یہ دوسرا مشورہ تھا۔

''سپہ سالار کو دوسری صف میں رکھا جائے۔'' تیسرے سردار نے کہا۔

چوتھے سردار کا مشورہ بڑا عجیب تھا۔ اس نے کہا کہ سپہ سالار کو جنگ سے دور رکھا جائے اور ان سے خیمے میں ٹھہرنے کی درخواست کی جائے۔

''نہیں......'' ابن ابی سرح چیخ پڑے۔ ''میں اگلی صف میں ہی رہوں گا۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو۔''

سب کی زبانیں بند ہو گئیں۔ امیر لشکر کی بات کون رد کر سکتا تھا۔

صبح ہوئی۔ جنگ کا نقارہ بجا۔ رومیوں کے حملہ کا رخ آج بھی ابن ابی سرحؓ کی طرف تھا۔ رومی گروہ در گروہ ابن ابی سرح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف بڑھتے۔ مسلمان انھیں گاجر مولی کی طرح کاٹ دیتے لیکن حملہ کا زور نہ ٹوٹتا تھا۔ صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ جنگ کا مرکز ابن ابی سرح تھے۔ ہر طرف سے ان پر حملے ہونے لگے۔ مسلمان سینہ سپر تھے۔ جنگ جیسے سمٹ کر ایک جگہ آ گئی تھی۔ مسلمان سینہ سپر تھے لیکن رومی بھوکے شیروں کی طرح ابن ابی سرح پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ مسلمان شدید دباؤ کا شکار تھے۔ جنگ کرنے کے بجائے ان کی پوری طاقت ابن ابی سرحؓ کو بچانے میں لگی ہوئی تھی۔

جرجیر کا خیمہ ایک اونچی جگہ نصب تھا۔ وہ خیمے کے سامنے کھڑا جنگ کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا کاش یہ ترکیب پہلے ہی اس کے ذہن میں آ جاتی۔ رومی جب فلپائن کا نعرہ لگا کر ابن ابی سرح کی طرف بڑھتے تو جرجیر مسکرانے لگتا۔ فلپائن بھی بڑی دلچسپی سے یہ خوفناک جنگ دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی متعجب تھی۔ رومیوں نے اتنے سخت حملے پہلے تو کبھی نہ کیے تھے۔ شاید یہ اس کے حسن و رعنائی کا کرشمہ تھا جو جوانوں کی رگوں میں شجاعت بھر رہا ہے۔ شہزادی دل و جان سے خوش ہوئی اور مسکرا کر باپ کو دیکھتی۔ جرجیر خوش ہو کر کہتا۔

''دیکھا فلپائن! یہ رومی لشکر نہیں تم لڑ رہی ہو۔ تمہاری تنہا طاقت اس پورے لشکر کے برابر ہے۔''

''ہاں۔ شاہ پاپا!'' شہزادی کہتی۔ ''اب فتح ہماری ہے۔''

وہ دن بھی ٹل گیا۔ کچھ اور نامور سردار ابن ابی سرحؓ کی حفاظت کرتے کرتے موت کی آغوش چلے گئے۔

شاہ جرجیر اور سپہ سالار فلپ جنگ کی اس سست روی اور رومیوں کے ارادے متزلزل ہوتے دیکھ کر بہت پریشان تھے ان دونوں نے ایک رات کافی دیر کے صلاح و مشورہ کے بعد یہ منصوبہ بنایا کہ ایک خوبصورت اور ہوشیار لڑکی اور کسی بہادر رومی کو چپکے سے اسلامی لشکر میں اس حال میں بھیجا جائے کہ وہ اپنے آپ کو مظلوم ظاہر کریں اور پھر مسلمانوں کے سپہ سالار ابن سرح کی کسی طرح خوشنودی حاصل کریں اور موقع پاتے ہی ایک دو

روز کے اندر اندر انہیں قتل کر دیں۔ سپہ سالار کے قتل ہوتے ہی مسلمان فوج کے حوصلے پست ہو جائیں گے اور وہ میدان جنگ چھوڑ جائے گی۔

فلپ نے اس مقصد کے لئے شارینہ نامی حسینہ کو چنا اور اس کے ساتھ ایک رومی بہادر استعارف کو روانہ کیا جنہوں نے اپنا مظلوموں والا بھیس بدلا اور اپنے کپڑوں میں زہر آلود خنجر چھپائے اور رومی قلعہ یعقوبیہ کے پچھلے دروازہ سے نکل کر بڑا لمبا چکر ڈال کر اسلامی سپاہ کے قریب پہنچ گئے۔

ان کو مسلمان جاسوسوں نے دیکھ کر پکڑ لیا اور لا کر سپہ سالار ابن سرح کے سامنے پیش کر دیا۔

ابن سرح۔:اے عورت اور مرد تم کون ہو اور مسلمان سپاہ کے عقب کے قریب کیا کر رہے تھے۔

مرد اور عورت نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا پھر وہ عورت بولی۔

اے سردار! ہم یہ نہیں جانتے کہ آپ لوگ کون ہیں ہم تو کافی دور سے آئے ہیں اور رومی سپاہ کے خوف سے چھپ کر مصر کی جانب جا رہے تھے مجھے شاہ جرجیر کی فوج کے ایک سالار رونیل نے اپنے قید خانہ میں ڈال رکھا تھا کیونکہ وہ میرے حسن کا دیوانہ تھا اور مجھ سے اپنی ناجائز خواہش پوری کرنا چاہتا تھا جبکہ یہ شخص میرا محبوب ہے میں اسے چاہتی ہوں اور یہ مجھے چاہتا ہے۔

ایک رات وہ سالار رونیل شراب کے نشے میں دھت میرے کمرے میں آیا اور مجھ سے دست درازی کرنے کی کوشش کرنے لگا جبکہ میں نے اپنی بساط کے مطابق اس کی مزاحمت کی اور اسی مزاحمت کے نتیجے میں میرے ایک دھکے سے وہ لوہے کے دروازہ سے ٹکرا کر نیچے گرا تو میں نے اس کے لباس میں لٹکا ہوا خنجر نکال کر اس کے سینے میں پیوست کر دیا ایسے میں میں بے انتہا دہشت زدہ ہو گئی اور وہاں سے بھاگ نکلی۔

بھاگتے بھاگتے میں اس شخص جس کا نام استارف ہے کے پاس پہنچی اور اس کو ساری داستان سنائی اور اس کو اپنی محبت کا واسطہ دے کر اس بات پر مجبور کیا کہ یہاں سے نکل کر ہم کسی دور دراز امن والے شہر میں جا پہنچیں اور وہاں باقاعدہ شادی کر کے اپنی تجدید محبت کریں اور اپنی زندگی امن وامان سے گزاریں۔

یہ ہے ہماری کل داستان اور ہم اس راہ کے پاس کچھ دیر سستانے کے لئے ٹھہر گئے تھے کہ آپ کے آدمی ہمیں پکڑ کر لے آئے ہیں۔

ابن سرح۔:اے لڑکی! تمہاری داستان سے معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگ مظلوم ہو لیکن میں تمہارے اب کیا کام آ سکتا ہوں اور تمہارا نام کیا ہے؟

اجنبی خاتون۔:شارینہ میرا نام ہے اور ہمیں اگر یہاں پناہ مل جائے تو ہم آپ کے بہت مشکور ہونگے۔

ابن سرح۔:ہم لوگ مسلمان ہیں اور آپ کو پناہ دینا ہمارا فرض ہے اس وقت ہم حالت جنگ میں ہیں اگر ہم جیت گئے تو پھر تمہیں کسی بھی قسم کا خوف دامن گیر نہ ہوگا جبکہ دوسری صورت میں تم اپنی حفاظت کے خود ذمہ دار ہو گے۔

اس کے بعد ابن سرح نے ان کو پناہ دے دی اور ایک علیحدہ خیمہ ان کو دے دیا۔

اس خیمہ میں پہنچ کر دونوں نے اپنا قیام کیا اور جب رات کو مسلمان آرام کرنے کی غرض سے لیٹ گئے اور چند ایک کے سوا تمام مشعلیں بجھا دی گئیں اور پہریدار کو خبرداری کے لئے پہرے پر مقرر کر دیا گیا تو نصف رات کے بعد ان دونوں نے اپنے خیمہ سے دبے پاؤں قدم باہر نکالا اور سالار اعلیٰ ابن سرح کے خیمہ کی طرف بڑھے ابھی وہ خیمہ کے نزدیک ہی پہنچے تھے کہ اچانک پہرے پر موجود حدید کی نظر دو سایوں پر پڑی تو وہ چونکے

اور انہوں نے بھی دبے پاؤں ان کی طرف پیش قدمی کی اور جب وہ خیمے کے پاس پہنچے تو اس وقت وہ دونوں ابن سرح کے خیمے میں داخل ہو چکے تھے جس پر حدید کو بہت زیادہ شک گزرا انہوں نے خیمے کے پردے کو بلا کسی آہٹ کے قدرے ہٹایا اور اندر نظر ڈالی تو دیکھا کہ ابن سرح محوخواب ہیں اور وہ شخص ہاتھ میں خنجر بلند کئے ان کو نشانہ بنانے کی کوشش کر رہا ہے انہوں نے تیزی سے خیمہ کا پردہ ہٹایا اور اس شخص پر جست لگائی۔

اچانک کھٹکے سے ابن سرح کی آنکھ فوراً کھل گئی جبکہ وہ شخص گھبرا کر حدید پر حملہ آور ہوا اور شارینہ خوفزدہ ہو کر خیمے سے بھاگ نکلی حدید نے فوری طور پر اس کے خنجر والے حملے کو روکا اور اس پر اپنی گرفت تیز کر کے اس کو بے بس کر دیا۔

ابن سرح نے فوری طور پر اٹھ کر اس کے ہاتھ سے خنجر کو چھین لیا۔ شور کی آواز سن کر اور لوگ بھی خیمے میں داخل ہوئے اور اسقارف کو بے بس کر کے پابند سلاسل کیا۔

ابن سرح نے جب اس سے باز پرس کی تو شاہ جرجیر اور اس کے سپہ سالار فلپ کی سازش کا انکشاف ہوا جب اس عورت شارینہ کی تلاش کی گئی تو وہ نہ ملی۔

شاہ جرجیر کے پاس شارینہ تین روز کے بعد واپس پہنچی اور اپنی ناکامی کا اعلان کیا شاہ جرجیر کو غصہ بہت آیا اور اس نے غصہ کی حالت میں اس عورت کا سر تن سے جدا کر دیا۔

☆

دوسری طرف مسجد نبوی کے سامنے لوگوں کا اژدہام تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بڑا میلہ لگا ہے۔ خوشی سے ہر چہرہ دمک رہا تھا۔ لوگ خوش کیوں نہ ہوتے۔ جوانان اسلام کی کمک محاذ جنگ کی طرف کوچ کرنے والی تھی۔ دربار خلافت نے والی مصر عبداللہ بن ابی سرحؓ کی درخواست کو شرف قبولیت بخشا تھا۔ انہیں کمک بھیجی جا رہی تھی۔ مدینہ منورہ اور اطراف مدینہ کے تمام جوان میدان جنگ پر جانے کے خواہش مند تھے۔ خلیفہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو انتخاب میں بڑی پریشانی ہو رہی تھی کہ کس کس کو روکیں، کس کو اجازت دیں۔ ہر ایک محاذ جنگ پر جانے کے لئے بضد تھا۔ جس کو دیکھو خوشامد کر رہا ہے۔ بڑی مشکل سے یہ مرحلہ طے ہوا۔

منتخب سوار صف بہ صف کھڑے ہیں۔ سرداروں کی آمد آمد ہوئی۔ لیجئے وہ آئے ابن عباس گھوڑا اچکاتے، دلکی لگاتے اور یہ پہنچے ابن جعفر اور ابن عمر مسکراتے گھوڑا اڑاتے فاتح مصر کے صاحب زادے ابن عمروان کے پیچھے ہیں۔ اب دو خوبرو جوان آتے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہاں یہی ہیں جگر گوشہ رسول ﷺ، فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لعل حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ چہروں سے شجاعت ہویدا، آنکھوں سے شہادت جھانکتی ہوئی۔ آخر میں سرخیل لشکر، سپہ سالار فوج عبداللہ بن زبیر تشریف لائے۔ متین اور پررعب چہرہ۔ قوی ہیکل جوان۔

ذوالنورین حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آہستہ اور پروقار قدم اٹھاتے نمودار ہوئے۔ تمام لشکر پا پیادہ ہو گیا۔ تعظیم بجالایا۔ خلیفہ نے سواروں پر نظر ڈالی۔ سرداروں اور سپہ سالاروں کو دیکھ کر مسکرا کے حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے شانوں پر ہاتھ رکھے۔ آخر میں سرخیل لشکر سپہ سالار فوج عبداللہ بن زبیرؓ کے پاس پہنچ کر بولے۔

"اسلام کی شان برقرار رکھنا۔ باپ کی شجاعت کو مت بھولنا"

ابن زبیرؓ نے ادب سے نظریں نیچی کرلیں۔ اذنِ کوچ ملا۔ لشکر سوار ہوا۔ پرچم ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں تھا۔ تلوار کی چھاؤں اور آغوش تہور میں پلنے والے نامور باپ کے یہ نامور بیٹے جب مدینے سے روانہ ہوئے تو لوگ چیخ اٹھے۔

"مدینہ سواروں اور جوانوں سے خالی ہوا۔ سب ستارے، تیغ سیارے میدان جنگ کا رخ کر رہے ہیں۔ کیا مجال کہ فتح سرتابی کرے اور نصرت قدم نہ چومے۔ اللہ اکبر کے نعروں سے یثرب کے دشت وجبل گونج اٹھے۔"

ابن زبیرؓ کو بعجلت مصر پہنچنے کا حکم ہوا تھا۔ انھوں نے راہ میں بہت کم قیام کیا اور قطع منازل کرتے مصر کی حدود میں داخل ہوئے۔ فسطاط میں صرف ایک شب گزاری پھر آگے بڑھے اور تیونس میں داخل ہوگئے۔ میدان جنگ قریب تھا۔ جنگ کے شیدائی گھوڑوں نے محاذ کی خوشبو پائی تو بے قابو ہونے لگے۔ راسیں کھینچی جاتیں تو منہ زوری کرتے۔ رفتار مہمیز کے بغیر تیز ہوگئی۔

ابن زبیرؓ رات کے وقت یعقوبیہ کے میدان میں داخل ہوئے۔ ابن ابی سرحؓ کو ان کی آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ انھوں نے اپنے خیمہ سے نکل کر ابن زبیرؓ اور مدینہ کے جوانوں کا استقبال کیا۔ لشکر اسلام میں کمک آجانے سے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ فتح کی امیدیں پھر بندھیں اور صبح کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ابن زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابن ابی سرح رضی اللہ تعالیٰ عنہ جنگ اور میدانِ جنگ کے بارے میں دیر تک گفتگو کرتے رہے پھر شب بخیر کہہ کر اپنے اپنے خیموں میں چلے گئے۔

صبح کو دونوں لشکر ایک دوسرے کے مقابلہ پر آئے۔ صفیں درست ہونے لگیں۔ مسلمانوں کے تمام چھوٹے بڑے سردار میدان میں آگئے لیکن سپہ سالار ابن ابی سرحؓ اب تک خیمے سے برآمد نہ ہوئے تھے۔ ابن زبیرؓ کو تشویش ہوئی کہیں سپہ سالار بیمار تو نہیں ہوگئے۔ ابن زبیرؓ نے سوچا۔ مدینہ سے آنے والے دوسرے سردار بھی فکرمند تھے۔ خدا خیر کرے۔ ابن ابی سرحؓ کیوں نہیں آئے۔ سب کے دلوں کو یہی خیال کچوکے دے رہا تھا۔

اس وقت ابن زبیر گھوڑا بڑھا کر ابن ابی سرحؓ کے نائب کے پاس پہنچے۔

انھوں نے نائب سے پوچھا۔

"سپہ سالار تشریف نہیں لائے اب تک۔ خیریت تو ہے؟"

"وہ نہیں آئیں گے۔" نائب نے یہ جواب دے کر نظریں نیچی کرلیں۔

"کیوں۔ کیا وہ بیمار ہیں۔"

اس وقت ایک دوسرا سوار تیزی سے ابن زبیرؓ کی طرف بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھا۔ کاغذ کا پرچہ انھیں دے دیا گیا انھوں نے پرچہ پڑھا ایک لمحہ توقف کیا پھر جیسے خود سے بولے۔

"عبداللہ بن ابی سرحؓ کی موجودگی میں لشکر کی کمان میں نہیں کرسکتا۔"

اور ابن زبیرؓ پرچہ لئے ہوئے ابن ابی سرحؓ کے خیمے پر پہنچے۔ انھوں نے دیکھا کہ ابن ابی سرحؓ بے چینی سے خیمے میں ٹہل رہے ہیں۔

ابن زبیرؓ سلام کے بعد بولے۔

''شکر ہے آپ خیریت سے ہیں۔ پھر میں کیسے سپہ سالاری کے فرائض انجام دے سکتا ہوں۔ آپ بڑے ہیں۔ ہر طرح سے مجھ پر فوقیت رکھتے ہیں۔''

''ابن زبیرؓ!......'' ابن ابی سرحؓ غمگین لہجے میں بولے:

''کیا کسی نے تمھیں اب تک نہیں بتایا کہ میں حالات کی قید میں ہوں۔ میرے سردار مجھے خیمے سے باہر نہیں نکلنے دیتے۔''

''کس نے آپ کو قید کیا ہے؟'' ابن زبیرؓ کو طیش آ گیا۔ ''کون کون سے سردار اس حرکت میں ملوث ہیں۔ مجھے نام بتائیے۔ میں ابھی ان کے سر قلم کر دوں گا۔''

ابن ابی سرحؓ شرمندہ سے بولے۔

''ابن زبیرؓ! میں نے رات کو کئی بار کوشش کی تھی کہ تمھیں صاف صاف بتاؤں کہ میں میدان جنگ میں جانے سے کیوں معذور ہوں لیکن مجھے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ میری زبان تمہارے سامنے نہ کھل سکی۔''

ابن ابی سرحؓ کی باتوں سے ابن زبیرؓ کی الجھن اور بڑھ گئی۔ انھوں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔

''کیا میں یہ سمجھوں کہ لشکرِ السلام کا سپہ سالار اپنی جان کے خوف سے خیمے میں چھپ کر بیٹھ گیا ہے؟''

''میں اس الزام سے بھی انکار نہیں کر سکتا۔'' ابن ابی سرحؓ نے بلا عذر تسلیم کیا۔

ابن زبیر کو غصہ آ گیا۔ چیخ کے بولے۔

''آپ اس الزام کی سنگینی سے واقف ہیں؟''

''واقف بھی ہوں اور اس کی سزا بھگتنے کے لئے بھی آمادہ ہوں۔'' ابن ابی سرحؓ ٹھہر ٹھہر کر بولے۔ ''لیکن تم پہلے وضاحت اور صفائی سن لو پھر تمھیں ہر قدم اٹھانے کا اختیار ہوگا۔''

ابن زبیرؓ کا سر غم اور غصہ سے چکرانے لگا۔

''ابن زبیر!'' سپہ سالار نے کہا۔ ''ہم صرف چالیس ہزار کے لشکر سے سوا لاکھ رومیوں کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ہم انہیں شکست تو نہ دے سکے لیکن ہم ایک قدم پیچھے بھی نہیں ہٹے۔ پھر ایک عجیب حادثہ ہوا۔ رومی بادشاہ جرجیر کی ایک بیٹی ہے فلپائن۔ جو بے حد خوبصورت ہے۔ اس نے اعلان کرا دیا کہ جو رومی میرا سر اتارے گا۔ وہ اس سے شادی کرے گی اور ساتھ ایک لاکھ دینار بھی انعام میں دئے جائیں گے۔ اس دن سے رومیوں نے جنگ کے بجائے صرف مجھ پر حملہ شروع کر دیا۔ میں میدان سے نہیں ہٹا۔ لیکن میری حفاظت کرتے کرتے کئی بہادر سردار شہید ہو گئے۔ میرے لشکر کا بہت زیادہ نقصان ہونے لگا۔ تنگ آ کر سرداروں نے زبردستی مجھے خیمے میں بٹھا دیا تا کہ رومیوں کے حملہ کا زور ٹوٹ جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا مجھے میدان میں نہ پا کر اب رومی بے دلی سے لڑتے ہیں ہمارا نقصان بہت کم ہوتا ہے۔''

بات بڑی عجیب اور حیرت انگیز تھی۔ ابن زبیرؓ کا غصہ کم ہوگیا۔ وہ بھی سوچ میں پڑ گئے۔ عبداللہ بن ابی سرحؓ کو بھی سہارا ہوا۔ ان کی خفت کم ہوئی۔ ابن زبیرؓ دیر تک فکر میں ڈوبے رہے پھر سر اٹھا کر ابن ابی سرحؓ کو دیکھا اور مسکرانے لگے۔

''ابن زبیر! میں شرمندہ ہوں۔ تم مجھ پر ہنس سکتے ہو۔ میرا مذاق اڑا سکتے ہو۔'' ابن ابی سرحؓ بولے۔

ابن زبیر فوراً سنجیدہ ہو گئے۔ انھوں نے کہا:

''سپہ سالار! آپ مجھے گناہ گار نہ کیجئے۔ میری کیا مجال کہ میں اپنے کسی بزرگ پر ہنسوں۔ مجھے تو اس شرط پر ہنسی آ گئی تھی۔ شہزادی نے اپنی قیمت بہت زیادہ مقرر کی ہے۔ رومی لشکر اسلام کے سپہ سالار کی قدر و قیمت نہیں جانتا۔''

پھر رک کے بولے۔ ''میری سمجھ میں ایک ترکیب آئی ہے اگر آپ اتفاق کریں تو رومیوں کا وار خود ان پر الٹا ہو سکتا ہے۔''

ابن ابی سرحؓ جلدی سے بولے۔

''ابن زبیرؓ تم جو مشورہ دو اس پر میں عمل کروں گا لیکن اب میں خیمے میں نہیں بیٹھ سکتا۔ تمہارے آنے سے مجھے اطمینان ہو گیا ہے کہ میری شہادت کے بعد تم لشکر کو سنبھال لو گے۔''

ابن زبیرؓ نے بڑے جوش سے کہا۔

شہادت تو خوش قسمت کو حاصل ہوتی ہے۔ آپ میدان میں چل کے اعلان کیجئے کہ جو جوانمرد رومی بادشاہ جرجیر کا سر قلم کرے گا اسے ایک لاکھ دینار کے علاوہ شہزادی فلپائن بھی عطا کی جائے گی اور تیونس کی امارت بھی اسے ملے گی۔''

ابن ابی سرحؓ نے پہلے تو ابن زبیرؓ کو حیرت سے دیکھا پھر بڑھ کے ان سے گلے ملے اور بولے۔

''خوب خوب، تم نے کیا اچھی ترکیب نکالی ہے۔''

ابن ابی سرحؓ نے فوراً اسلحہ لگایا۔ باہر آ کر گھوڑے پر سوار ہوئے اور ابن زبیرؓ کے ساتھ مسکراتے ہوئے میدان میں پہنچ گئے۔ اس وقت لشکر اسلام میں اعلان ہوا۔

''شاہ جرجیر کا سر قلم کرنے والے کو ایک لاکھ دینار اور تیونس کی امارت ملے گی اس کے علاوہ رومی شہزادی فلپائن بھی اسی کے حوالے کر دی جائے گی۔''

ابن ابی سرحؓ کے اس اعلان کو لشکریوں نے بڑی دلچسپی اور شوق سے سنا۔ طبل جنگ بجتے ہی زور و شور سے جنگ شروع ہوگئی۔ جس طرح مسلمانوں کو کمک حاصل ہوئی تھی اسی طرح بلاد مغرب سے مزید فوجیں شاہ جرجیر کی مدد کو بھیجی گئیں۔ پتہ نہیں یہ کمک آنے کا اثر تھا یا اس دلچسپ اعلان کا کہ مسلمان کی مدافعتی جنگ نے جارحانہ رخ اختیار کر لیا۔ جوانانِ مدینہ نے تو صفیں کی صفیں الٹ کے رکھ دیں۔ ابن ابی سرحؓ جو کل تک خیمے میں کرب کی گھڑیاں گزار رہے تھے۔ وہ آج ابن زبیرؓ کے ساتھ اگلی صفوں میں اپنے جوہر دکھا رہے تھے۔

اچانک ابن زبیرؓ اپنے پانچ سو سواروں کے ساتھ جرجیر کی طرف بڑھے۔ جو اونچی جگہ کھڑے ہو کر لڑائی دیکھ رہا تھا۔ اس نے مسلمانوں کا ایک غول اپنی طرف آتے دیکھا تو خود بھی تلوار کھینچ لی۔ دو ہزار رومی سوار اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ انھوں نے جرجیر کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ ابن زبیرؓ

مارتے کاٹتے آگے بڑھتے رہے۔ لیکن جرجیر کے گرد محافظوں کی تعداد اور بڑھ گئی۔ ممکن ہے کہ شاہ جرجیر کو بھی مسلمان لشکر میں ہونے والے صبح کے اعلانِ جنگ کی بھنک مل گئی ہو۔ اس نے تین ہزار اور سواروں کو اپنے گرد اکٹھا کر لیا۔ یوں لڑائی سمٹ کے شاہ جرجیر کے گرد آ گئی۔

پھر ایسا ہوا کہ آہن وفولاد میں ڈوبا ہوا ایک سوار ابن زبیرؓ کے سامنے سے تیزی سے گزرا۔ اس کا سر گردن تک خود میں چھپا ہوا تھا۔ ابن زبیرؓ پر اس نے بھرپور حملہ کیا۔ ابن زبیرؓ نے وار خالی دے کر حملے کے لئے تلوار اٹھائی ہی تھی کہ دفعتاً ان کی نظر سوار کی کلائی پر پڑی۔ اٹھی ہوئی تلوار رک گئی۔ سوار کی کلائی میں سونے کا مرصع کنگن موجود تھا۔ ابن زبیر گھوڑا گھما کر دوسرے رومیوں سے لڑنے لگے۔ شاید سوار نے بھی اسے محسوس کر لیا تھا پھر شام تک وہ سوار ان کے پاس نہیں پھٹکا۔

سخت لڑائی کے باوجود آج بھی فیصلہ نہ ہوسکا لڑائی کا فیصلہ شاید ابن ابی سرحؓ اور شاہ جرجیر کے سر سے بندھ کے رہ گیا تھا۔

شام کو جب ابن ابی سرحؓ کے خیمے کے آگے محفل شوریٰ بیٹھی تو ابن ابی سرحؓ نے کہا۔

''ابن زبیرؓ کی عقل مندی نے جنگ کا نقشہ بدل کر رکھ دیا ہے۔ تمام دن رومی لشکر صرف شاہ جرجیر کو بچاتا رہا۔''

ابن زبیرؓ چپ چپ تھے۔ ابن جعفر نے انہیں چھیڑا۔

''ابن زبیرؓ تو آج شاہ جرجیر کا سر اتارنے پر تلے رہے۔ کئی بار تو یہ اس کے بہت قریب پہنچ گئے تھے۔''

ابن زبیرؓ پھر بھی خاموش رہے۔ سپہ سالار نے فکر مندی کا اظہار کیا۔

''ابن زبیرؓ تم کیوں خاموش ہو؟''

ابن زبیرؓ سر اٹھا کے بولے۔

''کیا بتاؤں سپہ سالار! آج دورانِ جنگ ایک عجیب حادثہ پیش آیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس طرح بیان کروں۔''

سب جوانوں نے چونک کے ابن زبیرؓ کی طرف کان لگا دیئے۔

ابن ابی سرحؓ نے پریشانی سے پوچھا۔

کیا حادثہ پیش آیا ابن زبیر! ہمیں بھی تو بتاؤ کچھ؟

''سپہ سالار کو یوں محسوس ہوا جیسے۔ جیسے۔''

ابن زبیرؓ کہتے ہوئے پھر جھجکے۔

''ہاں ہاں بتاؤ...... کیا ہوا تھا؟ ابن ابی سرحؓ نے سہارا دیا۔

ابن زبیرؓ جھجکتے ہوئے بولے۔

''سپہ سالار! مجھے یقین ہے کہ رومی لشکر میں عورتیں بھی ہیں۔''

''عورتیں......!'' کئی آوازیں اٹھیں اور حیران ابن زبیرؓ پر جم کے رہ گئیں۔

''ابن زبیر۔ درست فرما رہے ہیں سپہ سالار!......'' یہ سبطِ پیغمبر حضرت حسنؓ کی آواز تھی۔ ایک سوار کو میں نے بھی دیکھا تھا کہ اس کے ہاتھ میں جڑاؤ چوڑیاں تھیں۔''

''میرا وہم دور ہو گیا سپہ سالار!......'' یہ ابن زبیرؓ کی آواز تھی۔ ''اب تک میں اسے اپنا وہم سمجھ رہا تھا لیکن بھائی حسنؓ نے تصدیق کر کے میرے دل کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ میں نے جس سوار کو دیکھا اس کے ہاتھ میں مرصع کنگن تھا۔ بھائی حسنؓ نے جسے دیکھا وہ چوڑیاں پہنے تھی۔

''ذرا ٹھہر کے سپہ سالار!'' حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ چوڑیوں سے میری مراد کنگن ہی ہے جسے میں نے دیکھا تھا اس کے ہاتھ میں مرصع کنگن ہی تھا۔''

ابن ابی سرحؓ سر جھکا کے سوچ رہے تھے۔ اس انکشاف در انکشاف نے انہیں متحیر کر دیا تھا۔

''اگر یہ ایک ہی عورت ہے تو......................'' ابن عمرو نے ادھر ادھر دیکھا۔ ''مجھے تو یقین ہے کہ وہ رومی شہزادی فلپائن ہے۔''

''فلپائن'' ابن عمر حیرت سے بولے۔ ''یعنی۔ یعنی شاہ جرجیر کی بیٹی؟......''

''ہاں ابن عمر۔'' ابن عمرو نے وضاحت کی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ رومی شہزادی تلوار چلانے میں بہت ماہر ہے۔ ابن زبیرؓ نے شاہ جرجیر پر زبردست حملہ کیا تھا ہو سکتا ہے کہ وہ باپ کو بچانے کے لئے خود سامنے آ گئی ہو۔''

سپہ سالار ابن ابی سرحؓ نے سر اٹھایا وہ کچھ کہنے والے تھے کہ ایک آدمی ان کے پاس پہنچا۔ پھر اس نے آہستہ سے ابن ابی سرحؓ کے کان میں کچھ کہا۔ جسے سن کر وہ کچھ پریشان ہوئے اور پھر سوچنے لگے۔

آخر ابن زبیرؓ نے پوچھا۔

''سپہ سالار! آپ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں کوئی بُری خبر تو نہیں؟''

یہ لوگ اسی الجھن میں تھے دو محافظوں کی حراست میں ایک عورت پیش کی گئی۔ اس کا لباس اسے رومی ظاہر کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رومال میں بندھی ہوئی کوئی چیز دبی تھی اور چہرے پر نقاب تھا۔

عورت نے مسلم سرداروں کے پاس پہنچ کے نقاب الٹنے کے لئے اپنا ہاتھ اٹھایا۔ جوانانِ مدینہ نے فوراً نظریں نیچی کر لیں۔

سپہ سالار نے جلدی سے کہا۔

''تمہیں بے نقاب ہونے کی ضرورت نہیں۔''

نقاب پوش عورت سپہ سالار کی بھاری آواز سے سہم گئی۔

سپہ سالار نے نرمی سے پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ تم رومی ہو۔ تمہارا نام کیا ہے اور رومی فوج سے تمہارا تعلق کیا ہے؟

''میں ہر بات کا جواب دوں گی مگر پہلے مجھے مسلم سپہ سالار سے ملایا جائے۔'' نقاب پوش عورت نے کمال جرأت کا مظاہرہ کیا۔

سپہ سالار ابن ابی سرحؓ سرداروں کے ساتھ دستر خوان پر جانے کے لئے تیار ہوئے تھے کہ درمیان یہ میں یہ عورت پیش ہوئی۔

''رومی خاتون!'' سپہ سالار بڑے وقار سے بولے۔''غور سے دیکھو میں ہی ابن ابی سرحؓ ہوں۔ جس کے سر کی قیمت تمہارے شاہ نے ایک لاکھ دینار اور شہزادی سے شادی مقرر کی ہے اور میں وہی ابن ابی سرحؓ ہوں جس نے اعلان کیا ہے کہ شاہ جرجیر کا سر اتارنے والے کو ایک لاکھ دینار کے علاوہ تیونس کی گورنری بھی پیش کی جائے گی۔ کہو اب کیا کہنا چاہتی ہو؟''

رومی عورت سر خم کر کے بولی۔

''میں مسلم سالار کی خدمت میں کورنش بجالاتی ہوں۔''

ابن ابی سرحؓ نے پر رعب لہجے میں کہا۔

''اگر رومی خاتون جاسوسہ نہیں ہے تو میں اسے خوش آمدید کہتا ہوں۔''

رومی عورت نے اطمینان سے جواب دیا۔

''سالار معظم! جاسوس چھپ کر آتے ہیں۔ میں سب کے سامنے لشکر میں داخل ہوئی ہوں پھر میں جاسوسہ کیسے ہوسکتی ہوں۔''

''پھر تم کون ہو اور کس غرض سے آئی ہو؟'' سپہ سالار نے دریافت کیا۔

''سپہ سالار محترم!......'' عورت نے وضاحت کی۔''میرا نام جینا ہے۔ میں شہزادی فلپائن کی ادنیٰ کنیز ہوں۔''

شہزادی فلپائن کے نام پر سب کے کان کھڑے ہو گئے۔

''آنے کا مقصد؟'' سپہ سالار نے اسے تیز نظروں سے دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

عورت نے جواب دیا۔

''مجھے ایک مسلم سوار کی تلاش ہے امید ہے آپ اس سلسلے میں میری مدد فرمائیں گے۔''

ابن ابی سرحؓ کی حیرانی بڑھ گئی۔''کیا نام ہے اس سوار کا؟''

''مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔'' عورت نے جواب دیا۔

سپہ سالار کو اور تعجب ہوا۔''پھر ہم اسے کیسے تلاش کر سکتے ہیں۔ تم اسے پہچانتی ہو؟''

رومی عورت نے اطمینان سے کہا۔

''میں اسے پہچانتی نہیں ہوں مگر اس کی شناخت موجود ہے۔''

عجیب جواب تھا۔ ابن ابی سرحؓ بولے۔

''خاتون!......اپنے جواب کی وضاحت کرو۔ تمہارے پاس اس کی کیا شناخت موجود ہے؟

''سردار محترم'' عورت نے جواب میں کہا۔''میں اس بہادر سوار کی تلاش میں ہوں جس نے آج جنگ کے دوران ہماری شہزادی فلپائن کی

جان بخشی کی حالانکہ شہزادی ان کی زد پر تھیں لیکن اس نے شہزادی کو بخش دیا۔''

نوجوان لشکر کی نظریں ابن زبیرؓ اور حسنؓ کی طرف اٹھ گئیں۔ انہی دونو جوانوں نے سوار عورت کو دیکھا تھا۔

ابن ابی سرحؓ پہلے حسنؓ سے مخاطب ہوئے۔

''اے فاتح خیبر کے نامور بیٹے! کیا کنگن والا سوار تمہارے سامنے آیا تھا؟''

''نہیں سپہ سالار!......'' حضرت حسنؓ نے تردید کی۔'' میں نے اسے صرف قریب سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔''

اب سب کی نظریں ابن زبیرؓ پر آ کر ٹھہر گئیں۔

ابن زبیرؓ سپہ سالار کے سوال کرنے سے پہلے بولے۔'' اے سپہ سالار! یہ غلطی مجھ سے ہوئی تھی۔ یہ یقین ہو جانے کے بعد کہ مجھ پر حملہ کرنے والی ہستی ایک عورت ہے۔ میرا ہاتھ اس پر نہیں اٹھ سکا۔''

ابن ابی سرحؓ خوش ہوتے ہوئے بولے۔

''ابن زبیرؓ تم نے کوئی غلطی نہیں کی۔ عفو و درگزر ہماری دینی تعلیم کا ایک اہم جزو ہے۔''

ابن ابی سرحؓ نے سر گھما کر رومی عورت کو دیکھا۔ وہ عورت خود بھی ابن زبیرؓ کو دیکھ رہی تھی۔

ابن ابی سرحؓ بولے۔:

''رومی خاتون! دیکھ لو۔ یہی ہیں ابن زبیرؓ جنہوں نے تمہاری شہزادی کو معاف کیا تھا کیونکہ وہ عورت تھیں اور ہمارا مذہب عورت پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں دیتا۔

اب سپہ سالار ابن ابی سرحؓ نے کنیز سے اس کی آمد کا اصل مقصد دریافت کیا۔

''مجھے آپ کے اس جوان سے ایک خصوصی درخواست کرنا ہے۔''

شہزادی فلپائن کی کنیز جینا نے کہا۔:

ابن ابی سرحؓ۔:''اے ابن زبیرؓ اس کنیز کی بات کو غور سے سنو اور اس کا مناسب جواب بھی تم ہی دو میری طرف سے تمہیں اجازت ہے۔''

اس پر کنیز جینا نے ابن زبیرؓ کی جانب رخ موڑا اور اس نے ہاتھ میں دبے ہوئے رومال کو کھولا اور مرصع کنگن نکال کے ابن زبیرؓ کے سامنے رکھ دیا۔ کنگن میں بے شمار قیمتی ہیرے جڑے ہوئے تھے اور کنگن خیمے میں لگی ہوئی مشعلوں کی روشنی میں جگمگ جگمگ کر رہا تھا۔

رومی کنیز جینا نے کہا۔

''شہزادی عالیہ کی طرف سے یہ ناچیز نذرانہ ابن زبیرؓ کے لئے ہے۔ اس ایک کنگن کی قیمت ایک لاکھ دینار سے کہیں زیادہ ہے۔''

ابن زبیرؓ کو سخت طیش آیا لیکن ابن ابی سرحؓ کی وجہ سے وہ ضبط کر گئے۔ ابن ابی سرحؓ نے ابن زبیرؓ کے چہرے کو دیکھ کر ان کی بے چینی اور غصہ کا اندازہ لگا لیا۔

پس ابن ابی سرح نے رومی کنیز سے پوچھا۔

''تمہیں کچھ اور بھی کہنا ہے؟''

''جی ہاں سپہ سالار!'' جینا بولی۔

''شہزادی عالیہ نے پیش کش کی ہے کہ جس طرح مسلم سوار نے شہزادی کے سر سے درگزر کیا ہے اگر وہ شاہ جرجیر کو بھی اسی طرح معاف کر دے تو اس جیسے دس اور کنگن اس کے صلے میں پیش کئے جا سکتے ہیں یا اس کی قیمت دیناروں کی صورت میں بھی ادا کی جا سکتی ہے۔''

ابن زبیرؓ کی حالت نا قابل برداشت ہوگئی اور غصے کے مارے ان کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے وہ بار بار پہلو بدل رہے تھے لیکن اس کے باوجود انہیں سپہ سالار کا لحاظ تھا۔ بغیر اجازت وہ کنیز کو جواب نہیں دے سکتے تھے۔

''اس کا جواب خود تمہیں ابن زبیرؓ دیں گے۔'' ابن ابی سرحؓ نے کنیز سے کہا۔

ابن زبیرؓ کی مشکل آسان ہوگئی۔ اجازت مل گئی تھی۔ وہ تڑپ کے بولے۔

''رومی خاتون!! یہ تحفہ واپس لے جاؤ۔ مسلمان دنیا کے لئے نہیں دین کے لئے لڑتے ہیں۔ اپنی شہزادی سے کہہ دینا کہ شاہ جرجیر کا سر میں یا کوئی میرا ساتھی ضرور اتارے گا۔ رومی لشکر نہ اُسے بچا سکتا ہے اور نہ تیونس کے خزانے اس کے سر کی قیمت ادا کر سکتے ہیں۔ جرجیر کے سر کی قیمت ہے ''فتح''، مکمل فتح۔

ابن زبیر اس قدر برافروختہ ہو گئے تھے کہ ان سے بیٹھا نہ گیا۔ انہوں نے ابن ابی سرحؓ سے کہا۔

''سپہ سالار۔ مجھے خیمے میں جانے کی اجازت دی جائے۔''

ابن ابی سرحؓ نے انہیں خیمے میں جانے کی اجازت دے دی اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتے اپنے خیمے کی طرف چلے گئے۔

اب سپہ سالار نے کنیز سے کہا۔

''سن لیا تم نے جواب ابن زبیرؓ کا۔ عرب کا یہ جوان حضرت اسماءؓ کا بیٹا ہے۔ وہ اسماء رضی اللہ تعالیٰ عنہا جنہیں پیغمبر اسلام رسولِ خدا ﷺ نے خود اپنی زبان سے ''ذوالنطاقین'' کا لقب عطا کیا تھا۔ بھلا وہ دنیا کے مال پر کیسے نظر ڈال سکتے تھے۔

رومی کنیز کی زبان جیسے گنگ ہوگئی۔ اس نے کنگن اٹھا کر خاموشی سے رومال میں لپیٹ لیا اور تھکے تھکے قدموں سے واپس ہوئی۔

ابن ابی سرحؓ نے سپاہیوں سے کہا۔

''اس خاتون کو حفاظت کے ساتھ رومی لشکر کی حد تک پہنچا دو۔''

☆

ادھر شہزادی فلپائن جینا کی واپسی کا بے چینی سے انتظار کر رہی تھی دن کے واقعہ نے اسے بڑا متاثر کیا تھا۔ جب اس نے عرب سوار (ابن زبیرؓ) پر حملہ کیا تھا تو اس کا خیال تھا کہ وہ بچ نہ سکے گا لیکن عرب سوار بڑی پھرتی سے جھکائی دے کر نکل گیا۔ وار خالی جانے سے وہ اپنا توازن پوری

طرح برقرار نہ رکھ سکی تھی۔ عرب سوار اسے آسانی سے قتل کر سکتا تھا لیکن اس نے جوابی وار نہیں کیا۔ شہزادی کو یقین تھا کہ عرب سوار نے جان بوجھ کر اسے معاف کیا ہے۔

جینا لڑکھڑاتے قدموں سے شہزادی کے پاس پہنچی تو وہ گھبرا گئی۔

''کیا ہوا جینا؟'' شہزادی نے پوچھا۔ ''کیا مسلمان تیرے ساتھ بدتمیزی سے پیش آئے؟''

سی سی اور روزی بھی دوڑ کر اس کے پاس آ گئیں۔ یہ دونوں شہزادی فلپائن کی رازدار سہیلیاں تھیں۔

جینا نے رومال شہزادی کی طرف بڑھا دیا۔ شہزادی نے رومال لیا۔ مگر کنگن دیکھ کر وہ پریشان ہو گئی۔

''واپس کر دیا اس نے۔'' شہزادی کا سر احساس ندامت سے جھک گیا۔

''شہزادی عالیہ!'' جینا نے زبان کھولی۔ ''آپ نے اس سوار کی قیمت بہت کم لگائی۔''

''وہ کتنی دولت چاہتا ہے؟'' شہزادی اپنی خفت مٹانے کے لئے بولی۔ ''میں جواہرات سے اس کا گھر بھر سکتی ہوں۔''

جینا نے انکار میں سر ہلایا۔ ''نہیں شہزادی! ابن زبیر بہت بلند ہے۔ وہ جتنا بہادر ہے اس سے زیادہ خوبصورت اور اس سے بھی زیادہ خوددار۔ آپ کا تحفہ اس نے صاف ٹھکرا دیا۔''

''آخر کیا کہا اس نے؟'' شہزادی کو غصہ آ گیا۔

جینا گھبرا کے بولی:

''شہزادی! میں اس کے الفاظ دہرا نہیں سکتی۔ اس نے بہت سخت الفاظ استعمال کئے ہیں۔''

''جینا میں حکم دیتی ہوں۔'' شہزادی چیختے ہوئے بولی۔ ''بتاؤ مجھے کیا کہا تھا اس نے؟''

جینا ڈرتے ڈرتے بولی۔

''اس نے کہا ہے کہ...... کہ...... شاہ جرجیر کے سر کی قیمت فتح ہے صرف فتح۔''

''خودسر۔ مغرور' جیسے فلپائن نے خود سے کہا پھر جینا سے بولی۔

''کل میں اس کا غرور خاک میں ملا دوں گی کیا سمجھا ہے اس نے۔ میں جان دے دوں گی مگر شاہ تک کسی کو نہ پہنچنے دوں گی۔

''خداوند یسوع، شاہ معظم کو محفوظ رکھیں۔'' جینا نے آہستہ سے کہا۔

''لیکن شہزادی عالیہ میں نے ان لوگوں کو جس حال میں دیکھا اس نے مجھے اتنا حیران کر دیا کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ پتہ نہیں یہ معصوم اور حسین چہرے میدان میں اتنی بہادری کیسے دکھاتے ہیں؟''

''تیرے خیال میں وہ بہت حسین ہیں؟'' شہزادی کے دل میں دبا ہوا چور زبان پر آ گیا۔

''شہزادی صاحبہ! آپ صرف حسین کہتی ہیں۔'' جینا نے مزے لے لے کے کہنا شروع کیا۔ ''لوگ جھوٹ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے

چہروں پر وحشت برستی ہے۔ ان کی شکلیں تو گلاب کی طرح تر و تازہ ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے شگوفے ابھی ابھی کھل کے پھول بنے ہوں۔

''کیا دیکھا تو نے وہاں؟'' شہزادی کو تفصیل معلوم کرنے کی فکر پڑ گئی۔ ''کیا ابن زبیر جیسے اور بھی خوبصورت جوان مسلمانوں کے لشکر میں ہیں؟''

جینا نے حیرت سے شہزادی کو دیکھا۔

''شہزادی عالیہ۔ ابھی تو آپ انکی برائی کر رہی تھیں اب انھیں..........''

شہزادی نے بات کاٹی۔

''دشمن کو دشمن ہی کہا جاتا ہے لیکن ابنِ زبیر کی بہادری اور خوبصورتی میں تو کوئی شبہ نہیں۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتی ہو؟''

''نہیں شہزادی۔'' جینا بولی۔

''اپنے لشکر میں ان جیسا ایک بھی جوان نہیں۔ میں نے تو وہاں ان جیسے اور بھی کئی جوان دیکھے لیکن وہ سب سر جھکائے اور میری طرف سے منہ گھمائے بیٹھے تھے۔''

''جھوٹی'' شہزادی مسکرائی۔:

''جب تو نے ان کی شکلیں ہی نہیں دیکھیں تو ان کے حسن کا کیسے اندازہ لگا لیا۔''

''میں نے ان کی صورتیں دیکھی تھیں شہزادی۔'' جینا نے وضاحت کی۔ ''جب میں آپ کا تحفہ لے کر ان کے پاس پہنچی اور چہرے سے نقاب ہٹانا چاہا تو سب نے جھٹ سے میری طرف پیٹھ کر لی۔''

''وہ کیوں؟'' شہزادی کو تعجب ہوا۔

''کیا مسلمان عورتوں سے پردہ کرتے ہیں؟''

جینا نے بتایا:

''یہ بات نہیں ہے شہزادی صاحبہ! مجھے بتایا گیا کہ مسلمان غیر عورتوں کی صورتیں دیکھنا گناہ سمجھتے ہیں۔ ان کے سردار نے مجھے نقاب ہٹانے سے منع کر دیا اور میں نے ان میں ایک بڑی خوبی یہ دیکھی وہ سب ایک ہی جیسا لباس پہنتے ہیں اور آپس میں اس طرح گھل مل کر بیٹھتے ہیں کہ سردار اور غیر سردار کی تمیز نہیں ہو سکتی۔ میں جس مسلمان کو معمولی آدمی سمجھ کے باتیں کرتی رہی' مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہی ان کا سردار ہے۔ وہ سب کے سب زمین پر بیٹھے تھے۔''

شہزادی مسلمانوں کی خوبصورتی اور بہادری سے تو پہلے ہی مرعوب تھی۔ جینا نے جس انداز سے ان کی تعریف کی شہزادی اس سے ان کے آداب اور اخلاق کی بھی قائل ہو گئی۔

فلپائن تمام رات بے چین رہی۔ اس نے جینا کے سامنے ابن زبیر کے مقابلہ کا اعلان تو کر دیا تھا لیکن جب وہ سوچتی کہ کیا وہ اس شخص پر ہاتھ اٹھا سکے گی جس نے اس کی جان بخشی کی تھی تو اس کا دل ڈانواں ڈول ہونے لگتا۔

کل کی جنگ سے شاہ جرجیر بہت گھبرایا ہوا تھا اس نے رات کو تمام سرداروں کو بلا کر بہت غیرت دلائی۔ آرنلڈ اور روپال کو تو اس نے خوب ہی پھنکارا۔ لشکر کے ساتھ جو راہب اور پادری تھے انہوں نے مذہب کا نام لے کر سرداروں کی شجاعت کو ابھارنے کی کوشش کی۔ حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے واسطے دیئے۔ آرنلڈ اور روپال دونوں اپنی اپنی جگہ شرمندہ تھے مسلمانوں پر حملہ کرنا تو الگ رہا وہ تو تمام دن اپنی جانیں بچانے میں لگے رہے تھے۔

صبح دم جب عیسائیوں کا لشکر میدان میں آیا تو بہت تازہ دم اور پرجوش معلوم ہوتا تھا۔ شاہ جرجیر نے حفظ ماتقدم کے طور پر لشکر کے بہترین سوار دستے اپنے گرد اکٹھا کر لئے تھے۔ اسے اپنی جان کی سب سے زیادہ فکر تھی۔ لڑائی شروع ہوئی تو بلاشبہ رومیوں کا حملہ بڑا زبردست تھا۔ آرنلڈ اور روپال اپنے دستوں کے ساتھ اتنی تیزی سے بڑھے کہ مسلمانوں کو آگے بڑھنے کا موقع نہ مل سکا لیکن ان دونوں کی شجاعت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ ابن زبیرؓ نے جلد ہی ان کے حملے کا زور توڑ دیا پھر تو یہ عالم ہوا کہ ابن زبیر مدینہ کے سبعہ سیارہ جوانوں کے ساتھ جس طرف کا رخ کرتے رومی کائی کی طرح چھٹتے چلے جاتے۔

کہتے ہیں کہ جب ابن زبیرؓ کے ساتھ حضرت حسنؓ، حضرت حسینؓ، ابن عمرؓ اور ابن عباسؓ روانہ ہونے لگے تو خلیفہ سوئم حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا:

''اے جوانو! تم میں سے ہر جوان ہزار ہزار رومیوں پر بھاری ہوگا۔''

حضرت عثمانؓ کے یہ الفاظ بعض تاریخوں میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ سے بھی منسوب کئے گئے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ یہ الفاظ کس محترم خلیفہ کی زبان مبارک سے ادا ہوئے۔ ان الفاظ کی افادیت اور اثر ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی طرح انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فتنۂ ارتداد ہو کہ جھوٹے نبیوں کا شاخسانہ۔ جنگ ایران ہو یا معرکۂ عراق و شام، جب بھی مدینہ سے لشکر روانہ ہوا تو نصرت و کامیابی ان کے سامنے سرنگوں ہوئی۔

آج کی لڑائی میں بھی یہی ہوا۔ رومیوں کا زور ٹوٹتے ہی مسلمانوں نے چاروں طرف سے رومیوں پر یلغار کر دی۔ ابن زبیرؓ اپنے دستوں کے ساتھ بڑھے تو شاہ جرجیر کے سامنے رومیوں کی پہاڑ جیسی دیواریں ایک ایک کر کے ٹوٹنے لگیں۔ ابن زبیرؓ بڑھتے بڑھتے شاہ جرجیر کے قریب پہنچ گئے۔ رومی جوانوں نے چاروں طرف سے شاہ کو گھیر رکھا تھا۔ ایک مارا جاتا تو دس سوار اس کی جگہ پہنچ جاتے۔

پھر ابن زبیرؓ کی آنکھوں میں جیسے کوندا سا لپکا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک عورت صفوں کو چیرتی ہوئی ان کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھا لیکن کلائی میں وہی مرصع کنگن جگمگا رہا تھا۔ پھر دوسرے ہی لمحے میں فلپائن نے ان پر تلوار کا وار کیا، وار اتنا نپا تلا تھا کہ ذرا سی غفلت کوئی خطرناک صورت اختیار کر سکتی تھی ابن زبیرؓ نے شہزادی کی تلوار کو اپنی تلوار میں الجھا کر ایسا جھٹکا دیا کہ شہزادی کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر دور جا گری۔ فلپائن شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ تلوار ہاتھ سے نکلتے ہی اس نے فوراً خنجر کھینچ لیا اور ابن زبیر پر بھرپور وار کیا۔ ابن زبیرؓ نے اس کی کلائی پکڑ لی اور اتنی مروڑی کہ خنجر فلپائن کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر گیا ابن زبیرؓ نے اسی وقت

شہزادی فلپائن کے گھوڑے کو ہلکی سی تلوار کی نوک چبھودی اور گھوڑا شہزادی کو لے کر ہوا ہو گیا۔

یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوا۔ ابن زبیرؓ پھر جنگ میں مصروف ہو گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا اگر کچھ ہوا تو یہ کہ ان کا جوش کچھ اور بڑھ گیا اور ان کی تلوار میں زیادہ تیزی آ گئی۔ وہ طوفان کی طرح آگے بڑھے۔ مدینہ کے نوجوان ساتھی ان کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ ان کے سامنے جو آتا وہ منہ کی کھاتا اور مارا جاتا اور جو راستہ روکتا وہ جہنم رسید ہوتا۔

آخر ابن زبیرؓ لڑتے اور راستہ بناتے شاہ جرجیر کے سر پر پہنچ گئے۔ شاہ جرجیر نے ایک مسلم نوجوان کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو وہ گھبرا گیا۔ اس نے سنبھل کر حملہ کیا۔ ابن زبیرؓ نے وار خالی دے کر اپنی تلوار اس کے سینے میں داخل کر دی یہ وار اس قدر شدید اور نپا تلا تھا کہ شاہ جرجیر اسے روکنے میں ناکام رہا وہ زخم کھا کر آگے کی طرف جھکا ٹھیک اسی وقت ابن زبیرؓ نے آگے بڑھ کر اس کا سر قلم کر دیا اور اب اس کا سر ابن زبیرؓ کے نیزے پر تھا۔

شاہ جرجیر کا سر نیزے پر دیکھ کر رومیوں میں بھگدڑ مچ گئی جس کا منہ جدھر اٹھا وہ اُدھر بھاگ نکلا اس بھاگ دوڑ میں سینکڑوں قتل ہوئے اور ہزاروں گرفتار ہوئے۔ سپہ سالار ابن ابی سرحؓ اپنے ساتھیوں کو لے کر قلعہ میں داخل ہوئے۔ وہ اس وقت بہت خوش تھے۔ خوش کیوں نہ ہوتے انھوں نے یعقوبیہ فتح کیا تھا۔

یعقوبیہ کی فتح قیرواں کی فتح کے مترادف تھی۔ قیرواں بلاد مغرب کا دروازہ تھا۔ اب انہیں روکنے والا کون تھا۔

اس جنگ میں مسلمان شہید کم مگر زخمی زیادہ ہوئے تھے۔ ابن زبیرؓ کے بھی کئی زخم آئے تھے۔ ایک زخم گہرا تھا۔ ابن ابی سرحؓ نے فوراً مرہم پٹی کا حکم دیا۔ ابن زبیرؓ نے بہت انکار کیا لیکن ان کے زخموں کو دھویا گیا پھر مرہم لگایا گیا۔

ابن ابی سرحؓ نے ابن زبیرؓ سے دریافت کیا۔

''ابن زبیر تمہیں چھوٹے بڑے کئی زخم آئے ہیں۔ زیادہ تکلیف تو نہیں''

ابن زبیرؓ کے کپڑوں پر خون کے چھوٹے بڑے بہت سے دھبے پڑ گئے تھے۔ انہوں نے اپنے کپڑوں کو دیکھا پھر ان کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی چمک پیدا ہوئی۔ انھوں نے سر بلند کر کے کہا۔

''اے سپہ سالار! ایک بار میری مادر مہربان نے مجھ سے پوچھا۔''

''اے عبداللہ جہاد کرتے وقت جب تمہارے جسم پر کوئی زخم آتا ہے تو تم اس وقت کیا محسوس کرتے ہو۔''

اس وقت میں نے جواب دیا تھا کہ اے تقدس مآب ماں! خدا کی قسم مجھے زخموں سے تکلیف نہیں ہوتی لیکن جب زخموں پر مرہم رکھا جاتا ہے تو مجھے تکلیف ہوتی ہے۔''

حضرت حسینؓ نے دخل دیتے ہوئے کہا۔

''میں ابن زبیرؓ کے قول کی تصدیق کرتا ہوں۔ ابن زبیرؓ نے یہ بھی کہا تھا کہ خدا کی قسم عزت سے مارا جانا مجھے زیادہ محبوب ہے بہ نسبت اس کے ذلت میں کوڑے لگائے جائیں۔''

تمام حاضرین نے ابن زبیرؓ کے جواب کو بہت سراہا۔ چونکہ ابن زبیر نے شاہ جرجیر کا سر اتار کے مسلمانوں کو فتح سے ہم کنار کیا تھا' لوگوں نے ان کی بہادری اور شجاعت کی بہت تعریف کی۔
یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ کسی نے آ کر اطلاع دی کہ شہزادی فلپائن چند دیگر خواتین کے ساتھ یعقوبیہ سے کچھ دور ایک نخلستان سے گرفتار کی گئی ہیں۔
چنانچہ ابن ابی سرحؓ نے اطلاع دینے والے سے کہا۔
دیکھو!!! شہزادی کو بہت عزت اور احترام سے یہاں لاؤ۔ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ اب وہ شاہی قیدی ہیں۔ ان کی شان میں کوئی گستاخی نہ ہونے پائے۔
اطلاع دینے والا واپس چلا گیا۔ ابن زبیرؓ کے زخموں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔ شہیدوں کی لاشیں میدان سے اٹھوا کر دفن کی گئیں۔ مہینوں کی مسلسل لڑائیوں کے بعد آج مسلمانوں کو سکون حاصل ہوا تھا۔ ابن ابی سرحؓ نے حکم دیا کہ تمام لشکر ایک ساتھ کھانا کھائے گا۔ لشکر اسلام ہمیشہ ایک ساتھ کھانا کھاتا تھا لیکن دورانِ جنگ اس میں تعطل ہو جاتا تھا۔ ابن ابی سرحؓ کے حکم کے مطابق رات کے کھانے کا انتظام میدان میں کیا گیا اور فرش خاکی پر دستر خوان بچھوا دیئے گئے۔
ابن ابی سرحؓ اپنے سرداروں کے ساتھ دستر خوان پر جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے کہ شہزادی فلپائن کی کنیز جینا کے آنے کی خبر ملی۔ ابن ابی سرحؓ نے اسے فوراً بلوا لیا۔ جینا' ابن ابی سرح کے سامنے آئی تو اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ چہرہ گرد آلود۔ بال الجھے ہوئے اور آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔ جینا بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ سپہ سالار اس کا یہ حال دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ جینا نے خود کو مشکل سے سنبھالا ہوا تھا۔ اس نے سپہ سالار ابن ابی سرحؓ کو جھک کے سلام کیا اور عرض کیا۔
اے سپہ سالارؓ! میں شہزادی فلپائن کی وہی کنیز ہوں جو ایک بار پہلے بھی آپ کے سامنے پیش ہوئی تھی۔"
ابن ابی سرحؓ نرم آواز میں بولے۔
"شاہی کنیز! تمہارا یہ حال دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ تم نے بھاگنے کی بے کار کوشش کی۔"
"موت سے کون نہیں بھاگتا سپہ سالار۔" جینا نے سنبھل کر جواب دیا۔ "شکست کے بعد رومی مارے جا رہے تھے اگر ہم نہ بھاگتے تو خود بھی قتل ہو جاتے۔"
"نہیں کنیز! تم نے غلط سوچا" ابن ابی سرحؓ کی آواز قدرے تیز ہو گئی۔ "تم نے مسلمانوں کے بارے میں غلط مفروضہ قائم کیا۔ جنگ ہو یا امن' بچوں' بوڑھوں اور عورتوں پر مسلمان ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ اگر کوئی ایسی غلطی کرے تو اسے سخت سزا دی جاتی ہے۔ جنگ کے خاتمے کے بعد شاہی خاندان کی خواتین ہمارے لئے قابلِ احترام ہیں۔ ہم جب تک ان کے بارے میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچتے۔ انہیں وہی عزت دی جاتی ہے جو انھیں اپنے دورِ حکومت میں حاصل تھی۔ تمہاری شہزادی اور تمام دوسری خواتین ہماری مہمان ہیں۔"

''تو کیا آپ ہمیں قتل نہیں کریں گے۔'' جینا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں۔'' ابن ابی سرحؓ نے سختی سے تردید کی۔

''ہماری بے عزتی بھی نہیں کریں گے۔'' جینا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو کنیز؟'' سپہ سالار نے الجھتے ہوئے کہا۔ ''بے عزتی سے تمہاری کیا مراد ہے؟''

کنیز نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا۔ ابن ابی سرحؓ کے پاس بہت سے سردار بیٹھے تھے۔

''ڈرو نہیں کنیز'' سپہ سالار نے اسے تسلی دی۔ ''خواتین کے ساتھ کوئی ایسی بات نہیں کی جاسکتی جس سے ان کے نسوانی وقار کو صدمہ پہنچے۔''

لیکن ہمارے راہبوں نے تو بتایا ہے............. ''کنیز کہتے کہتے رکی پھر نظریں نیچی کر کے بولی۔ ہمارے پادری اور پیشوا کہتے ہیں کہ شکست کھانے کے بعد رومی عورتوں کو خودکشی کر لینا چاہیئے کیونکہ مسلمان بے دردی سے عورتوں کو قتل کر دیتے ہیں جوان عورتوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتے ہیں پھر...... پھر ان کے چہرے زخمی کرتے ہیں اور جسم کے نازک اعضا کاٹ دیتے ہیں۔''

''چپ ہو جاؤ کنیز................ اب ہم سے نہیں سنا جاتا۔'' سپہ سالار نے غمگین لہجے میں کہا۔ ''یہ سب باتیں جھوٹ ہیں۔ تمہارے پیشوا تمہیں فریب دیتے ہیں۔''

''خداوند یسوع مسیح آپ کو اور مسلمانوں کو سلامت رکھے۔'' کنیز مطمئن ہو کے بولی۔ ''شہزادی صاحبہ تو بہت ہی پریشان ہیں۔''

''شہزادی فلپائن کہاں ہیں؟'' سپہ سالار کو جیسے یاد آ گیا۔

جینا نے بتایا۔

''وہ قلعہ میں پہنچ چکی ہیں سپہ سالار اعظم میں انہی کی درخواست لے کر آپ کے پاس حاضر ہوئی ہوں۔''

''ہاں کہو۔ شہزادی کیا چاہتی ہیں؟'' سپہ سالار نے نرمی سے پوچھا۔

جینا غمناک آواز میں بولی۔

''شہزادی عالیہ کی آخری خواہش ہے کہ قتل کرنے سے پہلے انہیں اپنے باپ شاہ جرجیر کے سر کا دیدار کرنے کی اجازت دی جائے؟''

شہزادی کی اس خواہش کو سن کر سپہ سالار اور دوسرے لوگ بھی غمگین ہو گئے۔

سپہ سالار نے کہا۔

''کنیز۔ پہلے تم جا کر شہزادی کو یہ یقین دلاؤ کہ کسی بھی خاتون کو قتل نہیں کیا جائے گا پھر ہماری طرف سے پیغام دینا کہ ان کی خواہش کی تکمیل اگر چہ ایک بہت تکلیف دہ امر ہے پھر بھی ہم اسے پورا کرنے کی کوشش کریں گے۔''

جینا سلام کر کے خوشی خوشی واپس ہوئی۔ پھر سپہ سالار کو جیسے کچھ یاد آیا اس نے جاتی ہوئی کنیز کو واپس بلایا اور دریافت کیا۔

''کنیز یہ تو بتاؤ کہ شہزادی نے کھانا کھایا کہ نہیں؟''

''ہم میں سے کسی نے بھی اب تک کھانا نہیں کھایا۔'' جینا نے بتایا۔

''تو سنو۔'' سپہ سالار نے زور دیتے ہوئے کہا۔ ''شہزادی سے جا کر کہہ دو کہ جب تک وہ کھانا نہیں کھائیں گی ہم ان کی کسی بات پر غور نہیں کریں گے۔''

کنیز نے بڑی حیرت سے سپہ سالار کو دیکھا۔

سپہ سالار نے اسے سمجھایا۔

''کنیز شاید تم یہ نہیں جانتیں کہ یہ ہمارے مذہب کی کتنی بڑی توہین ہے۔ ہمارا مذہب کہتا ہے کہ جب یہ نہ معلوم کرلو کہ پڑوس میں کوئی بھوکا تو نہیں اس وقت تک کھانا نہ کھاؤ۔ اب تم جا سکتی ہو۔''

کنیز کا دماغ بالکل صاف ہو گیا۔ وہ تمام افواہیں جو مسلمانوں کے خلاف رومیوں میں اڑائی گئی تھیں۔ ان کے دل اور دماغ سے کافور ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد کنیز واپس آئی اور سپہ سالار کو مطلع کیا کہ شہزادی نے سپہ سالار کا شکریہ ادا کیا ہے اور ان کے ارشاد کے مطابق وہ کھانا کھا رہی ہیں۔ پس سپہ سالار بھی اپنے سرداروں کے ساتھ دستر خوان پر پہنچ گئے۔

کھانے کے بعد جب ابن ابی سرحؓ واپس آئے۔ انہیں شہزادی کے آنے کی خبر ملی۔ اس وقت ان کے پاس لشکر کے بڑے بڑے اور خصوصاً نوجوانانِ مدینہ تمام کے تمام موجود تھے۔ ابن زبیرؓ سپہ سالار کے برابر بیٹھے تھے۔ شہزادی کے آنے کی اطلاع ملتے ہی انھوں نے سپہ سالار سے کچھ کہا اور پھر پچھلے دروازے سے دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

ابن ابی سرحؓ نے شہزادی کو آنے کی اجازت دی۔ چند لمحوں بعد شہزادی فلپائن اپنی تین کنیزوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ سنبھال سنبھال کر قدم اٹھا رہی تھی۔ رومیوں کی شکست اور باپ کی موت کے غم نے اس کے قدموں میں لرزش پیدا کر دی تھی۔ اس کا گلاب سا چہرہ مرجھایا ہوا تھا۔ ابن ابی سرحؓ نے شہزادی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شہزادی نے بڑے وقار سے سلام کیا پھر نظریں نیچی کر کے سالار سے ذرا فاصلے پر بیٹھ گئی۔ پھر شہزادی نے نظریں گھما کر تمام حاضرین کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ شہزادی بار بار نظریں اٹھا کر حاضرین کو دیکھ رہی تھی جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔

سپہ سالار ابن ابی سرحؓ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''شہزادی فلپائن کی ایک درخواست ہے۔''

شہزادی نے قطع کلام کیا۔

''میں اپنی اس درخواست سے پہلے ایک اور درخواست پیش کرنا چاہتی ہوں۔'' اس کی مجھے اجازت عطا فرمائی جائے۔''

''اجازت ہے شہزادی۔'' ابن ابی سرحؓ نے کہا۔ ''ہم آپ کی ہر خواہش کا احترام کریں گے۔''

شہزادی نے نظریں گھما کر تمام حاضرین کو دیکھا پھر مایوسی سے بولی۔

''اے سپہ سالار محترم! مجھے آپ کی محفل میں وہ سوار نظر نہیں آتا جس نے میرے باپ شاہ جرجیر کا سر قلم کیا تھا؟''

ابن ابی سرحؓ ایک لمحہ خاموشی کے بعد بولے۔

''شہزادی! آپ کو ابن زبیرؓ کی تلاش ہے۔ کچھ دیر پہلے وہ یہاں موجود تھے لیکن آپ کے آنے کی خبر پا کر وہ معذرت کر کے دوسرے کمرے میں چلے گئے ہیں۔''

''کیوں سپہ سالار محترم!'' شہزادی بے چینی سے بولی۔

''کیا انہیں مجھ سے شرم آتی ہے۔''

''شرم نہیں شہزادی۔'' ابن ابی سرحؓ نے وضاحت کی۔

''یہ دل آزاری کا مسئلہ ہے۔ ابن زبیرؓ یہ نہیں چاہتے کہ انھیں دیکھ کر آپ کے غموں میں اضافہ ہو جائے۔''

''لیکن میں انہیں دیکھنا چاہتی ہوں سپہ سالار۔'' شہزادی بڑے استقلال سے بولی۔

''مجھے غم کے ساتھ یہ فخر بھی ہے کہ میرا باپ مقابلہ کرتے ہوئے ایک بہادر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ میں اس بہادر کو مبارک باد دینا چاہتی ہوں۔ شاید اس سے میرا غم کچھ ہلکا ہو جائے۔

سپہ سالار کے حکم نے ابن زبیرؓ کو آنے پر مجبور کر دیا۔ وہ آئے مگر اس طرح کہ ان کی نظریں نیچی تھیں۔

ابن زبیر سپہ سالار کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔

شہزادی نے کہا۔

''کیا میں ابن زبیرؓ سے بات کر سکتی ہوں؟''

''میری طرف سے اجازت ہے شہزادی۔'' سپہ سالار نے کہا۔

شہزادی نے فوراً ابن زبیرؓ کو مخاطب کیا۔

''اے بہادر ابن زبیر!...... جب تم نے میرے باپ شاہ جرجیر کا سر قلم کیا۔ اس وقت تم نے کیا محسوس کیا۔ کیا سوچا تھا تم نے؟''

ابن زبیرؓ متانت سے گویا ہوئے۔

''جب میں میدان جنگ میں گھوڑا اڑاتا ہوں تو صرف ایک آواز میرے گرد گردش کرتی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی کہہ رہا ہو............'' ہم وہ نہیں جن کا خون ایڑیوں میں بہے بلکہ ہم وہ ہیں جن کا خون پیروں پر بہتا ہے۔ تم مجھے دیکھ لو کہ مجھے تمام زخم سامنے سے لگے ہیں۔ میں نے اپنی پشت پر کوئی زخم نہیں کھایا۔''

''اس جنگ کے دوران کوئی اور خیال آیا ہوگا؟'' شہزادی نے جرح کی۔

ابن ابی سرحؓ شہزادی کے اس سوال کی تہہ تک پہنچ گئے۔ وہ مسکرائے اور بولے۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کے دل میں کوئی اور خیال نہ آیا

ہوگا۔'' اس کے فوراً بعد وہ بولے۔

''ہم اعلان کے مطابق شہزادی فلپائن کو ابن زبیرؓ کی کنیزی میں دیتے ہیں۔''

شہزادی نے حیا سے گردن جھکالی، اس کے چہرے پر شفق رنگ پھوٹ پڑے اور اس کے دل کے گلاب کھل گئے کہ یہی اس کی خواہش تھی۔

شہزادی فلپائن نے اسلام قبول کرلیا۔ ابن زبیرؓ کے حسن سلوک اور پیار و محبت کے بدلے میں اس نے بھی ابن زبیرؓ کو ٹوٹ کر چاہا اور دونوں کی محبت ایک مثالی محبت بنی۔ شہزادی فلپائن نے بڑا مرتبہ پایا اور تاریخ میں امر ہوئی۔

❁

سبز گنبد کے سائے میں

سبز گنبد کے سائے تلے قاری اویس قادری کی ۲۰۰ سے ذائد مشہور حمد یہ نعتیہ کلام کا مجوعہ ہے جو انہوں نے ٹی وی، ریڈیو اور نعتیہ مشاعرے میں پڑھی۔ اس نعتیہ مجموعے کو جناب غلام مجتبیٰ قادری نے ترتیب دیا ہے اور اس میں قاری اویس قادری کی بہت سے مشہور و معروف نعتیں موجود ہیں جیسے اللہ ہو اللہ ہو، گناہوں کی عادت چھڑا میرے مولا، کوئی تو ہے جو نظامِ ہستی چلا رہا ہے، اللہ کرم اللہ اللہ، یا رسول اللہ تیرے در کی فضاؤں کو سلام، میں مدینہ چلا، در پہ بلاؤ مکی مدنی، آیا ہے بلاوا مجھے دربارِ نبیؐ سے، تاجدارِ حرم ہو نگاہِ کرم، بھر دو جھولی میری یا محمدؐ، نوری محفل پر چادر تنی نور کی، جشن آمد رسولؐ، سرور کہوں کہ مالک و مولا کہوں تجھے، آسماں گر تیرے تلووں کا نظارہ کرتا، حضورؐ ایسا کوئی انتظام ہو جائے، تمہارا نام مصیبت میں جب لیا ہوگا، سبز گنبد کے سائے میں گھر چاہیے، میں تو پنجتن کا غلام ہوں، منقبیات بحضور غوث اعظمؒ، شاہِ مرداں شیرِ یزداں، شکریہ آپ کا بغداد بلایا یا غوث اعظمؒ، سلطان اولیاء کو ہمارا سلام، سیدؓ نے کربلا میں وعدے نبھادیے، سرکار غوث اعظمؒ، سلطان کربلا کو ہمارا سلام، سن لوائے پیروں کے پیر، جیے شاہ نورانی، کلام صلاۃ و سلام، کلام میاں محمد بخشؒ، کلام حضرت سلطان باہوؒ، مصطفیٰؐ جانِ رحمت پہ لاکھوں سلام، یا نبیؐ سلام علیک یا رسولؐ اللہ سلام علیک، اے بیابانِ عرب تیری بہاروں کو سلام۔ **سبز گنبد کے سائے میں** کتاب گھر پر دستیاب ہے جسے **شاعری حمد و نعت** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

سلطنتِ بیگم......ایک تعارف

ایک ایسی الھڑ دوشیزہ کی داستان جو اپنے حسن و رعنائی میں نہ صرف لاہور بلکہ پورے برصغیر میں مشہور تھی جو لاہور کے گورنر اور قلعہ دار معین الملک کی اکلوتی صاحب زادی تھی جس کی قربت کی خواہش اس دور کے بڑے بڑے افیسران مغل سلطنت کرتے تھے لیکن اس کا باپ اس کو ہر ایک کی بُری نظر سے بچا کر رکھتا تھا لیکن کب تک؟ بالآخر اسے تقدیر کے ان دیکھے ہاتھوں کے آگے مجبور ہونا پڑا اور اپنی بیٹی کی منگنی آصف خان گورنر دکن کے بیٹے غازی الدین سے بہ مصلحت ہائے سیاست و اقتدار کرنا پڑی۔

غازی الدین جو ایک سولہ سالہ حسین لڑکا تھا لیکن رومانس کی بھول بھلیوں سے ناواقف مگر سیاست کی بساط شطرنج کا ایک ہوشیار اور پُرفریب مہرہ تھا جو سیاسی بساط پر اپنے تیر چلانے کا فن تو جانتا تھا لیکن وہ پیار اور محبت کی شطرنج اور اس کی بازی سے قطعی ناواقف تھا اس کے نزدیک اس الھڑ حسینہ سلطنت بیگم سے رشتہ ناطہ بھی اس کی اقتدار کی سیڑھی کے لئے ایک زینہ تھا اور جس زینہ پر چڑھ کر ہی دہلی مغل بادشاہ کے دربار میں اعلیٰ سے اعلیٰ مقام حاصل کر سکتا تھا دوسری جانب سلطنت بیگم جیسی الھڑ اور نوخیز حسینہ جس کے من میں نہ جانے کون کون سے رومان محبت و عشق چھپے ہوئے تھے اس طرزِ عمل اور ناگہانی منگنی سے مرجھا کر رہ گئی اس کا خیال تھا کہ اس کا ہونے والا شوہر اس کی دلداری اور اس کے حسن کے ناز نخرے اٹھانے والا ہوگا لیکن باوجود سخت پردے کے ان کے درمیان ہونے والی چند ملاقاتوں سے اس نے اندازہ لگا لیا کہ یہ تو بنجر زمین عشق ہے یہاں عشق کا پودا پروان نہیں چڑھ سکتا اس لئے وہ زہر کا گھونٹ پی کر اپنی قسمت پر صابر و شاکر بن گئی اور اس نے اپنے تمام ارمانوں کو گلا گھونٹ لیا۔

دوسری جانب غازی الدین مختلف سازشوں اور دھوکہ بازیوں سے مغل بادشاہ احمد شاہ کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور دربار دہلی میں اپنا اچھا خاصا اثر رسوخ قائم کر لیا اور پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ برائے نام بادشاہ سلطنت بھی بن گیا ایسے میں اسے اپنی منگیتر سلطنت بیگم کا خیال آیا اور ساتھ ہی قلعہ لاہور پر قبضہ جمانے کا جس پر اس دور میں احمد شاہ ابدالی والی افغانستان قبضہ جما چکا تھا اس نے ایک سازش کے ذریعہ اپنی افواج لاہور بھیجیں اور ساتھ ہی چالاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے اپنی منگیتر سے اپنی شادی کا پیغام بھی بھیج دیا اس دور میں قلعہ لاہور کی گورنر اس کی محروم بہن خالہ بیگم تھیں اس نے اہالیان اور قائدین شہر کے مشورے سے اپنی بیٹی سلطنت بیگم کو دلہن بنا کر غازی الدین کے پاس دہلی بھیج دیا جیسے ہی سلطنت بیگم دہلی روانہ ہوئی تو غازی الدین کی فوجوں نے لاہور پر دھوکہ سے قبضہ جما لیا اور خالہ بیگم کو بھی گرفتار کر کے پا بجولاں دہلی روانہ کر دیا۔

غازی الدین نے بجائے اپنی بیوی سلطنت بیگم کے استقبال کے اس کو فوری طور پر زنداں میں قید کر دیا اور اپنی ساس کے دہلی پہنچتے پر اسے بھی بیٹی کے ساتھ زنداں میں پہنچا دیا۔ یہیں سے اس کی بدبختی کا دور شروع ہوا احمد شاہ ابدالی قلعہ لاہور پر اس کے قبضے کی خبر سن کر آندھی اور طوفان کی طرح آیا اور لاہور کو روندتا ہوا سیدھا دہلی پہنچا غازی الدین نے جب یہ دیکھا کہ وہ دہلی کو نہیں بچا سکتا تو وہ سیدھا زنداں میں پہنچا اور ماں بیٹی سے معافی مانگ کر ان کو اپنے ہمراہ لے جانے پر راضی کر لیا اور ان کو اپنے ہمراہ لے کر دہلی سے نہ معلوم منزل کی جانب بھاگ گیا اس الھڑ اور حسین دوشیزہ کا کیا حال ہوا؟ کیا اسے اپنا رومانس مل سکا یا وہ بدستور ارمانوں کا گلا گھونٹے احساسِ محرومی میں جھلستی رہی تاریخ اس بارے میں مزید انکشاف کرنے سے قاصر ہے۔

☆ ☆ ☆

سلطنت بیگم

لاہور کا قلعہ مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔شاہی زمانے میں رشتے ناطے بھی سیاسی مصلحتوں کی ڈوری سے بندھے ہوتے تھے۔جنوبی ہند کا صوبیدار آصف جاہ بڑا جلیل القدر سردار تھا۔اس نے پنجاب کے صوبیدار کی بیٹی کا رشتہ اپنے پوتے کیلئے مانگا تھا۔سلطنت بیگم پنجاب کے صوبیدار معین الملک کی پری صورت اور فرشتہ صفت لڑکی تھی۔سلطنت بیگم کی سب سے بڑی خوبصورتی یہ تھی کہ وہ ایک ایسے خطہ ارض کے محافظ کی بیٹی تھی جس خطے سے گزرے بغیر کوئی بیرونی حملہ آور ہند میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔معین الملک کی شہرت کا راز بھی اسی نکتے میں پنہاں تھا۔

قلعہ میں جمع ہونے والے مہمان معین الملک نے بلائے تھے۔اصل مہمان تو دہلی سے آرہے تھے جو لاہور میں داخل ہونے کے بعد اب قلعہ کی طرف جلوس کی شکل میں رواں تھے۔صوبیدار آصف خاں جنوبی ہند میں مقیم تھا لیکن اس کا بیٹا اور پوتا مغل دربار میں حاضر رہتے تھے۔لاہور آنے والا جلوس دراصل دہلی سے منگنی کا سامان لایا تھا تا کہ دلہن کو منگنی کا جوڑا پہنا کر رشتہ پکا کرلیا جائے۔

شہزادی سلطنت بیگم ایک نامعلوم خوف سے دبکی جارہی تھی۔اس نے ابھی ۱۴ سال میں بھی قدم نہ رکھا تھا۔ابھی تو اس کے کھیلنے کھانے کے دن تھے مگر صوبیدار آصف جاہ اپنے پوتے غازی الدین کا رشتہ سلطنت بیگم سے کر کے جنوبی بھارت اور پنجاب میں اخوت اور محبت کی ایک نئی مثال قائم کرنا چاہتا تھا۔ہوسکتا ہے اس میں اس کا کوئی سیاسی مفاد بھی پوشیدہ ہو لیکن اس کا انتظام اور اہتمام اس انداز سے کیا جارہا تھا کہ یہ ایک قومی خدمت محسوس ہونے لگی تھی۔

سلطنت بیگم کو سہیلیاں اور کنیزیں گھیرے ہوئے تھیں اور طرح طرح کی چھیڑ خانیاں کررہی تھیں۔اس کے اردگرد سہیلیوں کا شور وغوغا تھا۔وہ بیچاری ایک کونے میں دبکی اپنی ماں کی بات پر غور کررہی تھی۔ماں نے کہا تھا کہ سلطنت، سسرال کی عورتیں دیکھنے آرہی ہیں ادب اور سلیقہ کا خیال رکھنا۔

ادھر سلطنت پریشان تھی کہ وہ ان عورتوں سے کیا گفتگو کرے گی جنہیں اس نے اس سے پہلے دیکھا ہی نہ تھا۔پھر یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ کیا سوال کریں گی اور اسے کیا جواب دینا ہوگا۔یہی سوچ سوچ کے سلطنت کو پسینے آرہے تھے اور وہ اپنے زرنگار جوڑے میں سہمی جارہی تھی۔اسے دلہنوں والا جوڑا پہنایا گیا تھا مگر سہیلیوں نے چٹکیاں بھر بھر کر کپڑوں کا ستیاناس کردیا تھا۔

اسی وقت سلطنت بیگم کی سب سے پیاری سہیلی پشت کی کھڑکی پھاند کر اندر آگئی۔شامہ کو دیکھ کر سلطنت کو بڑا اطمینان ہوا۔شامہ ابھی سلطنت بیگم کے پاس آکر بیٹھی ہی تھی کہ ایک بارعب خاتون، چھ سال کے بچے کا ہاتھ پکڑے کمرے میں داخل ہوئیں۔انہیں دیکھتے ہی سب کے لبوں پر مہر لگ گئی۔ایسی خاموشی طاری ہوئی جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔کنیزیں ادب سے کھڑی ہوگئیں۔شامہ نے جلدی سے اٹھ کر سلطنت کا

دوپٹہ اٹھایا جو چھیڑ چھاڑ اور کھینچا تانی میں سر سے دور ہو گیا تھا۔ وہ دوپٹہ اُڑھانے کیلئے آگے بڑھی۔

''رہنے دو شامہ!''

خاتون کی آواز ابھری۔

شامہ کے قدم جہاں تھے وہیں رک گئے۔ اس پر خالہ بیگم کا خوف طاری ہو گیا۔ آنے والی خاتون جو پورے قلعہ میں خالہ بیگم کے نام سے مشہور تھیں۔ امیر زادی سلطنت النساء بیگم کی والدہ محترمہ تھیں۔ منگنی کے جلوس کی اطلاع پا کر وہ بیٹی کو دیکھنے کیلئے آئی تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ مشاقاؤں اور کنیزوں نے سلطنت بیگم کو پوری طرح سجا دیا ہوگا مگر یہاں تو نقشہ ہی الٹا تھا۔ سلطنت بیگم کو واقعی سجایا بنایا گیا تھا لیکن جب ایک ساتھ اتنی سہیلیاں اور کنیزیں جونک کی طرح چمٹ جائیں تو بناؤ سنگھار کہاں رہ سکتا تھا۔ سلطنت کے رخساروں سے تو غازہ تک بہہ گیا تھا۔

''شامہ! سلطنت کو دوبارہ تیار کرو مگر جلدی..... وہ لوگ قلعہ تک پہنچ چکے ہیں۔''

خالہ بیگم نے نہ تو کسی سے باز پرس کی اور نہ ہی کسی کی سرزنش کی۔ ایسے موقعوں پر ایسی بے اعتدالیاں تو ہو ہی جاتی ہیں۔ وہ مسکراتی ہوئی واپس ہوئیں تو سب کی جان میں جان آئی۔

''خالہ بیگم کتنی اچھی ہیں۔''

شامہ نے اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا۔

تیری چوٹی پکڑی جاتی تو معلوم ہوتا۔ سلطنت نے مصنوعی غصہ سے شامہ کو دیکھا۔ پھر اپنے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''کم بختوں نے کیا حال بنا دیا ہے میرا''

شامہ اسے دوسرے کمرے میں لے گئی۔ نیا جوڑا نکال کر لائی۔ سنگھار کرنے والیوں کو بلوایا اور سلطنت کو دوبارہ دلہن بنانے میں مصروف ہو گئی۔ ڈھول کی سریلی آوازیں آ رہی تھیں۔

پہلے مسلم گھرانوں میں رواج تھا کہ جب کسی لڑکی کا رشتہ مانگا جاتا تھا تو لڑکے والوں کی طرف سے لڑکی کے گھر ''رقعہ'' بھیجا جاتا تھا۔ رقعہ سرخ رنگ کا چھپا ہوا ایک پھولدار کاغذ ہوتا تھا جس میں شناختی کارڈ کی طرح نام، ولدیت، عمر، پیشہ اور دیگر خاندانی کوائف کی تفصیل درج ہوتی تھی۔ رقعہ میں یہ کوائف لڑکے کا باپ یا کوئی بزرگ بھر دیتا تھا۔ پھر اس رقعہ کو نائی یا ناون کے ہاتھ لڑکی کے گھر بھیجا جاتا تھا۔ لڑکی والے درج شدہ کوائف کی اپنے طور پر تصدیق کرتے تھے اور اگر رشتہ پسند آ جاتا تھا تو لڑکے والوں کو آگاہ کر دیا جاتا تھا۔ اس کے بعد ہی منگنی، عقد اور رخصتی سمیت دوسری رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔

سلطنت بیگم کے رشتہ کا رقعہ دکن حیدرآباد کے گورنر نظام الملک آصف جاہ صوبیدار دکن نے بھیجا تھا جس میں اس نے سلطنت بیگم کا رشتہ اپنے پوتے غازی الدین کیلئے مانگا تھا۔ غازی الدین کی عمر اس وقت مشکل سے سولہ سال تھی۔ لیکن یہ نوعمر لڑکا بلا کا ذہین اور فطین تھا۔ مقرر تو ایسا شعلہ بیان تھا کہ جس محفل میں بولتا تھا پوری محفل اس کی ہمنوا ہو جاتی تھی۔ دادا نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہو کر عظمت و وقار حاصل کرے گا۔ اس لئے

ان کی خواہش تھی کہ جوانی کے آتے ہوئے سیلاب پر بند باندھ دیں اور اس کی شادی کسی اعلیٰ خاندان میں اپنی ہی زندگی میں کر جائیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب مغل بادشاہ محمد شاہ جسے اس کی بعض ناشائستہ حرکتوں کی وجہ سے "رنگیلا بادشاہ" کہا جاتا تھا۔ اس کے دور میں نادر شاہ درانی نے برصغیر پر حملہ کیا اور دہلی میں لوٹ مار کے علاوہ قتل عام بھی ہوا تھا۔ نادر شاہ تو مال و دولت اور تخت طاؤس لے کر اور دہلی میں لوٹ مار کر کے افغانستان واپس چلا گیا تھا لیکن اس کے انتقال کے کچھ ہی دنوں کے بعد احمد شاہ ابدالی اس کا جانشین ہوا۔ احمد شاہ ابدالی برصغیر پر حملہ کے وقت نادر شاہ کے ساتھ تھا۔ دہلی کی ابتری اور مال و زر کی فراوانی اس کے ذہن میں موجود تھی۔ پس حکومت سنبھالتے ہی وہ برصغیر پر حملہ کرنے کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔ پنجاب کی گورنری سلطنت النساء کے باپ معین الملک کے پاس تھی۔ وہ بڑا غیور، بہادر، بیدار مغز مغل تھا۔ احمد شاہ ابدالی کی نیت بھانپتے ہی اس نے دہلی کے دربار سے مدد طلب کی۔ محمد شاہ باوجود اپنی عیش کوشیوں کے اپنے گورنر کی مدد پر فوراً آمادہ ہو گیا۔

اس نے اپنے وزیر قمر الدین اور دکن کے گورنر آصف جاہ کی سرکردگی میں معین الملک کو کمک روانہ کر دی۔ لشکر کے ساتھ اس نے ولی عہد شہزادے احمد شاہ کو بھی بھیج دیا تا کہ فوج کے حوصلے بلند رہیں۔ ادھر احمد شاہ ابدالی فوج لے کر افغانستان سے نکلا۔ پنجاب کے گورنر معین الملک نے اپنے لشکر کے ساتھ سرہند پہنچ کر اس کا راستہ روک لیا۔ بڑا زبردست رن پڑا۔ معین الملک نے اپنے لشکر کو اتنی مہارت سے لڑوایا کہ احمد شاہ ابدالی کی ایک نہ چلی اور اسے شکست کھا کر افغانستان واپس جانا پڑا۔ دہلی میں اس فتح پر خوب جشن منایا گیا۔ محمد شاہ نے اس خوشی میں معین الملک کو پنجاب کی گورنری کا دائمی پروانہ عطا کر دیا۔

آصف جاہ اور معین الملک کی ملاقات اسی دوران ہوئی تھی۔ پھر یہ ملاقات دوستی میں بدل گئی اور دونوں دربار دہلی کے صوبیدار تھے۔ یہ دونوں صوبے سلطنت دہلی میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ امیروں اور صوبیداروں میں گروہ بندیاں تھیں۔ دونوں اپنا اثر و رسوخ بڑھانا چاہتے تھے وہ جلد ہی شیر و شکر ہو گئے۔ آصف جاہ کو معلوم ہوا کہ معین الملک کی کمسن لڑکی اور صرف ایک کم سن لڑکا ہے تو اس نے تعلقات بڑھانے کیلئے اپنے پوتے کا پیغام معین الملک کی لڑکی سلطنت النساء بیگم کیلئے دیا۔ سلطنت بیگم کم عمر تھی۔ معین الملک نے یہی عذر پیش کیا لیکن آصف جاہ اتنے اہم صوبیدار کے تعاون کیلئے بے چین تھا۔ اس نے اس کا حل یہ پیش کیا کہ فی الحال منگنی کر دی جائے۔ نکاح و رخصتی دو چار سال کے بعد ہو جائے گی۔ رشتہ اچھا تھا اس لئے معین الملک نے اپنی بیوی سے مشورے کے بعد حامی بھر لی۔ آصف جاہ نے دہلی پہنچ کر رشتہ کا رقعہ اور منگنی کا سامان لاہور روانہ کر دیا۔ لاہور پہنچنے والا جلوس اسی نسبت کا شاخسانہ تھا۔

معین الملک نے دہلی سے آنے والوں کا استقبال قلعہ کے دروازے پر کیا۔ ان کے ساتھ عمائدین سلطنت اور شہر کے شرفاء تھے۔ جلوس کی قیادت آصف جاہ کے پانچ نائب صدور کر رہے تھے۔ شہنشاہ محمد شاہ نے بھی اس رشتے پر اظہار خوشنودی کیا تھا اور خواجہ سرا خدمت گار خاں شہنشاہ کی نمائندگی کر رہا تھا۔ محمد شاہ نے امیر زادی کیلئے ہیرے کی انگوٹھی اور ایک عروسی جوڑا بھیجا تھا۔ ان درباری معززین کے پیچھے ستر گھوڑوں پر منگنی کا سامان لدا ہوا تھا۔ گھوڑوں کو چاندی کا ساز پہنایا گیا تھا اور ان پر زرنگار ریشمی جھولیں پڑی تھیں۔ ان گھوڑوں کے آگے آگے آصف جاہ کا بھیجا ہوا نائی زرق برق کپڑے پہنے چل رہا تھا۔

مہمان گھوڑوں سے اترے۔ معین الملک بڑھ کے ہر ایک سے بغلگیر ہوا۔ دعا سلام اور مزاج پرسی کے بعد یہ لوگ شیش محل میں آئے۔ وہی شیش محل جس میں جلیل القدر شاہان مغلیہ اکثر دربار لگایا کرتے تھے۔ اب یہ قلعہ اور دربار پنجاب کے گورنر کے سپرد تھا۔ شہنشاہ دہلی کا سکہ تو اس وقت بھی برصغیر میں چلتا تھا لیکن سلطنت صرف دہلی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ شیش محل میں مہمانوں کی میووں اور مشروبات سے تواضع کی گئی۔ پھر نائی کو رقعہ پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔ نائی ایک آبنوسی صندوقچی لے کر معین الملک کے سامنے پہنچا اور صندوقچی کھول کر عطر میں بسا ہوا رقعہ نکالا اور پھر بڑے ادب کے ساتھ معین الملک کو دے دیا۔

معین الملک نے رقعہ لے کر پڑھا۔ کوائف سے تو وہ پہلے ہی واقف تھا۔ اس نے اپنی بیوی خالہ بیگم کی منظوری بھی پہلے ہی حاصل کر لی تھی۔ اب معین الملک اپنی جگہ پر کھڑا ہوا اور تمام حاضرین سے مخاطب ہو کر بولا۔

''معززین شہر اور اعلیٰ مرتبت مہمانانِ گرامی، مجھے نظام الملک آصف جاہ صوبیدار دکن کا رقعہ موصول ہوا۔ مندرجات اور دیگر کوائف کو پڑھا گیا۔ مجھے امیر زادے غازی الدین کا رشتہ اپنی دختر نیک اختر کیلئے منظور ہے۔ آپ لوگوں کی تشریف آوری کا شکریہ۔''

معین الملک کے اس اعلان کے ساتھ ہی مبارک باد کا غلغلہ بلند ہوا اور دہلی کے امراء اور وزراء نے معین الملک اور اس کے امیروں کو مبارک باد دی۔ دہلی والوں کے ساتھ ان کی بیگمات بھی آئی تھیں۔ کنیزوں نے بھاگ کر زنان خانے میں اطلاع پہنچائی اور وہاں بھی ہر طرف مبارک باد کے ڈونگرے برسنے لگے۔ سلطنت بیگم کو رونمائی کے لیے محفل میں لایا گیا تو دہلی کی بیگمات اس کا رنگ وروپ دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ سلطنت بیگم چاند کا ٹکڑا معلوم ہوتی تھیں۔ چنانچہ کم سن خوبصورت دلہن کو سب نے ہی پسند کیا۔

منگنی کی رسم کے لیے سلطنت بیگم کو دہلی کا لایا ہوا جوڑا پہنایا گیا اور مغل شہنشاہ محمد شاہ کی انگوٹھی اس کی انگلی میں ڈالی گئی۔ اس طرح چار روز تک خوب مہمانداری ہوئی اور پھر واپسی کا دن آیا اور معین الملک نے مہمانوں کو بیش بہا تحفے پیش کئے۔ جب تک مہمان قلعہ میں مقیم رہے قلعہ میں ہر رات چراغاں ہوتا تھا اور ہر وقت جشن جیسا سماں رہتا تھا۔

☆

محبت کا حصار

خواتین کی مقبول مصنفہ **نگہت عبداللہ** کے خوبصورت افسانوں کا مجموعہ **محبت کا حصار**، جلد کتاب گھر پر آرہا ہے۔ اس مجموعہ میں انکے چار ناولٹ (تمہارے لیے تمہاری وہ، جلاتے چلو چراغ، ایسی بھی قربتیں رہیں اور محبتوں کے ہی درمیاں) شامل ہیں۔ یہ مجموعہ کتاب گھر پر **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اس رشتہ کی جواں عمر غازی الدین نے مخالفت کی تھی مگر آصف جاہ نے اسے سمجھایا کہ آگے چل کر یہ رشتہ اس کیلئے بہت مفید ثابت ہوگا کیونکہ معین الملک کا لڑکا ابھی بہت چھوٹا ہے اور بہت ممکن ہے کہ معین الملک کے بعد اس کو پنجاب کی صوبیداری مل جائے۔

غازی الدین کی اس وقت کوئی حیثیت نہ تھی وہ اپنے باپ کے ساتھ دہلی میں عام لوگوں کی طرح مقیم تھا۔ اس کا باپ شہاب الدین دہلی دربار میں آصف جاہ کی نیابت کرتا تھا۔ دادا کے سمجھانے پر اس وقت تو غازی الدین خاموش رہا لیکن پنجاب کی صوبیداری اس کے دماغ میں بیٹھ گئی اور اس نے بڑے بڑے منصوبے بنانے شروع کر دیئے اور جوڑ توڑ میں لگ گیا۔

غازی الدین کہنے کو بچہ تھا لیکن تھا آفت کا پرکالہ۔ جب عمائدین سلطنت اور امراء میں اس کی دال نہ گلی تو اس نے شہریوں سے میل ملاپ شروع کر دیا۔ وہ جس معزز شہری کے پاس جاتا تھا وہ اسے سر پر بٹھاتا تھا۔ اس طرح غازی الدین کی شہریوں سے اچھی صاحب سلامت ہوگئی۔ دوسری ترکیب اس نے یہ کی کہ علماء کی محفلوں میں حاضری دینے لگا۔ وہ پڑھا لکھا اور ذہین تھا۔ علماء کو اس میں جوہر قابل نظر آیا۔ پس انہوں نے بھی اس پر توجہ دی۔

اس طرح غازی الدین کو علماء کی محفلوں میں بولنے اور تقریر کرنے کا موقع مل گیا۔ وہ مذہبی مسائل پر تقریر کرتا تو علماء گوش بر آواز ہو جاتے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے۔ رفتہ رفتہ اس نے علماء کے دل میں جگہ پیدا کر لی اور بہت جلد علماء اور شہریوں کی نظروں میں چڑھ گیا۔

غازی الدین کی منگیتر امیر زادی سلطنت النساء بیگم لاہور کے قلعہ میں ایک ایک دن گن رہی تھی۔ لڑکی خواہ کتنی ہی کم عمر کیوں نہ ہو جب اس کی منگنی ہو جائے تو وہ خود کو جوان سمجھنے لگتی ہے اور منگیتر کو اپنا سرتاج اور شوہر سمجھ بیٹھتی ہے۔ یہی حال سلطنت بیگم کا تھا۔ پھر غضب یہ ہوا کہ منگنی کے چوتھے مہینے وہ ۱۴ سال میں لگ گئی۔ کنیزوں اور سہیلیوں نے جشن کا ڈول ڈالا تو سلطنت بیگم فوراً راضی ہوگئی۔ شامہ نے اسے سمجھا بجھا کر خالہ بیگم کے پاس بھیجا تا کہ جشن کی اجازت مانگے۔

سہیلیوں کے کہنے سننے سے سلطنت بیگم اپنی ماں کے پاس آ تو گئی لیکن اس کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی اور سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ خیالات آگے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ وہ منگنی کا جلوس، ہائے اللہ! وہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا اور وہ...... کیا نام ہے ان کا؟ غازی الدین۔ شامہ نے بتایا تھا کہ وہ بہت پڑھے لکھے اور خوبصورت...........۔

کون خوبصورت؟ خالہ بیگم نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑا۔ سلطنت بیگم جب خیالوں میں گم تھی اس کی زبان سے لفظ خوبصورت کچھ اس طرح پھسل گیا تھا کہ اس کی آواز خالہ بیگم تک پہنچ گئی تھی۔ خالہ بیگم دیر سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہی تھیں۔ خوبصورت کے لفظ پر وہ بھی چونک گئیں اور سلطنت کو ندامت کا پسینہ آ گیا۔

خالہ بیگم......وہ...........وہ...........دہلی...........اس نے بات بنانے کی کوشش کی مگر بات بنی نہیں۔

''وہ دہلی والا غازی الدین؟''

خالہ بیگم مسکرائیں۔

''ہاں وہ خوبصورت ہے۔لوگ بھی یہی کہتے ہیں۔''

اب تو سلطنت اور بھی زمین میں گڑ گئی اور بڑی مشکل سے صفائی پیش کرتے ہوئے بولی۔

''خالہ بیگم! میں انہیں نہیں کہہ رہی تھی۔''

تو پھر کسے کہہ رہی تھی؟ خالہ بیگم نے مصنوعی غصہ سے پوچھا۔ پھر قدرے توقف کے بعد نرم لہجے میں بولیں۔

''میں نے تیرے باپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ غازی الدین کے باپ اور دادا کو اطلاع کرو کہ منگنی کی ہے تو اب نکاح کر کے رخصت کرالے جائیں۔ مجھ سے نہیں سنبھالی جاتی پرائی امانت۔ مگر تیرے باپ تو کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھ گئے ہیں جب زور دو تو وقار اور انا کا رونا رونے لگتے ہیں۔''

سلطنت اماں کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ جو کچھ اس کے دل میں تھا وہی بات تو خالہ بیگم نے کہہ دی تھی۔ وہ دل میں شرمندہ ہوگئی کہ بلاوجہ ماں کے پاس آ گئی۔ ماں کو تو اس کا پہلے ہی خیال تھا اور وہ اس سلسلے میں معین الملک سے بات بھی کر چکی تھیں۔ سلطنت اٹھی اور خاموشی سے دروازے کی طرف چلی۔ خالہ بیگم نے اسے تعجب سے دیکھا۔

''کہاں چلی سلطنت؟ ماں سے خفا ہوگئی ہے؟''

''نہیں خالہ بیگم'' سلطنت نے قدرے رک کے جواب دیا۔

''کیا تو یہی کہنے آئی تھی''

خالہ بیگم نے محبت سے پوچھا۔ پھر کہا:

''دل چھوٹا نہ کر۔ میں تیرے باپ کو پھر سمجھاؤں گی۔''

سلطنت اپنی ماں کی ممتا سے بہت متاثر ہوئی اور واپس آ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔ اسے پھر یاد آیا کہ وہ تو جشن کی اجازت مانگنے آئی تھی مگر یہاں تو کوئی اور بات چھڑ گئی۔

''خالہ بیگم!'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''جو بات آپ نے کہی ہے اس کا تو مجھے وہم و گمان نہ تھا۔ میں تو یہ پوچھنے آئی تھی کہ شامہ کہہ رہی تھی اب میں......''

سلطنت کہتے کہتے شرما گئی۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اب میں چودہ سال کی ہوگئی ہوں۔ لیکن الفاظ نے اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ چپ ہوگئی۔

''ہاں بیٹی بتاؤ ناں!......شامہ کیا کہہ رہی تھی۔''

خالہ بیگم نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔ شامہ بڑی اچھی بچی ہے وہ جو بات بھی کہے گی اس میں تیری بھلائی ہوگی۔ ذرا میں بھی تو سنوں کہ اس نے کیا کہا ہے۔؟

''وہ......... کہہ رہی تھی کی سالگرہ کا جشن منایا جائے۔'' سلطنت نے دوپٹے کا پلو انگلی میں لپیٹتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک کہہ رہی تھی شامہ۔''

خالہ بیگم خوش ہوکر بولیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تو چودہ سال میں لگ گئی ہے اور میں نے یہی بات تیرے باپ سے بھی کی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ افغانستان کا بادشاہ احمد شاہ ابدالی اپنی شکست کا بدلہ لینے کی تیاری کر رہا ہے اور کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے۔

''ٹھیک ہے خالہ بیگم!......''

سلطنت کو بھی موقع کی نزاکت کا احساس ہوگیا۔

''ابا حضور درست فرماتے ہیں جنگ کے بادل سر پر چھائے ہوں تو کچھ بھی اچھا نہیں لگتا۔''

''نہیں سلطنت۔'' خالہ بیگم بڑے عزم سے بولیں۔

''سالگرہ ہر سال ہوتی ہے اس کا ناغہ نہیں کیا جاسکتا۔ سالگرہ ضرور ہوگی مگر زیادہ دھوم دھڑ کا نہیں ہوگا۔''

''ٹھیک ہے خالہ بیگم! میں شامہ کو سمجھالوں گی۔'' سلطنت جلدی سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔

سلطنت باہر پہنچی تو اس کا سامنا معین الملک سے ہوگیا۔ اس نے جھک کر سلام کیا تو معین الملک نے مسکرا کر پوچھا

''کہاں سے آرہی ہے ہماری بیٹی؟''

''خالہ بیگم کے پاس گئی تھی ابا حضور!''

سلطنت نے جواب دیا۔

''کبھی باپ کے پاس بھی آجایا کرو۔''

معین الدین گویا ہوئے۔

''آپ آج کل بہت مصروف ہیں نا۔''

سلطنت نے جواباً کہا اور پھر گھبرا گئی کہ اسے یہ نہیں کہنا چاہئے تھا۔ بات بنانے کو بولی۔:

''بس مجھے یونہی خیال ہوا تھا۔''

یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی سیڑھیاں اترنے لگی تاکہ باپ کو زیادہ سوال وجواب کا موقع نہ ملے۔

معین الملک تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے خالہ بیگم کے پاس پہنچے اور ذرا غصے سے بولے:

''بیگم تم بھی کمال کرتی ہو۔ بچوں سے ایسی باتیں نہیں کی جاتیں۔''

خالہ بیگم بھی چڑ چڑائی بیٹھی تھیں تنک کر بولیں۔

''کمال تو آپ بھی کرتے ہیں۔ بچوں کو اونچ نیچ نہ سمجھائی جائے تو وہ خود ہم سے ایسی بات کہہ دیں جو انہیں نہ کہنا چاہئے۔ آپ کی آنکھوں پر تو پٹی بندھی ہوئی ہے۔ پتہ بھی ہے کچھ سلطنت چودھویں سال میں لگ گئی ہے۔ اس کی زبان تو کھلنا ہی ہے۔''

معین الملک نے پریشان ہوکر بیوی کو دیکھا اور نرمی سے پوچھا:

''کیا سلطنت اپنی شادی کے بارے میں کہہ رہی تھی؟''

''کہنے کے معنی یہ تو نہیں ہے کہ لڑکی منہ پھوڑ کے کہے۔''

خالہ بیگم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''آخر ماں باپ کس مرض کی دوا ہیں۔ کیا ہمارا فرض نہیں ہے کہ ہم ان کے جذبات کا خیال رکھیں۔ میں تو کہتی ہوں کہ اس فرض سے جتنی جلدی ہو سکے سبکدوش ہو جائیں۔''

''مگر دیکھو نہ بیگم۔''

معین الملک نرمی سے گویا ہوئے۔

''ابھی تو لڑکا کچھ بھی نہیں ہے۔ حسب نسب اچھا ہے لیکن وہ خود کیا ہے۔ اسے کسی قابل تو ہونے دو۔''

''آصف جاہ کا پوتا ہے میرا داماد۔''

خالہ بیگم بڑی شان سے بولیں:

''یہ خاندان ہمیشہ سے دہلی دربار میں سرخرو اور صاحب حیثیت رہا ہے اور پھر امیر زادے کوئی نوکریاں تو نہیں کیا کرتے۔ اللہ رکھے اس کے باپ دادا دونوں زندہ ہیں۔ انہیں خود اس کی فکر ہوگی۔ اتنے بڑے خاندان کا بیٹا کوئی معمولی کام تو کرنے سے رہا۔ کوئی اچھا عہدہ حاصل کر لے گا۔''

''یہ سب ٹھیک ہے بیگم!'' معین الملک شکستہ آواز میں بولے۔

''لیکن میں نے آصف جاہ سے تین سال کی مہلت مانگ لی ہے۔ اب اگر انہیں لکھا تو وہ کیا سوچیں گے۔ اسے بھی چھوڑو۔ ذرا یہ افغانستان کا دھڑ کا ختم ہو جائے تو پھر............''

''چاہے لڑکی گھر بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو جائے اور آپ دھڑکے کو پکڑے بیٹھے رہیں۔''

خالہ بیگم نے برا سا منہ بنایا۔

اسی وقت ایک کنیز نے آ کر معین الملک کو اطلاع دی کہ دہلی سے قاصد آیا ہے اور فوراً ملنا چاہتا ہے۔

یہ خبر پا کر معین الملک فوراً باہر چلے گئے۔ قاصد کو طلب کیا۔ قاصد نے میر بخشی نظام الملک آصف جاہ کا خط پیش کیا۔ معین الملک نے لفافہ چاک کیا۔ خط مختصر تھا۔ معین الملک نے پڑھا اور سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ آصف جاہ نے لکھا تھا کہ

افسوس صد افسوس مغل سلطنت کا سب سے عظیم ستون وزیر اعظم قمر الدین انتقال کر گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

☆

۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) سلطنت مغلیہ کیلئے بہت منحوس ثابت ہوا۔ اس سال احمد شاہ ابدالی نے برصغیر پر حملہ کیا جسے پنجاب کے صوبیدار معین الملک کی بہادری اور حسن تدبیر سے پسپا کر دیا گیا۔ ابھی پنجاب پر احمد شاہ ابدالی کے دوسرے حملہ کا خطرہ منڈلا رہا تھا کہ وزیر سلطنت قمر الدین چل

ہے۔اس وقت مغل سلطنت کے تین ستون شاہ محمد شاہ، وزیر قمرالدین اور دکن کا صوبیدار نظام الملک آصف جاہ تھے۔

قمرالدین کی موت نے سلطنت مغلیہ کو ہلا کر رکھ دیا۔ تاجدار دہلی شاہ محمد شاہ اپنے وزیر باتدبیر کے مرنے سے اس قدر ملول اور دل گرفتہ ہوئے کہ ایک ماہ بھی نہ گزرا تھا کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا۔

تخت و تاج تو محمد شاہ کے بیٹے مجاہدالدین احمد شاہ کے ہاتھ آیا اور وزارت کا عہدہ اودھ کے صوبیدار صفدر جنگ کو دیا گیا۔ وزارت کا حق دکن کے صوبیدار آصف جاہ کو پہنچتا تھا کیونکہ اس نے مغل سلطنت کی بہت خدمت کی تھی۔ وہ محمد شاہ کی وفات کے وقت دہلی میں موجود نہ تھا اور عمائدین سلطنت اسے وزیر بنانا چاہتے تھے لیکن وہ اس جھگڑے سے دور رہا اور صفدر جنگ کو وزیر بنا کر چپ چاپ اپنے صوبہ دکن واپس چلا گیا۔

سلطنت کے دوستون پہلے ہی گر چکے تھے کہ ابھی سال بھر نہ ہوا تھا کہ آصف جاہ کا انتقال ہو گیا۔

آصف جاہ کا بیٹا شہاب الدین دہلی دربار میں اپنے باپ کی نیابت کر رہا تھا وہ فوراً دکن کی صوبیداری سنبھالنے دکن روانہ ہوا۔

شہاب الدین کے بیٹے غازی الدین کی عمر اس وقت سولہ سال تھی لیکن دہلی کے علماء اور شرفاء کا تعاون اسے حاصل تھا اس لئے اسے باپ کی جگہ مل گئی۔ غازی الدین بڑا مکار اور شاطر تھا۔ وہ دکن نہیں گیا اور اس نے کوشش کر کے دادا کا منصب ''میر بخشی'' حاصل کر لیا اور دہلی میں ہی رہنے لگا۔ میر بخشی کی حیثیت وزیر سلطنت جیسی تھی اور وزیر اعظم کے بعد یہ سب سے بڑا عہدہ تھا۔

دہلی کی بساط بالکل الٹ گئی تھی اور نئے نئے مہرے سامنے آ گئے تھے۔ لوگوں کو نئے بادشاہ مجاہدالدین احمد شاہ سے بڑی امیدیں تھیں کیونکہ مجاہدالدین احمد شاہ نے افغانستان کے حملہ آور احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت سرہند میں بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا تھا لیکن بادشاہ بنتے ہی اس نے چولا بدلا۔ محل میں ایسا گھستا کہ ہفتوں بلکہ مہینوں باہر نہ آتا۔ شراب اور شباب کو اس نے اپنا مشغلہ بنا لیا۔ اندر کی حکومت اس کی ماں ادھم بائی کے ہاتھ میں تھی اور باہر کے کاروبار سلطنت پر خواجہ سرا جاوید خدمت گار خان نے قبضہ کر لیا۔

ایسے حالات میں محلاتی سازشوں کو تو سر اٹھانا ہی تھا۔ وزیر اعظم اپنی وزارت مضبوط کرنے میں لگا رہا۔ غازی الدین کو اپنی میر بخشی کی پگڑی بچانی تھی۔ خواجہ سرا خدمتگار خاں اور ادھم بائی اپنے اپنے جوڑ توڑ میں لگے رہتے تھے اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی تدبیریں کرتے تھے۔ دہلی کے حالات ایسے نہ تھے کہ افغانستان کے احمد شاہ ابدالی کو اس کی خبر نہ ہوتی۔ وہ اپنی شکست کا بدلہ لینے کیلئے دن رات تیاریاں کر رہا تھا۔ اسے دہلی تک پہنچنے کیلئے پنجاب کا علاقہ پار کرنا تھا جہاں شیر دل معین الملک صوبیدار پنجاب کیل کانٹے سے لیس تیار تھا۔ اس نے احتیاط کے طور پر ایک قاصد کو دہلی بھیجا اور احمد شاہ ابدالی کے ارادے سے دہلی دربار کو آگاہ کیا لیکن دربار کے حالات اس قدر ابتر تھے کہ قاصد کو تاجدار دہلی تک پہنچنے کا موقع ہی نہ ملا۔ قاصد نے سب سے پہلے وزیر اعظم صفدر جنگ سے ملاقات کی اور معین الملک کا خط پیش کیا۔

صفدر جنگ خط پڑھ کر سوچ میں پڑ گیا۔ دربار میں محلاتی سازشوں کے علاوہ ایرانی اور تورانی کا سوال بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ صفدر جنگ ایرانی تھا اور معین الملک تورانی۔ دونوں میں بظاہر کوئی اختلافات نہیں تھے لیکن نظریاتی ٹکراؤ ضرور تھا۔ صفدر جنگ یہ تو نہ چاہتا تھا کہ پنجاب پر ابدالیوں کا قبضہ ہو لیکن پنجاب جیسے ایک اہم صوبہ پر اسے ایک تورانی کی صوبیداری بھی پسند نہ تھی۔

صفدر جنگ کئی روز تک اس تذبذب میں رہااور پھر بادل نخواستہ اس نے شاہ دہلی سے ملاقات کا ارادہ کیا تا کہ اسے پنجاب پر متوقع حملہ سے باخبر کر کے معین الملک کو کمک روانہ کرے۔ اس نے قاصد کو ساتھ لیا اور قلعہ جا پہنچا۔

بادشاہ وقت احمد شاہ سے ملاقات کے خواہشمندوں کو کئی کئی منزلیں طے کرنا پڑتی تھیں۔ پہلے میر بخشی غازی الدین کو مطمئن کرنا ہوتا تھا کیونکہ قلعہ کا تمام انتظام وانصرام اس کے سپرد تھا۔ صفدر جنگ کو غازی الدین سے خدا واسطے کا بیر تھا کیونکہ غازی الدین آصف جاہ کا پوتا تھا اور دکن کے امراء اسے مغل سلطنت کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ غازی الدین بھی صفدر جنگ سے کدورت رکھتا تھا اور اسے وزیراعظم کے عہدہ پر ایک ایرانی کا تقرر ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

جب دونوں کی ملاقات ہوئی تو دونوں ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے ہوئے تھے۔ جس وقت غازی الدین، صفدر جنگ سے گفتگو کرنے کیلئے دفتر سے نکل کر مہمان خانہ میں پہنچا تو اس کے ہاتھ میں معین الملک کا بھیجا ہوا خط تھا۔ صفدر جنگ نے اس کے پاس یہ خط اس وجہ سے بھجوایا تھا کہ اسے ملاقات کی اہمیت کا احساس ہو جائے لیکن غازی الدین حالات کی نزاکت کا احساس کرنے کی بجائے خط پڑھ کر برہم ہو گیا اور اسی برہمی میں وہ خط مروڑ کر صفدر جنگ کی طرف پھینکتے ہوئے بولا:

''کیا وزیراعظم سمجھتے ہیں کہ معین الملک کا محض یہ شبہ کہ ابدالی فوجیں پنجاب پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہی ہیں کوئی ایسی بات ہے جس کیلئے شہنشاہ دہلی کو زحمت دی جائے؟ یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں جس کی بناء پر شہنشاہ کی عشرت میں خلل ڈالا جائے اور اگر وزیراعظم کے خیال میں اس کی کوئی اہمیت ہے تو وہ اپنے طور پر اس کا بندوبست کر سکتے ہیں۔ آخر آپ وزیراعظم ہیں اور آپ کے اختیارات بے انتہا وسیع ہیں۔''

صفدر جنگ اس جواں عمر میر بخشی کی باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ غازی الدین خاموش ہوا تو صفدر جنگ نے درشت لہجے میں کہا:

''میر بخشی! آپ اپنے اختیارات قلعہ تک محدود رکھئے یہ مسئلہ سلطنت کی سلامتی سے تعلق رکھتا ہے اس لئے آپ اس میں دخل نہ دیجئے۔ مجھے ظلِ سبحانی سے ملاقات کرنی ہے اور میں ان سے ملاقات کئے بغیر واپس نہ جاؤں گا۔ آپ میرے آنے کی اطلاع محل میں بھجوائیے۔''

میر بخشی غازی الدین کا خیال تھا کہ صفدر جنگ اس کے رعب میں آجائے گا مگر جب صفدر جنگ نے منہ توڑ جواب دیا تو اس نے فوراً پلٹا کھایا اور نرمی سے بولا:

''وزیر محترم! میرا مقصد آپ کے کاموں میں دخل دینا ہرگز نہیں۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ شہنشاہ کو تکلیف دینے کے بجائے آپ اپنے اختیارات سے کام لیتے ہوئے جو مناسب سمجھیں وہ قدم اٹھائیں۔ ہاں اگر اعلیٰ حضرت کے سامنے کوئی بات پیش ہوئی تو میں یقین دلاتا ہوں کہ میں پہلا شخص ہوں گا جو آپ کی حمایت میں بولے گا۔''

''میں اس تعاون کیلئے میر بخشی کا شکرگزار ہوں۔''

وزیراعظم صفدر جنگ نے بھی مصلحت سے کام لیا۔

''لیکن فی الحال آپ میری ملاقات کا انتظام کرائیے۔''

غازی الدین کو یقین ہو گیا کہ صفدر جنگ بغیر ملاقات کیے واپس نہیں جائے گا تو وہ حرم سرا کی طرف چلا۔ احمد شاہ ہر وقت محل سرا میں رہتا تھا جہاں اس کی دلبستگی کیلئے ادھم بائی اور خواجہ سرا جاوید خدمتگار خاں تمام لوازمات عشرت مہیا کرر کھتے تھے۔

آخر غازی الدین کو مجبور ہونا پڑا۔ خدمتگار خاں محل کے اندر گیا اور ادھم بائی کو منہ بنا کر بتایا کہ صفدر جنگ خواہ مخواہ بادشاہ کے عیش میں خلل ڈالنے آ گیا ہے۔ اسے کسی ترکیب سے ٹال دیا جائے تو زیادہ بہتر ہو گا۔ ادھم بائی نے فوراً بادشاہ کی بیماری کا بہانہ تراشا اور صفدر جنگ کو ملاقات سے روک دیا۔

صفدر جنگ کچھ کم گھاگ نہ تھا۔ اس نے ادھم بائی کو کہلوایا کہ شہنشاہ کی علالت سے انتظامی امور میں رخنہ پڑنے کا امکان ہے اس لئے اب شہنشاہ سے اس کی ملاقات اور بھی ضروری ہو گئی ہے۔ خدمتگار خاں اور ادھم بائی کا ہر حربہ بھی بیکار ہو گیا اور انہیں مجبوراً صفدر جنگ سے ملاقات کا اہتمام کرنا پڑا اس طرح صفدر جنگ کی شہنشاہ سے ملاقات کا دوسرا موقع تھا۔

مغل شہنشاہ پورے شاہانہ وقار سے تکیوں کے سہارے نیم دراز تھا۔ حوران ارضی اسے گھیرے ہوئے تھیں۔

صفدر جنگ نے جھک کر روایتی انداز میں بادشاہ کو سلام کیا اور پھر نظریں نیچی کر کے کھڑا ہو گیا۔ گفتگو کی ابتداء خود بادشاہ نے کی۔

''صفدر جنگ! ما بدولت کو بتایا گیا ہے کہ افغانستان کا چوہا ایک بار پھر اپنے بل سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہے۔ شاید وہ اپنی شکست بھول گیا ہے۔ سرہند کی جنگ میں ہم نے ابدالیوں کے منہ پھیر دیئے تھے اور انہیں میدان سے بھاگنا پڑا تھا۔''

''شہنشاہ کا اقبال بلند ہو۔''

صفدر جنگ نے کہنا شروع کیا۔

''ابدالیوں کو اس دفعہ بھی انشاء اللہ ہم شکست دیں گے۔ لیکن ماضی اور حال کی صورتحال میں اب بہت فرق ہے۔ ماضی میں فوج کی کمان ظل سبحانی کے ہاتھ میں تھی لیکن اس دفعہ معین الملک پنجاب میں تنہا ہے۔ پہلے حملہ کے وقت صوبیدار دکن آصف جاہ اور وزیر اعظم قمرالدین ظل سبحانی کے ساتھ کمک لے کر لاہور پہنچے تھے۔''

صفدر جنگ نے بڑے مؤدبانہ لہجے میں اپنا مقصد بیان کیا تھا۔ اس نے معین الملک کو کمک بھیجنے کا اشارہ کیا تھا۔ احمد شاہ بہادر اور عقلمند بادشاہ تھا۔ لیکن محل کی رنگین فضا نے اس کی صلاحیتوں کو زنگ آلود کر دیا تھا۔ اب وہ ادھم بائی اور خدمتگار خاں کی مرضی کے تابع تھا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق اس سے فرمان جاری کراتے تھے۔ ادھم بائی نے اسے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ اس وقت سخت گرمی پڑ رہی ہے لاہور میں موسم اس سے زیادہ سخت ہے لشکر کو بہت تکلیف ہو گی اس لئے فی الحال کمک بھیجنا ملتوی کر دیا جائے۔

بادشاہ نے نرمی سے کہا:

''معین الملک ایک بہادر صوبیدار ہے۔ ہم اس کی مدد ضرور کریں گے۔ اسے مطلع کر دیا جائے کہ جب ابدالی لشکر حملہ آور ہو دہلی سے کمک

منگوالی جائے۔"

یہ کہہ کر بادشاہ نے اس مسئلہ پر پہلو بدل لیا۔ گویا بات ختم ہوگئی تھی اور اب مزید کسی گفتگو کی ضرورت نہ تھی۔ صفدر جنگ کو بادشاہ کی اس لاپرواہی کا بڑا صدمہ ہوا۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ جواب بادشاہ کا نہیں ہے۔ کیونکہ کم عقل سے کم عقل بادشاہ بھی اپنی سرحدوں کو غیر محفوظ نہیں دیکھ سکتا۔ پھر اس عالم میں کہ جب سرحدی صوبیدار از خود متوقع حملہ کی خبر دے رہا تھا۔

صفدر جنگ خاموشی سے واپس آ گیا لیکن اس نے غازی الدین، کوکی ادھم بائی اور خدمتگار خاں کے گٹھ جوڑ کو توڑنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ ان تینوں کی موجودگی میں اس کی وزارت بالکل بے اثر تھی۔

ایک ہفتہ خاموش رہنے کے بعد صفدر جنگ نے اپنے بیٹے کے عقیقہ کا اعلان کیا۔ اس رسم ادائیگی کے سلسلے میں ایک اعلیٰ درجے کی ضیافت کا بھی انتظام کیا گیا۔ صفدر جنگ نے اس ضیافت کا خوب پروپیگنڈا کیا۔ ضیافت اور جشن کی اہمیت بڑھانے کیلئے اس نے یہ بھی اعلان کرا دیا کہ اس رسم میں شرکت کیلئے اعلیٰ حضرت ظل سبحانی احمد شاہ بہ نفس نفیس تشریف لا رہے ہیں۔

اس اعلان سے دہلی میں تہلکہ مچ گیا۔ ہر امیر کی خواہش تھی کہ اسے اس محفل میں مدعو کیا جائے۔ صفدر جنگ نے بھی بڑی فراخدلی کا ثبوت دیا اور تمام عمائدین سلطنت اور شہر کے علماء، فضلاء اور معززین کو دعوت نامے بھجوائے۔ قلعہ والوں کیلئے یہ بات بڑی تعجب خیز تھی کہ احمد شاہ تو محل سرا سے نکل کر دربار میں بھی نہیں جاتا تھا اس کا وزیر اعظم کی حویلی میں جانا واقعی تعجب کی بات تھی۔

صفدر جنگ نے شاہ کی ضیافت کیلئے پورے شاہانہ انتظامات کئے تھے۔ اس کی حویلی قطب شاہ کی لاٹ کے پاس مہتاب باغ کے ایک حصہ میں واقع تھی۔ وہ حویلی مہتاب باغ ہی کا ایک حصہ تھی۔ ادھر صفدر جنگ بڑے انہماک سے ان تیاریوں میں مصروف تھا لیکن دوسری طرف قلعہ والوں کو اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ جب یہ خبر غازی الدین اور خواجہ سرا خدمتگار کو پہنچی تو وہ حیران رہ گئے۔ کوکی ادھم بائی اپنی جگہ پریشان تھی۔ بادشاہ کی کوئی بات اس سے پوشیدہ نہ تھی۔ اسے تعجب تھا کہ احمد شاہ نے اسے بتائے بغیر صفدر جنگ کی دعوت کیسے قبول کر لی۔ وہ صفدر جنگ سے بہت خائف تھی اور اس کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتی رہتی تھی۔

ان تینوں کی آپس میں گٹھ جوڑ تو تھی ہی پس انہوں نے طے کیا کہ بادشاہ سے پوچھنا چاہئے کہ اس نے صفدر جنگ کی دعوت کیوں قبول کی جبکہ اسے صفدر جنگ کی طرف سے محتاط رہنے کے واضح اشارے کئے گئے تھے۔ صفدر جنگ نے بھی پورے قلعہ میں اپنے جاسوس پھیلا رکھے تھے جو اسے پل پل کی خبر پہنچاتے تھے۔ انہوں نے صفدر جنگ کو اطلاع دی کہ اس کے تینوں دشمن، بادشاہ سے اس دعوت کے سلسلے میں گفتگو کرنے والے ہیں۔ جاسوسوں نے اس ملاقات کے دن اور وقت تک سے صفدر جنگ کو آگاہ کر دیا۔ صفدر جنگ تو اسی تاک میں تھا۔ وہ بھی مقررہ وقت سے کچھ دیر پہلے قلعہ میں پہنچ گیا۔

ادھر ادھم بائی، غازی الدین اور خدمتگار خاں تینوں ایک ساتھ بادشاہ کے پاس پہنچے کیونکہ وہ صفدر جنگ کی مخالفت اکیلے مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ احمد شاہ ان تینوں کو ایک ساتھ دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے خدمتگار خاں سے سختی سے پوچھا کہ

''تم لوگوں کا ایک ساتھ آنے کا کیا مقصد ہے۔تم نے باریابی کی اجازت کیوں نہیں مانگی۔''

خدمتگار خاں کا رنگ اڑ گیا لیکن ادھم بائی نے فوراً بات سنبھالی اور پیار بھرے لہجے میں بولی۔

''شہنشاہ حضور پر میں صدقے جاؤں۔ بھلا حضور سے سوائے معافی مانگنے کے اور ہمارا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ہم سے خطا ہوئی ہے۔اس لئے ایک ساتھ قدموں میں حاضر ہوئے ہیں اور جب سے یہ علم ہوا ہے کہ ہم خطاوار ہیں اس وقت سے ہم نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔''

''کیسی خطا۔کیا کہہ رہی ہو کوکی!......''

احمد شاہ نے استعجاب کا اظہار کیا۔

''ظل سبحانی!یہ ہماری خطا نہیں تو اور کیا ہے کہ حضور نے صفدر جنگ کی دعوت قبول کر لی ہے اور ہم وفاداروں کو کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی۔''

ادھم بائی بڑی مکاری سے بولی۔

''شہنشاہ حضور ہم سے کسی بات پر ضرور ناراض ہیں اس لئے انہوں نے ہم پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا ہے۔''

''کوکی بائی''

احمد شاہ مسکرایا۔

''مابدولت کو تمہاری زبان سے معلوم ہوا کہ صفدر جنگ نے کسی دعوت کا اہتمام کیا ہے اور صفدر جنگ نے مابدولت سے اب تک رجوع نہیں کیا۔''

ادھم بائی نے خدمتگار خاں کی اور خدمتگار خاں نے غازی الدین کی طرف دیکھا۔کسی کی سمجھ میں یہ معمہ نہ آیا۔بادشاہ انکار کر رہا ہے کہ اسے کسی دعوت کی خبر ہی نہیں اور صفدر جنگ نے پورے شہر میں بلاوے دے دیئے ہیں اور اس اعلان کے ساتھ کہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ ہندشاہ ابن شاہ احمد شاہ اس دعوت کو شرکت کا اعزاز بخش رہے ہیں۔

غازی الدین نے ہمت کی اور سر جھکا کر ادب سے بولا۔

''عالی جاہ!اگر صفدر جنگ نے آپ کی اجازت کے بغیر ضیافت میں حضور کی شرکت کا اعلان کیا ہے تو یہ تاجدار ہند کی توہین کے مترادف ہے اور ایسی گستاخی......''

''نہیں غازی الدین۔''

احمد شاہ نے اس کی بات کاٹ دی۔

''صفدر جنگ ہمارا وزیر اعظم ہے وہ تم سے زیادہ عقلمند ہے۔اس نے جو اعلان کیا ہے اس میں کوئی مصلحت ضرور ہوگی۔''

''صدقے جاؤں اعلیٰ حضرت کے۔''

ادھم بائی نے زبان کھولی۔

''مصلحت ضرور ہوگی لیکن اسے اس کی اطلاع حضور عالی تک ضرور پہنچانی چاہیے تھی۔''

''ہاں! یہ ٹھیک ہے۔ دعوت کب ہو رہی ہے۔''

احمد شاہ گویا ہوا۔

''کل دعوت ہے حضور عالی! صفدر جنگ نے ضیافت کا اہتمام اپنے بچے کے عقیقے کے بہانے کیا ہے۔''

خدمتگار خاں نے بادشاہ کا ذہن خراب کرنے کیلئے ایک نیا شوشہ چھوڑا۔

احمد شاہ چند لمحے سوچنے کے بعد بولا:

''خدمتگار خاں! تم انتظام سلطنت سے واقف نہیں ہو۔ ہم دربار میں بہت کم جاتے ہیں ہوسکتا ہے کہ صفدر جنگ نے ہمارا نام استعمال کر کے تمام لوگوں کو اپنے گھر مدعو کیا ہو اور اس طرح شاہی دربار کا لطف اٹھانا چاہتا ہو۔ تم لوگ بھی تو مابدولت کے نام پر کیا کچھ کر گزرتے ہو۔ ہمیں صفدر جنگ کی بھی پرورش منظور ہے۔ اگر اسے اپنے گھر میں دربار لگا کر خوشی حاصل ہوتی ہے تو مابدولت کو اس پر کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔''

اسی وقت ایک خدمتگار نے حاضر ہو کر اطلاع دی کہ وزیر اعظم صفدر جنگ در دولت پر حاضر ہے اور قدم بوسی کی اجازت چاہتا ہے۔

احمد شاہ مسکرا کر بولا:

''مابدولت نے کہا تھا کہ صفدر جنگ تم سے زیادہ ہوشمند ہے۔''

پھر اس نے خدمتگار سے کہا:

''صفدر جنگ کو حاضر کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کیا جواز پیش کرتا ہے۔''

صفدر جنگ کی آمد سے وہ تینوں پریشان ہو گئے اور ادھم بائی بگڑ کر بولی۔

''ہمیں اجازت دی جائے۔ عالی جاہ!''

''نہیں تم لوگ حاضر رہو گے۔''

احمد شاہ نے سختی سے کہا۔

''ہم تمہاری موجودگی میں صفدر جنگ سے گفتگو کریں گے تاکہ تمہارے شبہات دور ہو جائیں۔''

اس دوران صفدر جنگ اندر آ گیا۔ اس نے دشمن گروہ پر نظر ڈالی۔ اسے تو ان کی موجودگی کا پہلے سے علم تھا اور وہ جان بوجھ کر اس وقت حاضر ہوا تھا۔

''صفدر جنگ!!!''

احمد شاہ شاہانہ انداز میں بولا۔

''مابدولت کا خیال ہے کہ تم اس وقت اپنی اعلان کردہ ضیافت کے سلسلے میں کوئی وضاحت کرنا چاہتے ہو۔''

''عالم پناہ کا ارشادِ گرامی بالکل درست ہے۔ خادم شرکت ضیافت کی درخواست لے کر حاضر ہوا ہے۔''

صفدر جنگ نے عرض کیا۔

''چہ خوش۔''

احمد شاہ مسکرایا۔

''مابدولت کی شرکت کا اعلان پہلے کیا گیا اور درخواست بعد میں پیش کی جا رہی ہے۔ صفدر جنگ تم نے یہ جرأت کس بناء پر کی۔''

''عالی جاہ! یہ گستاخی محض اعتماد کی بنا پر سرزد ہوئی ہے۔''

صفدر جنگ نے استقلال سے کہا۔ شاید اسے اس طرح کے سوالات کی پہلے سے ہی توقع تھی اور وہ پوری طرح تیار ہو کر آیا تھا۔

احمد شاہ گویا ہوا

''مگر ہم اس بے جا اعتماد کی وضاحت چاہیں گے۔''

صفدر جنگ نے عرض کیا:

''حضور! اگر کسی نااہل پر شاہی نوازشات کی بارش ہونے لگے تو وہ اپنے آپ کو اہل سمجھ کر مغرور ہو جاتا ہے اور اس کے اعتماد میں اس قدر پختگی پیدا ہو جاتی ہے جو اسے ہر وقت گستاخی پر اکساتی رہتی ہے۔''

صفدر جنگ نے پہلی دفعہ ان تینوں کو دیکھا جو اسے وزارت سے ہٹانے کی فکر میں تھے۔

''عالی جاہ! اس حقیر کی طرح سلطنت کے بہت سے عمائدین اور امیر حضور کے دیدار کے متمنی ہیں۔ میں نے سوچا کہ عالی جاہ کی شرکت سے وابستگان تخت و تاج کی آنکھوں کو نور اور دلوں کو سرور حاصل ہوگا۔ پھر بھی اگر یہ نظرِ عالی میں گستاخی ہے تو حقیر معافی کا خواستگار ہے۔''

''مرحبا! صفدر جنگ''

احمد شاہ کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔

''مابدولت تمہارے جذبہ اور خلوص سے خوش ہوئے ہیں۔''

اس کے ساتھ ہی احمد شاہ نے خوشامدیوں پر ایک نظر ڈالی۔ ان کے چہرے پھیکے پڑ گئے تھے۔ احمد شاہ کا دل چاہا کہ وہ صفدر جنگ کی درخواست پر غور کرے لیکن اسے دل سے اٹھنے والی اس آواز کو دبانا پڑا ممکن ہے اسے اپنے حواریوں کی دل شکنی کا خیال ہو یا پھر اسے یہ گوارہ نہ ہو کہ وہ اپنی بزمِ عشرت چھوڑ کر ایک فضول سی رسم کی ادائیگی کیلئے قلعہ سے باہر جائے۔

احمد شاہ نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا:

''صفدر جنگ! تم ہمارے وزیر ہو۔ تمہیں علم ہے کہ ہر فرد خواہ وہ عوام میں سے ہو یا اس کا تعلق وزارت سے اور بادشاہت سے ہو ہر ایک کے کچھ نہ کچھ الگ الگ معمولات ہوتے ہیں کل تمہارے یہاں تقریب ہے۔ ہم جانتے ہیں تمہیں ہماری عدم شرکت کا افسوس ہوگا لیکن ہماری مجبوریاں''

احمد شاہ نے بات ادھوری چھوڑ کر صفدر جنگ کی طرف دیکھا۔ وہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ اس کے انکار کا اس پر کیا اثر ہوا ہے۔ صفدر جنگ کے چہرے پر غم کے گہرے خطوط نمودار ہوئے۔ مگر وہ فوراً سنبھل کر بولا:

''عالی جاہ! یہ غلام ہرگز نہیں چاہتا کہ حضور کے معمولات میں ذرہ برابر بھی رخنہ پڑے۔ احقر کو یہ اجازت دی جائے کہ وہ حضور کے جوتے اپنے ساتھ لے جا سکے۔ میں ان جوتوں کو اس مسند شاہی پر سجادوں گا جو میں نے حضور کیلئے تیار کروائی ہے۔ میرے لئے تو یہ نمائندگی باعث فخر ہوگی۔''

احمد شاہ نے اسے بڑی حیرانی سے دیکھا۔ دشمنوں پر اوس سی پڑ گئی۔ احمد شاہ نے تذبذب کے عالم میں کہا۔

''صفدر جنگ! تم نے مابدولت کو تردد میں ڈال دیا ہے۔ ہم اقرار نہیں کر سکتے اور انکار سے تم جیسے وفادار کا دل بھی نہیں دُکھانا چاہتے۔''

''عالم پناہ کا تردّد غلام کیلئے نا قابل برداشت ہے۔''

صفدر جنگ بڑی وضاحت اور فصاحت سے بول رہا تھا۔ اس نے اپنی پگڑی درست کی اور بولا:

''عالی جاہ! اگر اس حقیر کی عزت افزائی فرمانا ہی چاہتے ہیں تو یہ مقصد حضور کے ضیافت میں شریک ہوئے بغیر بھی پورا ہو سکتا ہے۔ اس وقت میرے ذہن میں ایک ترکیب آئی ہے بشرطیکہ اسے پسند فرمایا جائے۔''

''کیا؟ اسے فوراً بیان کیا جائے۔''

احمد شاہ تو چاہتا ہی یہ تھا کہ کوئی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ اسے ضیافت میں نہ جانا پڑے اور صفدر جنگ بھی خوش رہے۔

''عالی جاہ!''

صفدر جنگ نے بڑے سکون سے کہنا شروع کیا۔

''اس غلام کے خیال میں قلعہ معلّٰی میں کچھ ایسی ہستیاں موجود ہیں جو قرب شاہی کی وجہ سے قلعہ اور بیرون قلعہ یکساں طور پر مشہور اور قابل احترام ہیں۔ اگر حضور کی بجائے یہ ہستیاں میرے غریب خانے کو عزت بخشیں تو میری کچھ نہ کچھ اشک شوئی ضرور ہو جائے گی کیونکہ عمائدین سلطنت اور معززین شہران سے مل کر یقیناً خوش ہوں گے اور فخر محسوس کریں گے۔''

''تمہارے خیال میں قلعہ میں ایسی کون کون سی معزز ہستیاں ہیں۔''

احمد شاہ نے پوچھا۔

''سب سے زیادہ قابل احترام تو ادھم بائی ہیں۔''

صفدر جنگ نے درزیدہ نظروں سے ادھم بائی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''خاتون محترم کا ممتا بھرا دل ہر وقت حضور کیلئے دھڑکتا ہے۔ پھر جاوید خدمتگار خاں کچھ کم قابل احترام نہیں جو ہمہ وقت حضور کی خدمت اور حکم کی بجا آوری کیلئے مستعد رہتے ہیں۔ تیسری ہستی میر بخشی غازی الدین کی ہے جو اس نوعمری میں بھی اپنی علمیت اور خطابت کی سند علماء اور معززین شہر سے حاصل کر چکے ہیں۔ اگر یہ حضرات میرے بچے کی تقریب میں شرکت فرمائیں تو میرے لئے باعث صد افتخار ہوگا۔''

احمد شاہ کو صفدر جنگ کی یہ تجویز پسند آئی۔ اس نے سوچا کہ جب اس کی بجائے کسی اور کے ضیافت میں شریک ہونے سے اس کے وزیراعظم کا مقصد پورا ہوتا ہے تو اس کی دلداری کرنے میں کیا حرج ہے۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے کوکی ادھم بائی کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ وہ بادشاہ کی نمائندگی کرنے کیلئے آمادہ ہے۔ ادھم بائی بادشاہ کی نظروں کا مطلب سمجھ گئی لیکن وہ ضیافت میں تنہا جانے کا خطرہ مول لینے پر آمادہ نہ تھی۔

ادھم بائی نے سر جھکا کر کہا:

''قربان جاؤں شہنشاہ عادل کے۔ مغل شہزادوں اور بادشاہوں کا نمک کھاتے کھاتے میرے بال سفید ہو گئے ہیں لیکن میں شہنشاہ کے قدموں سے ایک لمحہ بھی جدا نہیں رہ سکتی۔ جہاں شہنشاہ وہاں یہ کنیز۔ پھر میری کیا مجال کہ میں شہنشاہ دوراں کی نمائندگی کا تصور بھی کر سکوں۔''

احمد شاہ نے ناگواری سے نظر پھیر کر غازی الدین کو دیکھا۔ غازی الدین کی چھٹی حس بیدار ہو گئی تھی۔ صفدر جنگ نے اگرچہ اس کی ذہانت کی تعریف کی تھی لیکن وہ دشمن کے گھر جانے پر آمادہ نہ تھا۔

غازی الدین نے پہلو بچاتے ہوئے ادب سے کہا:

''شہنشاہ کی نمائندگی سے بڑھ کر مجھ جیسے غلام کیلئے اور کونسا بڑا اعزاز ہو سکتا ہے غلام کو جانے میں عذر نہیں لیکن قلعہ کا تمام انتظام میرے سپرد ہے اور ہر چھوٹے بڑے کام کی ذمہ داری مجھ پر ہے اس لئے میرا جانا کسی طرح مناسب نہیں اور اگر یہ شہنشاہ کا حکم ہے تو میں بسر و چشم تعمیل کیلئے حاضر ہوں۔''

احمد شاہ کے چہرے پر ناگواری کے آثار اور بڑھ گئے۔ اس نے غازی الدین سے نظریں ہٹا کر خشمگیں نظروں سے خواجہ سرا خدمتگار خاں کی طرف دیکھا۔ خدمتگار خاں کیلئے یہ پہلا موقع تھا کہ وزیراعظم جیسی ہستی نے اسے قلعہ کا ایک رکن کہا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ شاہ کی قربت کی وجہ سے وہ قلعہ کے اندر اور شہر میں یکساں طور پر مقبول اور محترم سمجھا جاتا ہے۔ اس نے سوچا کہ لوگوں پر اپنا رعب جمانے کا اس سے بہتر موقع اور کون سا ہو سکتا ہے۔ وہ مغل شہنشاہ کا نمائندہ بن کر جائے گا تو اسے سب ہی آنکھوں پر بٹھائیں گے۔

پس خدمتگار خاں نے عاجزی سے کہا:

''شہنشاہ کو میری عمر لگ جائے۔ اگر شہنشاہ بھی مجھے اس قابل سمجھتے ہیں اور ذرے کو آفتاب بنانے پر آمادہ ہیں تو میں تعمیل حکم کیلئے تیار ہوں۔ میں وزیراعظم کی خوشی میں ضرور شرکت کروں گا۔''

احمد شاہ نے اطمینان کا سانس لیا اور مسکرا کر صفدر جنگ کی طرف دیکھا۔ صفدر جنگ نے خدمتگار خاں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''عالی جاہ! میں تو ڈر گیا تھا کہ آج میری درخواست نامنظور ہو گی اور میں اس در سے خالی ہاتھ لوٹوں گا۔ مگر خدا بھلا کرے خدمتگار خاں کا انہوں نے میرا دامن خوشیوں سے بھر دیا۔''

احمد شاہ کو اتنی دیر گفتگو کرنا ہی بہت شاق گزر رہا تھا۔ پھر ایک مسئلہ بڑی خوش اسلوبی سے طے ہو گیا تھا۔ اس نے فوراً سب کو رخصت کر دیا اور

اپنے معمولات میں مصروف ہوگیا۔

دوسرے دن صفدر جنگ کی حویلی پر جشن جیسا سماں تھا۔ رسم شام کو ادا ہونی تھی۔ لیکن مہمانوں کا دوپہر سے ہی میلہ لگ گیا تھا۔ شہر سے قطب مینار تک سواریوں کا تانتا بندھا تھا۔

خدمتگار خاں بھی بڑی شان سے روانہ ہوا۔ اس کے پیچھے پانچ محافظ زرق برق لباس پہنے، اسلحہ لگائے گھوڑوں پر سوار چل رہے تھے۔ قلعہ اور شہر والے خدمتگار خاں سے بہت جلتے تھے۔ سب کو معلوم تھا کہ خدمتگار خاں اور ادھم بائی نے شہنشاہ کو قلعہ کے عشرت کدے میں قید کر رکھا ہے۔ وہ جدھر سے گزرتا لوگ بڑبڑانے لگتے اور دبی زبان میں صلواتیں سناتے۔ خدمتگار خاں سمجھتا کہ لوگ اسے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں۔

خدمتگار خاں ابھی قلعہ سے ایک میل دور پہنچا تھا کہ راستے کے دونوں طرف سے بہت سے گھڑ سوار نمودار ہوئے اور آناً فاناً اسے گھیر لیا۔ وہ لوگ وضع قطع اور لباس سے مرہٹے اور جاٹ معلوم ہوتے تھے۔ اس زمانے میں ان دو قوموں نے بڑا اُدھم مچا رکھا تھا اور اکثر دہلی کے اطراف میں لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ انہیں دیکھ کر خدمتگار خاں کے حواس جاتے رہے اور اس نے پلٹ کر اپنے محافظوں کو دیکھا مگر محافظ حملہ آوروں کو آتا دیکھ کر ہی بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔ مرہٹوں اور جاٹوں کے اس گروہ نے خدمتگار خاں کو بھاگنے نہیں دیا۔ سڑک پر کافی لوگ آ جا رہے تھے لیکن کوئی بھی خدمتگار خاں کی مدد کو نہیں آیا۔ اس نے بہت دہائیاں دیں اور شور مچایا لیکن کسی نے نہ سنی اور خدمتگار خاں ضیافت کا ارمان لیے ختم ہوگیا۔ حملہ آوروں نے اس کا سر قلم کر کے راستے میں پھینک دیا اور جدھر سے آئے تھے ادھر ہی واپس چلے گئے۔

☆

مقید خاک

ساحر جمیل سید کا ایک اور شاہکار ناول...... مقیدِ خاک...... سرزمین فراعنہ کی آغوش سے جنم لینے والی ایک تحیّر خیز داستان۔

ڈاکٹر شکیل ظفر:- ایک ہارٹ اسپیشلسٹ، جو مردہ صدیوں کی دھڑکنیں ٹٹولنے نکلا تھا...... یوساف بے:- وہ ساڑھے چار ہزار سال سے مضطرب شیطانی روحوں کے عذاب کا شکار ہوا تھا...... بیوسا:- ایک حرماں نصیب ماں، جسکی بیٹی کو زندہ ہی حنوط کر دیا گیا...... مریاقس:- اسکی روح صدیوں سے اس کے جسدِ خاکی میں مُقیّد تھی...... شیلندر رائے ہریجہ:- ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹو، اسے صدیوں پرانی ممی کی تلاش تھی...... مہرجی:- پرکالۂ آفت، انسانی قالب میں ڈھلی ایک آسمانی بجلی...... ایکشن، سسپنس اور تھرل کا ایک نہ رکنے والا طوفان......

یہ ناول کتاب گھر پر جلد آرہا ہے، جسے ایکشن ایڈونچر مہم جوئی ناول سیکشن میں پڑھا جاسکے گا۔

محمد شاہ، آصف جاہ اور وزیر اعظم قمر الدین کے یکے بعد دیگرے انتقال کرنے سے دہلی میں جو ابتری پھیلی تھی اس کی خبریں افغانستان میں احمد شاہ ابدالی کو برابر مل رہی تھیں۔ محمد شاہ کے بعد اس کے بیٹے احمد شاہ کے تخت و تاج سنبھالنے سے حالات بہتر ہونے کے بجائے اور زیادہ ابتر ہو گئے مرہٹے دلیر ہو گئے اور سورج مل جاٹ نے اکبر آباد کے قرب و جوار میں طوفان برپا کر رکھا تھا۔ کسی بھی بیرونی حملہ آور کیلئے یہ حالات سازگار تھے۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی نے فوراً فوج کو کوچ کرنے کا حکم دے دیا۔ وہ معین الملک کی بہادری اور دانشمندی سے واقف تھا۔ اس لئے اس نے پہلے کشمیر کا رخ کیا۔ معین الملک نے اپنے طور پر تیاری کی تھی لیکن اسے زیادہ سہارا دہلی کی کمک کا تھا۔ مگر اس کا قاصد کمک کیا لاتا وہ خود دہلی کی رنگینیوں میں گم ہو گیا۔

کشمیر کا علاقہ معین الملک کے ماتحت تھا لیکن وہ احمد شاہ ابدالی کو آگے بڑھ کر روکنے سے قاصر تھا۔ اس نے حملے کی اطلاع پا کر اپنی منتشر فوج کو اکٹھا کیا اور لاہور میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا۔ احتیاط کے طور پر اس نے ایک اور قاصد دہلی بھیج دیا۔

پنجاب پر احمد شاہ ابدالی کا یہ دوسرا حملہ تھا۔ اس نے پہلے حملے میں شکست کھائی تھی اور اب دوسرے سال ہی اپنی شکست کا بدلہ لینے آ گیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی کشمیر سے ہوتا ہوا بغیر کسی مزاحمت کے لاہور پہنچ گیا۔ ان دنوں دریائے راوی قلعہ کے پاس سے بہتا تھا۔ احمد شاہ نے پانچ میل اوپر راوی کو پار کیا اور خشکی کے راستے قلعے کے سامنے نمودار ہوا۔

اسے یہ تو معلوم ہو گیا تھا کہ معین الملک کو دہلی سے کوئی کمک نہیں پہنچی ہے پھر بھی اسے سخت مدافعت کی امید تھی۔ احمد شاہ نے فوراً حملہ کرنے کی بجائے معین الملک کو پیغام بھیجا کہ اگر قلعہ اس کے حوالے کر دیا جائے تو وہ معین الملک کو اپنی طرف سے پنجاب کا گورنر بنا دے گا۔ معین الملک بہت پریشان ہوا اسے دہلی سے کسی کمک کی کوئی امید نہ تھی۔ اب لاہور قلعہ کی حفاظت اس کیلئے مشکل ہی نہیں ناممکن ہو گئی تھی۔ ان حالات میں احمد شاہ ابدالی کا پیغام اسے بہت غنیمت معلوم ہوا۔ اس نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ سب کی رائے تھی کہ شاہ افغانستان سے صلح کر لی جائے اور اسے ایک معقول رقم دے کر افغانستان بھیج دیا جائے۔ کہ پنجاب سے زیادہ اسے دہلی کی فکر تھی کیونکہ دہلی ایک بار پہلے بھی نادر شاہ درانی کے ہاتھوں تباہ ہو چکا تھا۔ دہلی کے قتل عام کا منظر اب تک اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ رات بھر غور کرنے کے بعد اس نے فیصلہ کیا کہ احمد شاہ سے معقول شرائط پر صلح کر لی جائے اور کسی صورت بھی اسے دہلی کی طرف پیش قدمی سے روکا جائے۔

صبح ہوتے ہی لاہور قلعہ کا دروازہ کھلا اور ایک سوار نیزے پر سفید کپڑا باندھے باہر نکلا اور گھوڑا دوڑاتا ہوا ابدالی لشکر کی طرف چلا گیا۔ قلعہ کا دروازہ ابھی بند نہ ہوا تھا۔ پہلے سوار کے نکلتے ہی قلعہ سے پانچ سوار اور باہر آئے۔ ان سواروں میں آگے معین الملک تھا اور اس کے پیچھے چار محافظ تھے۔ ان لوگوں نے بھی نیزوں پر سفید کپڑے باندھ رکھے تھے۔ معین الملک کے گھوڑے کی زین کے ساتھ مغل پرچم بھی بندھا ہوا تھا۔

معین الملک اپنے محافظوں کے ساتھ ابدالی لشکر میں پہنچا تو اس نے احمد شاہ ابدالی کو اپنا منتظر پایا۔ آگے آنے والے سوار نے احمد شاہ ابدالی کے پاس پہنچ کر اپنے صوبیدار کے آنے کی خبر پہنچا دی تھی۔ احمد شاہ ابدالی، معین الملک کی بہادری سے اس قدر مرعوب تھا کہ اپنے خیمہ میں ملاقات کرنے کی بجائے وہ اس کے استقبال کیلئے خیمے سے باہر آ گیا تھا۔

معین الملک نے گھوڑے سے اتر کر احمد شاہ ابدالی کو سلام کیا۔ احمد شاہ ابدالی اس سے بڑی عزت سے پیش آیا اور معین الملک سے بغلگیر

ہوااور پھراسے اپنے ساتھ خیمے میں لے گیا۔صبح کا وقت تھا۔احمد شاہ نے معین الملک کیلئے ناشتہ منگوایااور ناشتے سے فارغ ہو کر دونوں میں گفتگو شروع ہوئی۔

''معین الملک۔''

احمد شاہ نے گفتگو میں پہل کی۔

''ہم تمہاری بہادری سے بہت خوش ہیں ہم نہیں چاہتے کہ قلعہ کو برباد کیا جائے۔مگر اس کی صورت یہی ہے کہ تم قلعہ کی چابیاں ہمارے حوالے کردو۔ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں کہ قلعہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔دوسری صورت میں ہم قلعہ کو زمین کے برابر کردیں گے۔''

معین الملک نے کچھ کہنے کی بجائے چابیاں نکال کر احمد شاہ کے سامنے رکھ دیں۔احمد شاہ نے بڑی حیرت سے معین الملک کو دیکھا۔اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ قلعہ پر اتنی آسانی سے قبضہ ہو جائے گا۔

احمد شاہ نے اپنی حیرت پر قابو پاتے ہوئے اپنا ہاتھ چابیوں کی طرف بڑھایا لیکن اسی وقت معین الملک کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

''اے شاہ افغانستان!!!''

معین الملک متانت سے بولا۔

''ہم نے آپ کی تمام شرائط تسلیم کرلیں اور چابیاں آپ کو پیش کردیں۔اب مجھے بھی ایک درخواست پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔امید ہے کہ شاہ افغانستان اس درخواست پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے۔''

احمد شاہ ابدالی کا چابیوں کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ یک دم رک گیا۔

اس نے ایک لمحہ کیلئے معین الملک کے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

''معین الملک!اگر تمہاری درخواست پنجاب کی صوبیداری کے لیے ہے تو اسے ہم پہلے ہی قبول کر چکے ہیں اور اس کے علاوہ اگر کوئی اور رعایت چاہتے ہو تو بیان کرو ہم اس پر ضرور غور کریں گے۔''

''اے شاہ!مجھے اپنے لئے کوئی رعایت نہیں چاہیے۔''

معین الملک نے بڑے استقلال سے کہا۔

''مجھے صوبیداری کی بھی آرزو نہیں ہے۔میں سپاہی اور سپاہی زادہ ہوں۔جس کی خدمت کروں گا وہی تنخواہ اور مرتبہ دے گا۔اگر مزاجِ شاہی کو ناگوار نہ ہو تو مجھے یہ بتایا جائے کہ آپ اپنے آقا نادر شاہ درانی کی طرح دہلی کو لوٹ کر اپنے خزانے بھرنا چاہتے ہیں یا آپ برصغیر میں ایک اسلامی حکومت قائم کرنے کے خواہشمند ہیں۔''

احمد شاہ ابدالی کو معین الملک کی جرأت اور صاف گوئی پر بڑی حیرت ہوئی اس نے کہا:

''معین الملک!اگرچہ صلح کی گفتگو کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں پھر بھی ہمارا جواب یہی ہے کہ ہم دونوں چیزوں کے خواہشمند ہیں۔''

''شاہ عالی شان!''

معین الملک اطمینان سے بولے۔

''شاہوں سے بحث کرنا مجھ جیسے کمتر درجہ کے عہدے دار کیلئے مناسب نہیں۔ میرے خیال میں دولت کا حصول اور ایک مستقل حکومت کا قیام دو مختلف خیال ہیں۔ اگر شاہ دولت کے خواہشمند ہیں تو جس قدر مال دولت دہلی کی تباہی سے وصول ہونے کی توقع ہے اتنی دولت میں شاہ کو پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ میری پیش کش کے بعد شاہ لاہور سے آگے قدم نہیں بڑھائیں گے۔''

''تم بہادر ہونے کے ساتھ ساتھ عقلمند بھی ہو معین الملک۔''

احمد شاہ کو اعتراف کرنا پڑا۔

''ہمیں بتاؤ اگر ہم ہندوستان (برصغیر) پر مستقل حکومت کرنا چاہیں تو تمہارا کیا ردعمل ہوگا؟''

''معین الملک! شاہ کے اس اقدام کو اسلام کی خدمت کا نام دے گا۔''

معین الملک نے فوراً جواب دیا۔

''اس کیلئے میں درخواست کروں گا کہ دہلی فتح کرنے کے بعد دہلی یا اکبر آباد (آگرہ) کو دارالسلطنت بنایا جائے۔ اگر فی الحال یہ ممکن نہ ہو تو دارالسلطنت لاہور منتقل کیا جائے۔''

''مگر یہ کیسے ممکن ہے۔ ہم افغانستان نہیں چھوڑ سکتے۔''

احمد شاہ نے صاف انکار کر دیا۔

''ہم کابل میں بیٹھ کر ہندوستان پر حکومت کریں گے۔ بالکل اس طرح جیسے دہلی کے مغل بادشاہ ہمارے ملک پر حکومت کرتے رہے ہیں۔''

''اے شاہ افغانستان! اگر آپ نے ہندوستان فتح کرنے کے بعد دارالسلطنت کابل میں ہی رکھا تو آپ اتنی دور بیٹھ کر اس قدر وسیع علاقے پر حکومت کیسے برقرار رکھ سکیں گے۔''

معین الملک گویا ہوئے۔

احمد شاہ پنجاب کے اس عقلمند صوبیدار کی باتوں سے پریشان ہوگیا۔ ذرا سوچنے کے بعد بولا:

''ہم تمہاری باتیں سن کر خوش ہوئے۔ ہمیں تمہارے خیالات سے اتفاق ہے لیکن یہ بتاؤ کہ جس بادشاہ نے تمہیں کمک نہیں بھیجی اس کی تباہی سے تم کیوں پریشان ہو۔ کیا دہلی کی جو خبریں ملی ہیں وہ سب غلط ہیں۔''

''اے شاہ! دہلی کے حالات تو اس سے بھی زیادہ خراب ہیں۔ جتنے آپ کو بتائے گئے ہیں۔''

معین الملک نے تسلیم کرتے ہوئے کہا۔

''مگر اے شہنشاہ افغانستان! اس بات پر تو غور کیجئے کہ دہلی میں کم از کم ایک مسلمان بادشاہ تو موجود ہے اگرچہ وہ نااہل ہے لیکن آج بھی

سلطنت مغلیہ کا رعب و دبدبہ غیر مسلموں پر طاری ہے۔ اگر آپ نے مغلوں کے آخری چراغ کو بجھا دیا اور مسلمانان ہند کا واحد سہارا بھی ختم کر دیا تو پھر کیا ہوگا۔ اکبر آباد پر سورج مل جاٹ کا قبضہ ہو جائے گا اور دہلی کو مرہٹے دبا بیٹھیں گے۔ مسلمانوں کی مرکزیت ختم ہو جائے گی اور وہ حاکم کی بجائے محکوم بن جائیں گے۔ میری اب بھی یہی خواہش ہے کہ آپ ہندوستان پر حکومت کریں مگر اس کیلئے آپ کو کابل کی بجائے ہندوستان میں رہنا ہوگا۔''

احمد شاہ ابدالی اس سے اس قدر متاثر ہوا کہ بے ساختہ بولا:

''معین الملک! ہم تمہاری مسلمان دوستی کی قدر کرتے ہیں۔ اطمینان رکھو، ہم سلطنت مغلیہ کا چراغ بجھنے نہیں دیں گے اور مسلمانوں کی مرکزیت اسی طرح برقرار رہے گی۔''

احمد شاہ ابدالی جذبات کی رو میں کہہ تو گیا مگر اب اسے فکر ہوئی کہ اپنی فوج اور سرداروں کو کس طرح مطمئن کرے گا۔ آخر کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا:

''معین الملک! تم جانتے ہو کہ ہم کابل سے فوج لے کر یہاں تک آئے ہیں۔ کشمیر پر ہم نے قبضہ کیا ہے اور لاہور کی چابیاں ہمارے سامنے ہیں۔ ظاہر ہے ہم خالی ہاتھ تو لوٹ کر نہیں جا سکتے اور پھر ہم اپنی فوج کو بھی مطمئن کرنا چاہتے ہیں۔''

معین الملک نے احمد شاہ ابدالی کو قائل کر لیا تھا اور وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش تھا۔ پس اس نے کہا:

''اے شاہ! آپ نے دہلی پر یلغار کا ارادہ ملتوی کر کے مسلمانان ہند پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ کشمیر اور پنجاب پر آپ نے بزور شمشیر قبضہ کیا ہے ان پر آپ کا حق ہے۔ تاوان جنگ کے طور پر میں اتنی رقم پیش کروں گا جس سے آپ کی سپاہ اور سردار خوش ہو جائیں گے۔''

☆

میرے خواب ریزہ ریزہ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جیسے خوبصورت ناول کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ میرے خواب ریزہ ریزہ کہانی ہے اپنے ''حال'' سے غیر مطمئن ہونے اور ''شکر'' کی نعمت سے محروم لوگوں کی۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، وہ زمین سے آسمان تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار زینب بھی ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جیتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ فاصلہ اس نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا۔ بعض سفر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافات کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کر لینا چاہیے۔

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

احمد شاہ ابدالی اپنا لشکر لے کر غزنی واپس چلا گیا۔ معین الملک نے احمد شاہ ابدالی کے اندازے سے کہیں زیادہ تاوان جنگ ادا کیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے کشمیر اور پنجاب میں ملتان تک کا علاقہ افغانستان میں شامل کر لیا تھا اور معین الملک کو اپنی طرف سے پنجاب کا صوبیدار مقرر کر دیا۔

انہی دنوں دہلی میں خواجہ سرا جاوید خدمتگار خاں کے قتل کا واقعہ پیش آیا۔ وزیر اعظم صفدر جنگ نے اگر چہ بڑی احتیاط سے سازش تیار کی تھی لیکن اس کا بھانڈا پھوٹ گیا اور ادھم بائی اور غازی الدین نے اس سے خوب فائدہ اٹھایا اور شہنشاہ دہلی احمد شاہ کو صفدر جنگ کے خلاف بھڑکا کرا سے وزارت سے معزول کرا دیا صفدر جنگ کو اودھ کی گورنری پر جانا پڑا۔ اس کی جگہ غازی الدین کے ماموں خان خاناں انتظام الدولہ کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ لیکن ماموں اور بھانجے میں چل گئی اس لئے ایک ہی ماہ کے اندر انتظام الدولہ بھی ادھم بائی اور غازی الدین کی سازش کا شکار ہوئے غرض وزارت اور سپہ سالار لشکر دونوں عہدوں پر غازی الدین نے قبضہ کر لیا۔

معین الملک کو جب معلوم ہوا کہ ان کا ہونے والا داماد وزیر اعظم ہو گیا ہے تو انہوں نے مناسب سمجھا کہ وہ غازی الدین کو مبارکباد پیش کریں اور ساتھ ہی احمد شاہ ابدالی کے کشمیر اور پنجاب پر قبضہ کی تفصیلات سے بھی دربار دہلی کو آگاہ کر دینا چاہتا تھا۔ اس لئے معین الملک نے دو الگ الگ خط لکھے۔ ایک غازی الدین کے نام اور دوسرا شہنشاہ دہلی کو۔ اگر چہ اب وہ سلطنت دہلی کا ماتحت نہیں تھا لیکن قدیم نمک خواری کے جذبہ کے تحت وہ شہنشاہ دہلی سے بھی اپنے تعلقات استوار رکھنا چاہتا تھا۔

ادھر سلطنت بیگم کو ملکی معاملات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا منگیتر دہلی کا وزیر اعظم ہو گیا ہے تو اسے بے انتہا خوشی ہوئی۔ پھر جب اس کی خاص سہیلی شامہ نے بتایا کہ اس کے شوہر کو قاصد بنا کر دہلی بھیجا جا رہا ہے تو اس کے دل میں ایک نیا خیال پیدا ہوا۔

''شامہ! میں دہلی ایک خط بھیج رہی ہوں۔''

سلطنت نے مسکرا کر انکشاف کیا۔

''خط اور دہلی؟''

شامہ نے تعجب کیا اور پوچھا۔

''امیر زادی کی کون سی سہیلی دہلی میں ہے جسے خط لکھا جا رہا ہے۔''

''کیوں کیا دہلی سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے''

سلطنت چڑ کر بولی۔

''سوائے ایک ٹوٹے پھوٹے منگیتر کے مجھے وہاں کوئی اور تو نظر نہیں آتا۔''

شامہ نے شوخی سے کہا پھر مزید چڑانے کو بولی:

''اور وہ کمبخت ہے کہ اسے خیال ہی نہیں آیا کہ ایک ہجر وفراق کی ماری لاہور میں بیٹھی اس کی جدائی میں آنسو بہا رہی ہے۔''

''بس زبان کو لگام دے۔''

سلطنت نے مصنوعی غصہ کیا اور کہا۔

"تجھے اب خبر نہیں ہے کہ وہ وزیر اعظم ہو گئے ہیں۔ بابا کہہ رہے تھے کہ دہلی کی فوجوں کے سپہ سالار بھی وہی ہیں۔"

"واہ امیر زادی! غازی الدین اب "وہ" ہو گئے ہیں۔"

شامہ نے اسے چھیڑا۔

"اور وہ ایسے سنگ دل کے دو سال سے انہوں نے آپ کی خبر بھی نہ لی اور نہ ہی عید نہ بقر عید، ایک بھی جوڑا انہیں بھیجنا نصیب نہ ہوا۔"

"اس لئے تو میں انہیں خط لکھ رہی ہوں۔"

یہ کہہ کر سلطنت خود ہی شرما گئی۔

"کیا خط لکھ لیا ہے؟"

"بس سمجھو کہ لکھ ہی لیا ہے۔"

"ذرا ارشاد تو فرمایئے کیا لکھا ہے؟"

"ابھی تو صرف سوچا ہے تو جو بتائے گی وہی لکھوں گی۔"

"اچھا تو لکھئے۔" شامہ نے مزہ لیتے ہوئے کہا۔

اور سلطنت یوں سنبھل کر بیٹھ گئی جیسے وہ واقعی خط لکھوا رہی ہو۔ شامہ نے پیشانی پر انگلی رکھ کے آنکھیں پٹ پٹائیں اور پھر بولی۔

" لکھئے کہ اے بے وفا، سنگ دل ستمگر تو نے کیوں قیامت ڈھائی ہے۔ یہ کیسی بے وفائی ہے۔ نہ خط نہ پتر، نہ سلام نہ پیام، تیرا چاند دہلی میں چمک رہا ہے اور میرا چاند گہنایا جا رہا ہے۔ اب صبر کا یارا.........۔"

"توبہ شامہ! توبہ ہے۔"

سلطنت بیگم نے شامہ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ارے کوئی لفظ تو ان کی تعریف میں کہا ہوتا۔"

"تو پھر آپ ان کے ہاتھ جوڑیئے، خوشامد کیجئے کہ آپ کو رخصت کرانے آ جائیں۔"

شامہ غصہ سے بولی۔

"یہ بھی کوئی دستور ہے کہ انسان منگنی کرنے کے بعد کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھ جائے۔ دہلی دور ہی کتنا ہے۔"

سلطنت افسردہ ہو گئی۔ شامہ نے جو کہا تھا وہ ٹھیک ہی تو تھا۔ غازی الدین اگر مصروف تھا تو کم از کم دو چار ماہ بعد ہی ایک خط بھیج سکتا تھا۔ سلطنت کو نہ سہی کم از کم معین الملک کو تو خط لکھا جا سکتا تھا۔

امیر زادی کو افسردہ دیکھ کر شامہ پریشان ہو گئی اور فوراً گلے میں بانہیں ڈال کر بولی۔

''امیرزادی! قسم لے لیجئے میں تو آپ سے مذاق کررہی تھی۔ آپ کو تو انہیں بہت پہلے خط لکھنا چاہئے تھا۔''

شامہ خاموش ہو کے کچھ سوچنے لگی پھر بولی۔

''مگر یہ خط وزیراعظم دہلی تک لے جائے گا کون؟''

سلطنت بیگم کی افسردگی دور ہو گئی چہک کے بولی۔

''وہ..........وہ........ تیرے شوہر نامدار دہلی جارہے ہیں انہیں دے دینا۔ کیا وہ میرا اتنا سا بھی کام نہیں کر سکتے۔''

''کیوں نہیں۔''

شامہ نے شرما کر کہا۔

''وہ آپ کا کام نہیں کریں گے تو میں ان سے.........''

''خفا ہو جاؤں گی، روٹھ جاؤں گی۔ کیوں ہے نا۔''

سلطنت نے کہا اور کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

سلطنت بیگم نے بڑے چاؤ سے خط لکھا خط کیا تھا اس نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا پھر اسے عطر میں بسایا اور پھر لفافہ بند کر کے شامہ کے حوالے کر دیا۔

لڑکی جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی ہے تو اس کے احساسات اور خیالات میں بتقاضہ فطرت بہت بڑی تبدیلی آجاتی ہے۔ اس تبدیلی کے زیر اثر وہ لڑکی ہمہ وقت خیالوں میں ڈوبی بہت ہی زیادہ حسین اور رومان پرور مناظر دیکھتی ہے اور اپنے ارمانوں میں ایسی ایسی خواہشات کو مجتمع کرتی ہے کہ اگر ان کو دوسرے کے سامنے بیان کیا جائے تو سننے والا یا تو اپنا سر شرم کے مارے پھوڑے یا پھر اس کی ناسمجھ عقل پر اس کا مذاق اڑانا شروع کر دے۔

لڑکی کے ذہن اور حواس پر ہر وقت ایک انجانا سا خیالی پیکر محبوب کی شکل میں چھایا رہتا ہے جسے شاید اس نے ظاہری آنکھوں سے نہ تو دیکھا ہو اور نہ ہی پرکھا ہو مگر اس کے خیالی نقوش' اس کی محبت بھری باتیں' اس کے جذباتی ارمان بھرے احساسات' اس کی ناز و ادا بھری گلکاریاں' محبوب کے لاکھوں غمزے لڑکی کو ہر وقت ایک انجانی دنیا کی سیر کرواتے رہتے ہیں۔

ایسی صورت میں اگر اس لڑکی کی منگنی ہو جائے اور اس کو اپنے خیالی پیکر کا ایک حسین مجسمہ مل جائے تو پھر اس کے احساسات کے کیا کہنے وہ تو سونے پر سہاگہ کے مصداق اپنے محبوب، اپنے دلبر اور اپنے ہونے والے ساتھی کے خیالات میں اس طرح ڈوب جاتی ہے کہ دنیا و مافیہا سے اس کی بے خبری بڑھتی جاتی ہے اور دیکھنے والا بھی با آسانی سمجھ جاتا ہے کہ لڑکی کس انجانی دنیا میں مگن ہے اور کن حسین خوابوں کی تعبیر ڈھونڈتی پھرتی ہے۔

منگنی کے بعد اگر منگیتر کی طرف سے کوئی سندیسہ کسی بھی رنگ میں نہ ملے تو ایسے میں لڑکی کے نازک احساسات کو ایک ٹھیس سی لگتی ہے اور وہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ اس کے اندر وہ کونسی کمی ہے جس کی وجہ سے اس کا منگیتر اس سے کھچا کھچا اور دور دور رہتا ہے اس کے اس کے بارے میں

کیا احساسات ہیں کیا وہ اس کو ویسی ہی پزیرائی دے گا جیسے کہ اس کے ارمان ہیں کیا وہ اسی طرح اس سے محبت کرے گا جیسی کہ ایک دوسرے میں انمٹ اور ایک دوسرے پر مر مٹنے والی ہو۔ کیا وہ تا زندگی ساتھ نباہ سکے گا؟ کیا وہ پھولوں کی سیج پر اس کے حسن کی تابانیوں کی رکھوالی کر سکے گا اور اس کی ایک ایک ادا پر اپنا سب کچھ فدا کرنے کو ہمہ وقت تیار رہے گا کیا وہ اپنی محبت کی سچائی اپنے قول و فعل اور عمل سے ثابت کرے گا یا پھر صرف اسی سے محبت اور قربانی کا طالب رہے گا کیا اسے خود ہی اپنے آپ کو اس پر قربان ہونا پڑے گا یا کہ پھر تنہائی کے زہر کا پیالہ اسے قبول کرنا پڑے گا اور اپنی ہی آگ میں خود جلنا ہوگا۔

بہر حال اس قسم کے ان گنت اچھے اور بُرے خیالات اس کے حواس پر چھائے رہتے ہیں وہ اسی کشمکش میں کبھی کھلکھلا کر ہنستی ہے، کبھی مسکراتی ہے، کبھی شرماتی ہے اور کبھی ارمانوں کی جلتی تپیا پر کڑھتی ہے اور اداس ہو جاتی ہے، کبھی خوش اور کبھی غم دونوں ہی اس کو اپنے احاطہ میں گھیرے رہتے ہیں۔

یہی حال اس زمانے میں الغرض سلطنت بیگم کا تھا کیونکہ عرصہ دو سال گزرنے کے دوران اس کے محبوب منگیتر کی جانب سے کوئی پروانہ محبت، کوئی میٹھا بول اور کوئی میٹھی سرگوشی تک نہیں ملی تھی۔ کبھی تو وہ اپنے محبوب منگیتر کی لاپرواہی پر اس کو ملعون کرتی اور کبھی اس کی انجانی مصروفیات پر اس کو مبروض کرتی تھی کبھی خوابوں میں اس کے ساتھ کلکاریاں بھرتی تھی اور کبھی مدہوشی کے عالم میں انجانے خطرات سے کانپ اٹھتی تھی اور بھی اس کے من میں کوئی ایسا انجانا جذبہ چھپا ہوا تھا جو ہزار ہا خدشات کے سامنے سینہ سپر ہو کر اس کو خوابوں اور ارمانوں کی حسین وادیوں کی سیر کرواتا تھا اور اس کو آنے والی زندگی کے حسین لمحات کی ضمانت مہیا کرتا تھا جو اس کی بے معانی خدشات کو خس و خاشاک کی طرح سمندر کی لہروں پر بہا دیتا تھا اور اس کے دل کی وادی کو حسین و شاداب بنا دیتا تھا اور بالآخر اس کو تسکین بھری تھپکیاں دے دے کر پرسکون، مطمئن بنا دیتا تھا۔

ایسے ہی امید و بیم کے پر پیچ غم میں اس نے اپنے خط میں نجانے کیا کیا کچھ لکھا تھا جس سے یا تو اس کا دل ہی واقف تھا یا اللہ رب العزت یا پھر اس کے حسین و نازک احساسات و جذبات سے اس خط کو پڑھ کر اس کا محبوب منگیتر آگاہ ہو سکتا تھا۔

خط بھیجنے کے بعد سلطنت اب رات دن انتظار کی سولی پر لٹکی اپنے محبوب کے پیار بھرے جواب کا انتظار کرنے لگی۔ اٹھتی بیٹھتی شامہ سے اپنے جذبات کا ذکر کرتی اور اس کی تسلی و تشفی پر اپنے آپ میں پرسکون ہو جاتی اور پھر حسین خوابوں کی دنیا میں گم ہو جاتی۔

شامہ نے شوہر کو تاکید کر دی تھی کہ امیر زادی کا خط اس کے منگیتر کو تنہائی میں دیا جائے۔ چنانچہ اس نے معین الملک کے دونوں خطوط حسب دستور شہنشاہ اور وزیر اعظم کو بھجوائے اور سلطنت کا خط دینے کیلئے اس نے وزیر اعظم سے تنہائی میں ملاقات کی درخواست کی۔ غازی الدین اب اس مقام تک پہنچ چکا تھا کہ اب اس کی ملاقات بادشاہ کی ملاقات سے بھی زیادہ مشکل ہو گئی تھی۔ شامہ کے شوہر کو ملاقات کیلئے دو ہفتے انتظار کرنا پڑا۔ غازی الدین اسے پھر بھی ملاقات کا وقت نہ دے سکا لیکن جب اسے کہا گیا کہ لاہور سے اس کیلئے ایک خفیہ پیغام ہے جو صرف تنہائی میں بتایا جا سکتا ہے تو وہ فوراً ملنے پر رضامند ہو گیا اور لاہور کے قاصد کو باریابی کی اجازت دے دی۔

شامہ کے شوہر نے بڑے ادب سے غازی الدین کو سلام کیا اور خوشبوؤں میں بسا ہوا لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''یہ کس کا خط ہے؟''

غازی الدین نے خط لیتے ہوئے پوچھا۔

''امیر زادی سلطنت بیگم دختر قلعہ ارلا ہور کا۔''

شامہ کے شوہر نے جواب دیا۔

''تمہارا امیر زادی کے ساتھ کیا تعلق ہے؟''

غازی الدین نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

شامہ کا شوہر گھبرا گیا لیکن پھر سنبھل کر بولا:

''وزیر اعظم محترم! میں امیر زادی کا نمک خوار ہوں اور میری بیوی ان کی خاص سہیلیوں میں شامل ہے۔''

''امیر زادی کو خط لکھنے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

غازی الدین بولا۔

''جی.....''

اور قاصد کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

''سلطنت بیگم کی منگنی غازی الدین سے ہوئی تھی۔''

غازی الدین خود ہی بولا۔

''اب وہ غازی الدین نہیں بلکہ سپہ سالار فوج اور وزیر اعظم سلطنت مغلیہ ہے۔ پھر منگنی کی حقیقت ہی کیا ہوتی ہے۔ اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ معین الملک نے سلطنت سے غداری کی۔ پنجاب اور کشمیر ابدالی کے حوالے کر دیئے۔ وہ اور اس کی بیٹی کس بناء پر ہم سے بھلائی کی امید رکھتے ہیں؟''

شامہ کے شوہر کو غازی الدین کی یہ باتیں سن کر چکر آنے لگے۔ غازی الدین نے سلطنت بیگم کا خط کھول کر پڑھنے کی زحمت بھی نہ کی۔ خط ابھی تک اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا اور وہ معین الملک کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔

شامہ کے شوہر (قاصد) نے اب وہاں ٹھہرنا اب کچھ غیر مناسب سمجھا اور نہایت ادب سے کہا:

''وزیر اعظم محترم! میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ خط کے جواب کے متعلق آپ کا کیا ارشاد ہے؟''

''جواب کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جا سکتے ہو۔''

غازی الدین نے دوٹوک جواب دے کر قاصد کو رخصت کر دیا۔

وزیر اعظم غازی الدین کے راستے کے کئی کانٹے ہٹ گئے تھے۔ صفدر جنگ اودھ کی صوبیداری پر قانع ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ غازی الدین نے

انتظام الدولہ کو ہٹا کر وزارت اور سپہ سالاری پر قبضہ کرلیا تھا۔قلعہ کی ایک مقتدر ہستی خواجہ سرا خدمتگار خاں بھی مارا جا چکا تھا۔لیکن قلعہ ابھی تک پوری طرح اس کی مٹھی میں نہیں آیا تھا۔ادھم بائی، شہنشاہ کو غازی الدین کے خلاف بھڑکاتی رہتی تھی۔شہنشاہ احمد شاہ خود بھی غازی الدین سے خائف تھا اور اس سے نجات حاصل کرنا چاہتا تھا۔اس طرح دونوں نے ایک دوسرے کے خلاف محاذ قائم کرلیا تھا۔

غازی الدین کو علماء اور معززین شہر کا پہلے سے ہی تعاون حاصل تھا۔ایک دن اس نے علماء اور معززین کو جمع کیا اور ان کے سامنے ایک زبردست تقریر کی۔تقریر میں اس نے بادشاہ کی نالائقی، بدکاری اور عیاشی کا ایسا نقشہ کھینچا کہ تمام حاضرین احمد شاہ کے خلاف ہو گئے۔غازی الدین خطابت اور خوش بیانی میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔اس نے اسی وقت علماء سے بادشاہ کی معزولی کا فتویٰ حاصل کرلیا اور پھر شہنشاہ احمد شاہ کو گرفتار کروا کر قید کر دیا۔ادھم بائی بادشاہ کے ساتھ اسیر ہوئی۔غازی الدین نے ایک قدم اور بڑھایا۔اس نے احمد شاہ اور ادھم بائی کی آنکھوں میں سلائی پھروا کر انہیں ہمیشہ کیلئے اندھا کر دیا۔چونکہ تخت دہلی خالی ہو گیا تھا اس لئے اس نے جہاندار شاہ کے بیٹے شہزادہ عزیز الدین کو عالمگیر ثانی کا لقب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔

پنجاب میں احمد شاہ ابدالی کا مقرر کردہ صوبیدار معین الملک اپنے ہونے والے داماد کے رویے سے پہلے ہی بددل تھا۔اس کے کسی خط کا جواب دہلی سے موصول نہ ہوا تھا۔سلطنت بیگم کا محبت بھرا خط اس نے پڑھنے کی بجائے نذر آتش کر دیا تھا۔سلطنت بیگم کو اس بات کا بڑا غم تھا۔اس کی فطری شوخیاں ختم ہو گئی تھی۔وہ ہر وقت خاموش خاموش سی رہتی اور اندر ہی اندر کڑھتی رہتی تھی۔

سلطنت بیگم نے ابھی غازی الدین کی بے وفائی کے صدمے سے نجات نہ پائی تھی کہ اس کا مہربان باپ معین الملک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال کر گیا۔معین الملک کی وفات سے لاہور اور پورے پنجاب میں کہرام مچ گیا۔پنجاب کا بچہ بچہ معین الملک سے محبت کرتا تھا۔وہ ایک بہادر باپ کا بیٹا تھا جس نے ابدالیوں کے قدم اب تک پنجاب سے آگے نہ بڑھنے دیئے تھے۔پنجاب اگرچہ افغانستان کو خراج دیتا تھا لیکن معین الملک نے عوام کو غلامی کا احساس تک نہ ہونے دیا تھا اور وہ صوبیدار کی بجائے ایک آزاد حکمران نظر آتا تھا۔

سوئم کی شام معین الملک کی بیوہ خالہ بیگم نے چیدہ چیدہ امیروں اور سرداروں کا اجلاس طلب کیا اور جب سب جمع ہو گئے تو خالہ بیگم نے اپنے آٹھ سال کے یتیم بچے کا ہاتھ پکڑا اور بے نقاب دربار میں پہنچ گئیں۔خالہ بیگم کی پارسائی اور پردے کی سخت پابندی لوگوں میں بہت مشہور تھی۔سرداروں نے انہیں بے نقاب دیکھا تو حیرت کے ساتھ انہیں صدمہ بھی ہوا۔لحاظ کے مارے سب کی نظریں جھک گئیں۔

خالہ بیگم نے مردانہ انداز میں حاضرین کو ''السلام وعلیکم'' کہا اور پھر بغیر کسی تمہید کے انہیں مخاطب کیا اور کہا۔

''اے ولایت پنجاب کے وفادارو! آپ لوگ مجھے بے نقاب دیکھ کر ضرور متعجب ہوئے ہوں گے لیکن کیا کروں اب میرا ساتھی بچھڑ گیا ہے اور آپ کے سر سے معین الملک کا سایہ اٹھ گیا ہے تو میں اپنے چہرے پر نقاب کیوں رکھوں۔آپ میں سے جو شخص میرے سے بڑا ہے وہ میرے باپ کی مانند اور دوسرے لوگ میرے بھائی ہیں۔باپ اور بھائیوں سے پردہ نہیں کیا جاتا۔اس لئے تو میں نے اس رسم کو توڑ ڈالا ہے۔میں چاہتی ہوں کہ آپ کے روبرو گفتگو کروں اور ہم سب پر جو مصیبت آئی ہے اس کی تدبیر کروں۔''

''محترم خالہ بیگم۔''

ایک عمر رسیدہ سردار نے کہا۔

''امیر معین الملک کی وفات سے جو صدمہ پہنچا ہے اس میں ہم سب آپ کے شریک ہیں۔لیکن ہم آپ کی اور امیر زادے کی موجودگی میں بے سہارا اور بے سائباں محسوس نہیں کرتے۔اصولی طور پر معین الملک مرحوم کے امیر زادے اس ولایت کے وارث ہیں اور آپ ان کی سرپرست۔ ہم آپ سے ہر ممکن تعاون کرنے پر تیار ہیں۔''

''میں برادر محترم کی شکر گزار ہوں۔''

خالہ بیگم نے متانت سے کہا۔

''لیکن حکومت کے معاملات میں اصول نہیں چلا کرتے۔پنجاب کی ولایت کی سند مرحوم کے نام تھی۔ان کی وفات کے ساتھ یہ بے اثر ہوگئی۔ہم خود کو اس کا دعویدار یا حقدار کس طرح سمجھ سکتے ہیں۔''

''عالی مقام خالہ بیگم!''

دوسرے سردار نے کہا۔

''آپ کا فرمانا بجا ہے۔فرمایئے ان حالات میں آپ کیا قدم اٹھانا چاہتی ہیں یا آپ کے ذہن میں اس کا کیا حل ہوسکتا ہے۔دہلی یا غزنی جس دربار کی طرف آپ کا جھکاؤ ہوگا ہم آپ سے تعاون کریں گے۔''

''میرے بزرگوں اور بھائیو!''

خالہ بیگم افسردگی مگر استقلال سے بولیں۔

''کون جانتا تھا کہ ہم میں سے وہ ہستی اٹھ جائے گی جو دہلی اور غزنوی دربار میں توازن برقرار رکھتی تھی۔ہم ان کے نقش قدم پر چلنے کیلئے اب بھی آمادہ ہیں۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے دہلی دربار والوں سے امید نہیں ہے۔دہلی کا وزیر اعظم غازی الدین ہم سے پہلے ہی ناراض ہے۔اس کا خیال ہے کہ ہم نے شاہ افغانستان سے سازش کر کے پنجاب کو دہلی سے الگ کروایا ہے۔اس وقت تک اسے پنجاب کے وارث کی وفات کی اطلاع مل چکی ہوگی اور وہ یقیناً پنجاب پر قبضہ کرنے کی سوچ رہا ہوگا۔''

''ہم نے غزنی بھی تو اطلاع بھیجی ہے۔''

ایک سردار نے باور کروایا۔

''ٹھیک ہے ہم نے قاصد غزنی بھیج دیا ہے۔''

خالہ بیگم نے متانت سے کہا۔

''خالہ بیگم مناسب سمجھیں تو ایک اور تیز رفتار قاصد غزنی بھیج دیا جائے۔''

کسی نے تجویز پیش کی۔

''یہ تجویز معقول ہے۔''

خالہ بیگم نے تجویز کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن اس کے ساتھ میری یہ بھی درخواست ہے کہ قاصد کے فرائض مجھے سونپے جائیں۔ میں غزنی تنہا نہیں جاؤں گی بلکہ اپنے ساتھ معین الملک کے اس بچے کو بھی ساتھ لے کر جاؤں گی۔ اس طرح میں شاہ افغانستان سے پنجاب اور دہلی کے تمام واقعات تفصیل سے بیان کر سکوں گی اور ان سے پنجاب کے تحفظ کی ضمانت حاصل کرنے کی کوشش کروں گی۔''

سب نے اس رائے سے اتفاق کیا۔ خالہ بیگم دربار برخاست کر کے محل میں واپس آ گئیں۔ سلطنت بیگم کو زمانے کی اونچ نیچ سمجھائی۔ سلطنت بیگم لاہور میں تنہا رہنے پر کسی بھی طرح آمادہ نہ ہوتی تھی۔ خالہ بیگم نے اس کی سہیلی شامہ کی مدد حاصل کی اور پھر دونوں نے مل کر سمجھایا کہ جوان جہان لڑکی کا دور دراز کا سفر کرنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔ آخر کار سلطنت بیگم کو رضامند ہونا پڑا۔

دوسرے دن خالہ بیگم نے پچاس سواروں کے ساتھ غزنی کا رخ کیا۔ انہیں غزنی پہنچنے کی جلدی تھی اس لئے انہوں نے راستے میں بہت کم قیام کیا۔ غزنی پہنچ کر معلوم ہوا کہ شاہ افغانستان احمد شاہ ابدالی قندھار گیا ہوا ہے۔ خالہ بیگم نے شاہ کی واپسی کا انتظار کرنے کی بجائے قندھار کا قصد کیا اور راستے کی صعوبتیں برداشت کرتی ہوئی قندھار پہنچ گئیں۔ شاہ افغانستان کو ان کی آمد نے بہت متاثر کیا۔ جب خالہ بیگم اور کم سن امیر زادے کو ان کے سامنے پیش کیا گیا تو شاہ ان کے احترام میں کھڑا ہو گیا۔

''ہم اپنی بیٹی خالہ بیگم کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔''

احمد شاہ ابدالی نے خالہ بیگم کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

خالہ بیگم نے پہلے حیران نظروں سے شاہ کو دیکھا اور پھر شدت جذبات سے ان کے آنسو نکل آئے۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا:

''شاہ عالی مقام نے مجھے بیٹی کہہ کر میرے غموں کو ہلکا کر دیا ہے۔ اب میں اپنے آپ کو بے سہارا نہیں سمجھتی۔ مجھے امید ہے کہ شاہ معظم اس یتیم کے سر پر بھی شفقت کا ہاتھ رکھیں گے۔''

''کیوں نہیں خالہ بیگم۔''

شاہ افغانستان نے معصوم شہزادے کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر کھڑا کر دیا۔

''آج سے ہم اس کے سرپرست ہیں اور پنجاب کی امارت کی سند امیر زادے کے نام لکھتے ہیں۔''

''خدا آپ کو ہمیشہ زندہ و سلامت رکھے۔'' خالہ بیگم خوش ہو کے بولیں:

شاہ نے میرا خالی دامن خوشیوں سے بھر دیا ہے۔

پھر خالہ بیگم نے مختصر طور پر پنجاب اور دہلی کے حالات سے شاہ کو آگاہ کیا۔

''تمہیں کسی طرح کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

شاہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''پنجاب معین الملک کا تھا اور ہم اس کی اولاد کا حق تسلیم کرتے ہیں۔ ہم شاہی فرمان جاری کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ تم مہمان خانہ میں آرام کرو۔''

خالہ بیگم لاہور سے چلی تھیں تو بہت پریشان تھیں۔ انہوں نے شاہی دربار نہیں دیکھا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں کہ پتہ نہیں شاہ ان کو باریابی کی اجازت دیں گے یا نہیں۔ باریابی کی اجازت حاصل ہوئی تو وہ شاہ سے کس طرح گفتگو کریں گی اور پنجاب کی امارت کی سند کس بنیاد پر اور کس دلیل پر حاصل کریں گی۔ لیکن انہیں کسی گفتگو یا دلیل کی ضرورت پیش نہ آئی۔ عقل مند شاہ افغانستان ان کی آمد کا مقصد خود ہی سمجھ گیا تھا اور اس نے ان کی مراد پوری کردی تھی۔

چار روز کے بعد خالہ بیگم سند حاصل کرنے اور واپسی کی اجازت لینے دربار گئیں۔ امیر زادہ ان کے ساتھ تھا۔ شاہ پہلی جیسی ہی شفقت اور محبت سے پیش آیا۔ اس نے امیر زادے کو پیار کیا اور اپنے گلے سے ایک ہار اتار کر اس کے گلے میں ڈال دیا۔

''خالہ بیگم''

بادشاہ نے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا۔

''تم امیر زادے کی سرپرست ہو۔ ہم پنجاب کو خوشحال اور پُرسکون دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگر دہلی کی طرف سے کوئی خطرہ پیدا ہو یا کوئی اور اندرونی فتنہ اٹھ کھڑا ہو تو فوراً اطلاع کر دینا ہم خود تمہاری مدد کو پہنچیں گے۔''

خالہ بیگم امارت کی سند لے کر خوشی خوشی واپس آ گئیں۔ لاہور میں جشن منایا گیا لیکن فلک کو ان کی یہ خوشی نہ بھائی۔ افغانستان سے واپسی کے پندرھویں روز امیر زادہ اچانک بیمار ہوا اور بیمار بھی ایسا کہ حکیم اور طبیب مرض کی تشخیص بھی نہ کر پائے اور امیر زادہ ملک عدم کا راہی ہوا۔

پنجاب میں ایک بار پھر کہرام مچ گیا۔ خالہ بیگم اور سلطنت بیگم کا حال دیکھا نہ جاتا تھا۔ ماں بیٹی زمین پر پچھاڑیں کھاتیں اور اس طرح بین کرتیں کہ دیکھنے والے اور سننے والوں کے کلیجے پھٹنے لگتے۔ زنانخانہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا اور مردانے میں جیسے پورا شہر جمع ہو گیا تھا۔ معین الملک کا زخم ابھی بھرا نہ تھا کہ خالہ بیگم اور سلطنت بیگم کو نیا زخم لگا۔ جس نے انہیں بالکل نڈھال کر دیا۔

کفن دفن کے وقت عورتیں اور مرد پھوٹ پھوٹ کر روئے اور وہ رات قلعہ والوں اور شہر والوں پر بہت بھاری گزری۔ رونے کی آوازیں دور دور تک سنائی دے رہی تھیں۔

لاہور پھر بے امیر رہ گیا۔ امیر زادے کی سند امارت اس کی وفات کے بعد بے اثر ہو گئی۔ سردار خالہ بیگم کے پاس جمع ہوئے اور پھر اس پر سوچ و بچار شروع ہو گیا۔ خالہ بیگم اپنے حواسوں میں نہ تھیں۔ وہ ایک ایک کا منہ دیکھتیں اور ٹھنڈی سانسیں لیتی رہیں۔ سلطنت بیگم بھی پردے کو خیر باد کہہ کر دربار میں آ گئیں۔ شامہ اس کے ساتھ تھی۔ وہ سرداروں کو کیا مشورہ دیتیں۔ جب تک دربار میں رہیں سلطنت اور شامہ خالہ بیگم کو سنبھالتی رہیں۔ سرداروں نے اپنے طور پر کچھ فیصلے کئے اور امیر زادے کی موت کی اطلاع شاہ افغانستان کو بھجوادی۔ ان کا خیال تھا کہ شاہ اپنے کسی سردار کو

پنجاب کا گورنر بنا کر بھیجے گا۔ لیکن سب کی امیدوں اور اندازوں کے خلاف مشفق اور مہربان شاہ افغانستان نے پنجاب کی امارت کی سند خالہ بیگم کے نام لکھ کر بھیج دی اور اپنے پورے تعاون کا یقین دلایا۔ اس نے معین الملک کی بیوی کو منہ سے ہی نہیں بیٹی کہا تھا بلکہ اس نے اس کلام کا حق بھی ادا کر دیا تھا۔ خالہ بیگم کو صبر کی سل سینے پر رکھ کر پنجاب کی امارت سنبھالنی پڑی۔

پھر ایک ہفتہ بعد ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس کا کسی کو وہم و گمان نہ تھا۔ دہلی دربار کے دس امیر لاہور پہنچے اور خالہ بیگم سے ملاقات کی درخواست کی۔ خالہ بیگم نے فوراً دربار لگایا اور امیروں کو خوش آمدید کہا۔ دربار میں خاموشی چھائی ہوئی تھی اور کسی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ امیر کس مقصد سے آئے ہیں۔

آخر دہلی کے امیر نے زبان کھولی اور کہا۔

''وزیراعظم اور سپہ سالار لشکر سلطنت مغلیہ عماد الملک غازی الدین نے والیٔ پنجاب محترمہ خالہ بیگم کی خدمت میں بعد ادب سلام پیش کیا ہے اور اس بات کی خواہش اور درخواست کی ہے کہ ان کی منگیتر سلطنت النساء بیگم کے عقد اور رخصتی کا اہتمام کیا جائے۔ وزیراعظم اس رسم کی ادائیگی کیلئے بنفس نفیس لاہور تشریف لا رہے ہیں۔ امید ہے کہ والیٔ پنجاب کو عقد اور رخصتی میں کوئی عذر نہ ہو گا۔''

پورا دربار اس درخواست پر حیران رہ گیا۔ سلطنت بیگم اور غازی الدین کی منگنی کو ایک عرصہ گزر چکا تھا۔ لوگ اسے بھول بھال چکے تھے۔ خالہ بیگم تذبذب میں مبتلا ہو گئیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ امیروں کے اس وفد کو کیا جواب دیں۔

خالہ بیگم نے درباریوں پر طائرانہ نظر ڈالی اور پوچھا:

''محترم وزیراعظم اس وقت کہاں ہیں۔''

''وزیراعظم اس وقت دہلی سے چل چکے ہوں گے۔''

امیر نے جواب دیا۔

''انہوں نے ہمیں ایک دن پہلے اس لئے بھیجا ہے کہ ہم آپ کی رضامندی حاصل کریں اور آپ کو رخصتی کے انتظام کیلئے کچھ وقت مل سکے۔''

''معزز امیر مہمان خانے میں آرام فرمائیں۔ ہم شام کو اس بات کا جواب دیں گے۔''

خالہ بیگم کو سوچنے سمجھنے اور مشورہ کرنے کیلئے وقت درکار تھا۔

انہوں نے فوراً دربار برخاست کر دیا اور دہلی کے امیر مہمان خانے میں چلے گئے۔

محل پہنچ کے خالہ بیگم نے اپنے اعتماد کے خاص خاص سرداروں کو طلب کیا انہوں نے دربار خاص میں اپنی بیٹی سلطنت بیگم اور اس کی سہیلی خاص شامہ کو بھی شریک ہونے کا حکم دیا۔

دربار کی بات محل تک پہنچ گئی۔ کنیزیں اور سہیلیاں سلطنت بیگم کو گھیرے ہوئے تھیں۔ اسے چھیڑ رہی تھیں اور مبارک باد دے رہی تھیں۔ سلطنت نے بڑی مشکل سے ان سے پیچھا چھڑایا اور شامہ کو ساتھ لے کر ماں کی طرف چل دی۔ وہ اس وقت بہت خوش تھی۔

شامہ نے چلتے ہوئے کہا:

''خوش تو میں بھی بہت ہوں۔لیکن مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے منگیتر کو ایک دم تمہارا خیال کیسے آ گیا۔ جبکہ تمہیں یاد ہے ناں تمہارے خط کا انہوں نے کیا حشر کیا تھا اور کیا کیا کہا تھا۔انہوں نے تو کہا تھا کہ منگنی کی کوئی حیثیت نہیں لیکن اب اچانک......''

شامہ کی باتوں میں بڑا وزن تھا۔سلطنت بیگم بھی گھبرا گئی اور اس کے قدم چلتے چلتے رک گئے۔

''شامہ!......دل تو میرا بھی اندر سے ہول رہا ہے......لیکن اب انکار کرنا بھی کچھ مناسب نہیں ہے......کیا پتہ ان کا دل پلٹ گیا ہو یا پھر میری دن رات کی دعاؤں کا اثر ہو۔''

''اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وزیر اعظم تمہیں لینے آ رہے ہیں یا پھر لاہور پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔''

شامہ کے منہ سے یہ بات ایسے نکل گئی جیسے کسی غیبی طاقت نے اس سے کہلوایا ہو۔

شامہ کے منہ سے بالکل سچی بات نکلی تھی۔غازی الدین تو شروع سے ہی پنجاب پر دانت لگائے بیٹھا تھا۔لیکن اسے شاہ افغانستان احمد شاہ ابدالی کا بھی ڈر تھا۔وہ علی الاعلان پنجاب پر فوج کشی کا خطرہ مول لینے پر آمادہ نہ تھا بلکہ کسی ایسے منصوبہ پر عمل کرنا چاہتا تھا جس سے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔پس اس نے بارات کا بہانہ تراشا اور لشکر لے کر پنجاب کی طرف روانہ کیا۔اپنے چلنے سے پہلے اس نے امیروں کا ایک وفد آگے روانہ کر دیا تا کہ وہ لاہور والوں کو غفلت میں مبتلا رکھیں اور وہ بغیر کسی مزاحمت کے لاہور میں داخل ہو جائے۔

خالہ بیگم بھی اب جہاندیدہ ہو گئی تھیں۔انہوں نے دربار میں اپنے خدشات کا کھلے لفظوں میں اظہار کیا۔انہوں نے کہا:

''غازی الدین کی نیت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔وہ اگر قلعہ میں داخل ہو گیا تو پھر اس کا نکلنا ناممکن ہو گا۔''

سب سے پہلے شامہ نے خالہ بیگم کے خدشات سے اتفاق کیا۔سوار بھی چوکنا ہو گئے۔آخر طے یہ ہوا کہ غازی الدین کو لاہور پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں روک لیا جائے۔سلطنت بیگم کے نکاح اور رخصتی سے خالہ بیگم کو انکار نہیں تھا کیونکہ سلطنت خود بھی رخصت ہونا چاہتی تھی۔

غازی الدین کے خطرے سے بچنے کیلئے یہ صورت نکالی گئی کہ خالہ بیگم نے بیٹی کو فوراً دلہن بنوایا اور دہلی کے امیر کو گواہ بنا کر سلطنت بیگم اور غازی الدین کا نکاح پڑھوا دیا۔دہلی کے امیر اس لئے انکار نہ کر سکے بادشاہوں اور وزیروں کی شادیاں اکثر اسی طرح ہوا کرتی تھیں۔دلہا کے وکیل دلہن کے گھر جاتے اور نکاح پڑھوا کر دلہن کو رخصت کرا لاتے۔پھر انہیں یہ بھی خطرہ تھا کہ اگر انہوں نے نکاح نہ مانا تو سازش کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

سلطنت نہ مایوں بیٹھی، نہ مہندی آئی اور نہ ہی برات چڑھی۔دولہا کی طرف سے دہلی کے امیر اور دلہن کی طرف سے لاہور کے سردار۔ قاضی نے نکاح پڑھوایا اور اسی وقت رخصتی کی تیاریاں ہونے لگیں۔خالہ بیگم نے بڑے ساز و سامان اور جہیز کے ساتھ آنسو بہاتی بیٹی کو دہلی کے امیروں کے ساتھ رخصت کر دیا۔

غازی الدین کو اپنی کامیابی کی سو فیصد امید تھی۔وہ اپنے لشکر کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہا تھا۔اسے امید تھی کہ کوئی امیر لاہور سے یہ خبر لائے گا کہ خالہ بیگم رضامند ہو گئیں ہیں اور بارات کے استقبال کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔غازی الدین کو صرف ایک امیر کے آنے کی امید تھی لیکن

جب وہ جالندھر پہنچا تو اس کے تمام امیر پہلے ہی وہاں پہنچ چکے تھے۔ یہی نہیں بلکہ اس کی منگیتر منکوحہ ہوکر امیروں کے ساتھ آئی تھی اور ساتھ میں بے شمار جہیز بھی لائی تھی۔ غازی الدین اس خبر سے آگ بگولہ ہوگیا اس کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔

غازی الدین نے دلہن کا استقبال کرنے کی بجائے اپنے ایک خاص گرگے آدینہ خان کو دو ہزار سواروں کو ساتھ دے کر لاہور پر قبضہ کرنے کیلئے بھیج دیا۔ اس نے آدینہ خان کو ہدایت کی کہ وہ چکر کاٹ کر لاہور پہنچے اور جاتے ہی قلعہ پر قبضہ کرلے۔ خالہ بیگم سے وہ بہت ہی جلا ہوا تھا کیونکہ اس نے چالاک دست داماد کی سازش ناکام بنادی تھی۔ اس نے آدینہ خان کو یہ بھی حکم دیا کہ خالہ بیگم کو گرفتار کرکے پابہ زنجیر دہلی لایا جائے۔

لاہور والوں کو اس ناگہانی کی کوئی خبر نہ تھی۔ سلطنت بیگم کو رخصت کرکے وہ مطمئن ہوگئے تھے۔ دہلی کے سوار راستہ کاٹ کر رات کے وقت اک دم قلعہ پر جاپڑے۔ قلعہ والوں کو مداخلت کا موقع نہ مل سکا اور قلعہ پر دہلی والوں کا قبضہ ہوگیا۔ قلعہ سے افغانستان کا پرچم اتار کر مغل پھریرا اڑایا گیا۔ خالہ بیگم گرفتار ہوگئیں اور انہیں طوق وسلاسل کے ساتھ دہلی بھیج دیا گیا۔

بدقسمت سلطنت بیگم زمانے کی خوشی کیا دیکھتی اسے شوہر کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوا۔ غازی الدین نے ماں بیٹی کو دہلی کے قلعہ میں قید کر دیا اور ان پر سخت پہرہ لگادیا۔

دہلی میں جو طوفان بدتمیزی برپا تھا اس سے شاہ افغانستان بے خبر نہ تھا۔ لیکن مرحوم معین الملک نے اس کے کان میں یہ بات ڈال دی تھی کہ سلطنت دہلی بہرحال مسلمان حکومت ہے اگر سلطنت ختم ہوگئی تو برصغیر کے مسلمان بے سہارا ہوجائیں گے۔ یہ بات احمد شاہ ابدالی نے اپنی گرہ سے باندھ لی تھی اور اب تک دہلی کے معاملات سے چشم پوشی اختیار کررہا تھا۔ لیکن جونہی اسے پنجاب پر مغلوں کے قبضے اور اپنی منہ بولی بیٹی خالہ بیگم کی گرفتاری کی خبر ملی تو فوراً گھوڑا منگوا کر سوار ہوا اور لشکر کو پیچھے آنے کا حکم دے کر اٹک تک پہنچ گیا۔

آدینہ خان اس وقت پنجاب کا گورنر تھا۔ اس نے ابدالی لشکر کے آنے کی خبر سنی تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ قلعہ کو چھوڑ کر پہاڑیوں میں جاچھپا۔ احمد شاہ ابدالی کے سامنے آنے کی کسی نے جرأت نہ کی۔ اس نے لاہور کی پرواہ نہ کی اور لشکر لیے سیدھا قلعہ دہلی کے سامنے نمودار ہوا۔ جمنا پار اس نے لشکر اتارا اور حملہ کرنے کی تیاری شروع کردی۔

غازی الدین طاقت کے زعم میں لاہور پر قبضہ کرکے اپنی بیوی اور ساس کو گرفتار تو کر لایا تھا لیکن اب اسے اپنی موت سامنے نظر آرہی تھی۔ وہ بس نام کا ہی غازی تھا۔ سرداروں کو مشورے کیلئے بلایا تو معلوم ہوا کہ نصف سے زیادہ سردار دہلی چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اور کچھ سرداروں نے جمنا پار احمد شاہ ابدالی کی اطاعت قبول کرلی ہے۔ مصیبت آئی تو گہرے دوستوں تک نے ساتھ چھوڑ دیا۔

غازی الدین ہر طرف سے ناامید ہوا تو بیوی اور ساس کا خیال آیا۔ فوراً حکم دیا کہ خالہ بیگم اور سلطنت بیگم کی زنجیریں کھول دی جائیں۔ چند آدمیوں نے قید خانہ میں جاکر ماں بیٹی کو طوق وسلاسل سے آزاد کیا۔ انہیں باہر کے حالات کی خبر نہ تھی۔ وہ گھبرا کر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں اور پوچھنے لگیں کہ یہ انقلاب کیسا ہے۔ غازی الدین ایک دم دشمنی سے دوستی پر کیسے اتر آیا۔ لیکن کسی کو کچھ بولنے یا بتانے کی اجازت نہ تھی۔ وہ انہیں آزاد کرکے باہر چلے گئے۔ خالہ بیگم اور سلطنت بیگم کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں اور کدھر جائیں۔

خالہ بیگم اور سلطنت بیگم گم صم بیٹھی اپنے گلے اور کلائیوں کو سہلا رہی تھیں۔ جن پر طوق اور زنجیروں کے نشانات ابھر آئے تھے۔ اسی وقت انہوں نے غازی الدین کو آتے دیکھا۔ منگنی کے بعد سے انہوں نے غازی الدین کو نہیں دیکھا تھا ہاں تصویر دیکھی تھی اس لئے انہیں پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔ دونوں اس کی تعظیم کیلئے اٹھیں اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئیں کہ دیکھیں اب کون سی تازہ مصیبت نازل ہوتی ہے۔

غازی الدین بھی سر جھکائے ان کے پاس پہنچا اس کے ساتھ اس وقت کوئی محافظ نہ تھا۔ خالہ بیگم کے پاس پہنچ کر وہ دوزانو ہو کر فرش پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنا سر خالہ بیگم کے قدموں میں رکھ دیا۔ خالہ بیگم گھبرا کر پیچھے ہٹ گئیں۔

''یہ کیا ہے غازی الدین؟''

انہوں نے بدحواسی کے عالم میں پوچھا۔

''مادر مہربان خالہ بیگم۔''

غازی الدین نے بغیر سر اٹھائے کہنا شروع کیا۔

''میں نالائق ہوں، نافرمان ہوں۔ میں نے آپ کو بے عزت کر کے اپنے لئے جہنم تیار کرلیا ہے۔'' وہ خالہ بیگم کے قدموں سے لپٹ گیا۔

''کیا کہہ رہے ہو غازی الدین۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔''

خالہ بیگم حالات کی اس اچانک تبدیلی سے بوکھلا گئی تھیں۔ ان کی سمجھ میں واقعی کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہیں اور کیا کریں۔ انہوں نے غازی الدین سے مخاطب ہو کر کہا:

''اٹھ کر بات کرو۔ غازی الدین انسان کو سجدہ کرنا شرک ہے۔''

''میں آپ سے آنکھیں نہیں ملا سکتا۔ خالہ بیگم!''

غازی الدین گڑگڑایا۔

''میں نے آپ کو اور سلطنت کو بہت دکھ دیئے ہے۔ مجھے معاف فرما دیجئے مادر مہربان۔''

''اچھا کھڑے ہو جاؤ۔''

خالہ بیگم بھرائی ہوئی آواز میں بولیں:

''جو ہماری قسمت میں تھا وہ پورا ہو گیا۔ مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے میں تمہیں معاف کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ بھی تمہیں معاف کرے۔''

غازی الدین اٹھ کھڑا ہوا اور ان کے ہاتھوں کو چومنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے چور نظروں سے سلطنت کی طرف دیکھا اور کہا

''سلطنت! تم بھی مجھے معاف کر دو۔''

گو سلطنت نے اپنے خاوند کے ہاتھوں بہت زیادہ دکھ اٹھایا تھا لیکن اسے پھر بھی ایک خیال، ایک جذبہ اندر ہی اندر اکسا تا رہتا تھا کہ شاید کسی غلطی کی بناء پر اس کا شوہر اس سے ناراض ہو کر ایسے بڑے قدم کو اٹھانے پر مجبور ہوا اور اسے ایک انجانی موہوم سی امید اب بھی تھی کہ جیسے ہی اس

کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا وہ فوراً اس سے آن کر معافی مانگے گا اور اس کے ارمانوں کی اجڑی بستی اور مانگ کو پھر سے ہرا بھرا کر کے اس کی مانگ میں سیندور بھر دے گا اور اس کو نئے سرے سے محبت کے ان دیکھے جھولے میں جھلاتا ہوا آسمان کی ان گنت پنہائیوں سے روشناس کروائے گا اور ہر دکھ کا سکھ سے مداوا کرے گا اسی خیال کے پیش نظر سلطنت شرم سے دوہری ہوتی جارہی تھی اس نے کہا:

''آپ مجھے گناہ گار کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے اور زندہ وسلامت رکھے۔''

غازی الدین دونوں کو ساتھ لے کر باہر آیا۔ وہاں شاہی سواری موجود تھی۔ اس میں خالہ بیگم اور سلطنت بیگم کو سوار کرایا اور انہیں اپنے محل میں لے آیا۔ ان کیلئے فوراً نئے ملبوسات منگوائے اور بہترین کھانے سے ان کی تواضع کی۔ خالہ بیگم داماد کے اس حسن سلوک سے بہت متاثر ہوئیں۔

سلطنت بیگم اتنے عرصے کے بعد اپنے شوہر غازالدین کی نظر التفات سے اتنا مسحور ہوئیں کہ اپنے آپ کو عشق ومحبت کی فضاؤں میں اڑتا محسوس کرنے لگیں۔ آخر کاران کے دل نے محبت کی بازی جو جیت لی تھی۔

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی وترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچایئے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

شہزادی ارمانوس......ایک تعارف

ملک مصر کی ایک ایسی شہزادی کی کہانی جو ملکہ قلوپطرہ کے بعد شاید اس کا حسن ثانی تھی یہی وجہ ہے کہ اس کے حسن کے چرچے ہر چہار سو پھیلے ہوئے تھے لیکن وہ شاہ مقوقس کی بیٹی ہونے کے باوصف ایک بے بس پرندے کی طرح اپنے ہی محل میں تلملاتی اور پھڑ پھڑاتی پھرتی تھی مصر پر اگر چہ حکومت قبطی بادشاہ مقوقس کی تھی لیکن وہ تو صرف نام کا بادشاہ تھا جبکہ اصل حکمران رومی تھے اوران کا سپہ سالار جرجیس تھا جو شیطان ثانی کے نام سے مشہور تھا اوراس نے اسکندریہ کو اپنا مستقل مستقر بنا رکھا تھا اور شہزادی ارمانوس اس کے زیر نگران ایک بے آب مچھلی کی طرح اپنے ارمانوں کا خون کئے بیٹھی تھی یہی دن اس کے کھیل کود اور حسن کے تماشے دکھلانے کے تھے جبکہ اس پر اس خبیث آدمی جرنیل جرجیس کی نظریں بھوکے گدھ کی مانند لگی رہتی تھیں اور شہزادی کی آزادی کی راہ میں مخل تھیں اس کا باپ شاہ مقوقس بھی اس معاملے میں بے بس تھا اور وہ شہزادی کے لئے کچھ بھی نہ کر سکتا تھا۔

ایسے ہی حالات میں مصر پر مسلمانوں نے حضرت عمرو بن العاص کی سرگردی میں حملہ کیا اور کئی قلعے اور شہر فتح کرتے ہوئے وہ اسکندریہ کی جانب بڑھے دوسری جانب دریائے نیل جس کی جولانیاں اس وقت عروج پر آتی تھیں جب اس کی نذر کئی حسین دوشیزہ کی قربانی پیش کی جاتی تھی اور یہ قربانی مصریوں کی ایک دیرینہ اور پرانی روایت کی مرہون منت تھی تاکہ دریائے نیل اہل مصر کی شادابی اور سر سبزی کو برقرار رکھ سکے۔

قاسم ایک نوجوان مسلمان سپاہی جو جاسوس تھا عمرو بن العاص رضی اللہ تعالی عنہ کے حکم پر شہر اسکندریہ میں زخمی ہو کر پہنچا اور قسمت نے اس کے علاج معالجہ کا بندوبست شاہی محل کے اندر ہی کر دیا جہاں اس کی ملاقات شہزادی ارمانوس سے ہوئی پہلی ہی ملاقات میں نظروں کے تیروں نے ایک دوسرے کا جگر چھلنی کر دیا اور وہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے آہستہ آہستہ یہ ملاقاتیں بڑھنے لگیں اور اس کے نتیجہ میں زندگی ایک دوسرے کے زیر سایہ پروان چڑھانے کے عہدو پیمان ہوئے جبکہ جرجیس رومی جرنیل شہزادی ارمانوس کو پانے کے لئے جو بھی حربہ اختیار کرتا تھا وہ اس میں بری طرح ناکام ہو جاتا تھا بالآخر اس نے مسلمانوں کا راستہ روکنے کے لئے دریائے نیل طغیانی لانے کا منصوبہ تیار کیا اور اس کے مکمل منصوبہ بندی بھی کر لی۔ایسے میں قاسم کو اس کی اطلاع شہزادی کی ایک کنیز کے ہاتھوں مل جاتی ہے اور وہ اپنی جان پر کھیل کر شہزادی کو بچالیتا ہے۔

☆ ☆ ☆

شہزادی ارمانوس

شاہ مقوقس جو اسلام کے ابتداء سے ہی مصر پر حکمران چلا آ رہا تھا جو اپنی نسل کا چھٹا حکمران تھا اس سے پیشتر اس کے آباؤ اجداد مسلسل حکمران چلے آ رہے تھے اگر چہ وہ بہت ہی ذہین اور سمجھ دار انسان تھا اور اپنی دانش کے تحت ہرقل کا بھی منظور نظر تھا یہی وہ مقوقس تھا جس نے حضور نبی کریم ﷺ کے پیغام میں آپ کو دو کنیزیں' بہت سا مال و دولت اور دو خچر اور تلواریں بطور تحفہ بھیجیں تھیں لیکن اب وہ ہرقل شاہ روم کے باجگزار کی حیثیت سے اس کی ہر بات ماننے پر تیار تھا۔

ہرقل کی جانب سے شہر اسکندریہ کا محافظ اعلیٰ اور رومی افواج کا سپہ سالار اسکندریہ جارجس تھا جو طربون کے بعد تمام رومی افواج مصر کا ڈپٹی سپہ سالار بھی تھا یہ اپنے طرز عمل میں سخت منتقم مزاج اور حسین لڑکیوں کا دلدادہ تھا اور اکثر اپنا رعب شاہ مقوقس پر بھی جماتا رہتا تھا۔

شاہ مقوقس کی اولاد صرف ایک بیٹی تھی جو اس زمانے کی ملکہ حسن اور قلوپطرہ تھی۔ شہزادی جیسے جیسے پروان چڑھتی جا رہی تھی اس کے حسن اور خوبصورتی میں بے پناہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شہزادی دوسری شہزادیوں کی طرح محل کے اندر گم رہنے والی شہزادی نہ تھی بلکہ وہ فطرتاً بچپن سے ہی نڈر' منہ پھٹ اور کسی کو خاطر میں نہ لانے والی لڑکی تھی اس پر مستزاد یہ کہ اس نے ہر قسم کی جنگی تربیت بھی حاصل کی ہوئی تھی اور اس کے سامنے بڑے بڑے شہسوار اور بہادر بھی اس کی قوت و طاقت کا دم بھرتے تھے اور خود کو اس کے مقابلے میں کم تر گردانتے تھے۔

شاہ مقوقس بھی ہمہ وقت اس کا بہت زیادہ خیال رکھتا تھا اور اس کی کسی بھی بات سے اختلاف ہونے کے باوجود انکار کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ وہ ہر اجلاس میں شاہ مقوقس کے دائیں جانب بڑی شان و شوکت سے سنہری کرسی پر براجمان ہوتی تھی اور اکثر اپنے مشوروں سے شاہ کو نوازتی رہتی تھی۔

دوسری طرف جارجس اس کے حسن پر شکاری نظر رکھتا تھا لیکن شاہ مقوقس کی بیٹی ہونے کے ناطے سے اس پر اس کا زور نہ چلتا تھا دل ہی دل میں وہ شہزادی کو نیچا دکھانے کے لئے خیالات اور منصوبوں کے تانے بانے بنتا رہتا تھا لیکن باوصف ہر حربے کے اس کی ہر چال شہزادی کے مقابلے میں ناکام ہو جاتی تھی جس سے اس کی جھنجھلاہٹ اور غصے میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا تھا اور وہ شہزادی سے حسد کے مارے کھنچا کھنچا سا رہتا تھا۔

شہزادی بھی اس کو منہ نہ لگاتی تھی اور جب بھی اسے موقع ملتا تھا وہ اس پر مختلف طریقوں سے طنز کے گہرے وار کیا کرتی تھی اور اس کو اس بات کا احساس دلاتی رہتی تھی کہ وہ اپنی اوقات میں رہے۔ شاہ مقوقس سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی مصلحتاً خاموش رہتا تھا اور دربار میں ان کی آپس کی نوک جھونک سے نہ صرف لطف اندوز ہوتا تھا بلکہ شہزادی کی دانش مندی' طنزوں اور جوابات کو سراہتا بھی بہت تھا چونکہ شہزادی کو اپنے حسن پر بے حد ناز اور غرور تھا اس لئے اس کی نظروں میں کوئی بھی شخص نہ ٹھہرتا تھا۔ اور غرور کیوں نہ ہوا سے اللہ تعالیٰ نے حسن کی بیش بہا دولت کے ساتھ ساتھ عقل و دانش کے نگینوں سے بھی نوازا تھا۔ وہ تو کوئی آسمان سے اُتری حسن و ذہانت کے سانچے میں ڈھلی حور پری معلوم دیتی تھی۔

محل میں شہزادی کا اپنا الگ ہی راج تھا اور کوئی بھی اس کے حکم کے بغیر محل میں کھنگار بھی نہ سکتا تھا اس کی ہم جولیاں بھی اس کے عتاب سے ڈرتی تھیں اور خوشامد پسندی سے کام لیتے ہوئے اس کی ہر جائز اور ناجائز حرکت کو سراہتی رہتی تھیں ان تمام باتوں کے باوصف بھی شہزادی اخلاق و آداب کا مرقع تھی زیادہ تر اپنا کام نرم خوئی اور مسکراہٹ سے لیتی تھی۔

جس وقت وہ ہنستی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نقرئی گھنٹیاں بج رہی ہیں اور اپنے نغمہ سے کانوں میں مستی کا رنگ گھول رہی ہیں اس طرح وہ لوگوں کو مزید اپنا گرویدہ اور وارفتہ بنالیتی تھی۔ ہر فرد سے موقع محل کے مطابق برتاؤ کرتی تھی لیکن اس کی بعض باتوں کو ناپسند کرنے کے باوجود بھی لوگ اس سے پیار اور وارفتگی کا مظاہرہ کرتے تھے۔

بہرحال ماسوائے جارج کے اسکندریہ میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو شہزادی ارمانوس کا کہانہ مانتا ہو اور اس کے حکم کو بجالانے میں فخر نہ محسوس کرتا ہو۔

☆

بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضے نے سلطنت روما کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مصر کی حیثیت اس وقت روم کی ایک نوآبادی سے زیادہ نہ تھی۔ یوں تو مصر پر ''مقوقس'' کا قبضہ تھا۔ لیکن اصل طاقت قیروس (کیروس) رومی کے ہاتھ میں تھی جو شہنشاہ قسطنطین کی طرف سے مصر کا فوجی اور مذہبی گورنر تھا۔ چار ہزار کا لشکر اسلام مصری حدود میں داخل ہو چکا تھا۔ مصر پر حملہ کی خبریں چاروں طرف پھیل چکی تھیں مگر کوئی سنجیدہ آدمی اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔ رومیوں کے سالار طربون نے مسلمانوں کے ہاتھوں بیت المقدس میں عبرت ناک شکست کھائی تھی اور وہ وہاں سے بھاگ کر مصر کے سرحدی علاقوں میں پناہ گزیں تھا۔ باب مصر یعنی ''فرما'' پر اس کا قبضہ تھا اور وہ اپنے شکست خوردہ لشکر کے ساتھ ''قلعہ فرما'' میں مسلمانوں سے بدلہ لینے کی تدابیر کر رہا تھا۔

عمرو بن العاص کا لشکر انتہائی تیزی سے شہر فرما کی جانب رواں دواں تھا اس سے پیشتر انہوں نے طربون کے قبضہ سے شہر عریش بزور قوت چھین لیا تھا جس سے طربون کے دل میں انتقام کی آگ پہلے سے بھی کئی گنا بڑھ گئی تھی دوسری طرف عمرو بن العاص کا خیال تھا کہ العریش کی مانند فرما بھی وہ باآسانی طربون سے چھین لیں گے لیکن وہ طربون کی چالاکی و ہوشیاری سے بھی بخوبی واقف تھے اس لئے وہ بہت ہی محتاط انداز میں شہر فرما کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے ان کے پاس اس وقت ساڑھے تین ہزار لشکریوں کی نفری تھی انہوں نے پیش قدمی کی رفتار اس لیے بھی کم رکھی تھی کہ عقب سے رومی فوج کے حملے کی اب کوئی صورت باقی نہ رہی تھی۔

یہ سارا علاقہ صحرائی ہونے کے ناطے اونٹوں پر سفر کرنے کے لحاظ سے سب سے بہترین تھا اسی لئے شاہ مصر یہ کہنے پر مجبور ہو چکا تھا کہ صحرا میں مسلمانوں کو شکست دینا اتنا آسان کام نہیں ہے جس قدر رومی سمجھ بیٹھے ہیں۔

عمرو بن العاص نے ابھی تھوڑا سا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ان کے پاس مدینہ سے ایک انتہائی تجربہ کار جاسوس مسعود بن سہیل اپنے ساتھی فہد بن سامر اور اپنی بیوی کے ساتھ آپ کے پاس پہنچا وہ آپ کے پاس بحکم امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ آیا تھا تا کہ معرکہ مصر میں

وہ اپنا کام سرانجام دے سکے۔

مصر میں داخلے سے قبل عمرو بن العاص اپنے جاسوسوں کے ذریعہ مصری قبطی عیسائیوں کے اسقف اعظم بنیامین سے رابطہ قائم کر چکے تھے اب ان نئے آنے والے جاسوسوں کی مدد سے انہیں مصر میں اپنی کامیابی کی بہت زیادہ امید بندھ گئی تھی۔

جاسوسوں کی مدد سے عمرو بن العاص کو اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ فرما میں طربون کے پاس ان سے دوگنی تعداد میں رومی فوج موجود ہے اور اب ان کی کوشش تھی کہ قبطی اسقف اعظم بنیامین کسی نہ کسی طرح قبطی عیسائیوں کو مجبور کرے کہ وہ طربون کے ساتھ مل کر ان کا مقابلہ بالکل نہ کریں اور در پردہ مسلمانوں کے ساتھ تعاون کریں۔

نئے آنے والے جاسوسوں اور اپنے سالاروں کے ساتھ عمرو بن العاص نے اس طرح گفتگو کی کہ

''تم دیکھ رہے ہو کہ میرے ساتھ کس قدر کم لشکر ہے محاصرے کے لئے میرے پاس سامان بھی پورا نہیں ہے لیکن میں مصر کے اندر جتنی دور تک پہنچ چکا ہوں کہ اب وہاں سے واپسی میرے لئے ناممکن ہے ابھی تک میں مدینہ سے کمک کی امیدواری سے بھی محروم ہوں چونکہ مصر پر حملہ کی اجازت امیر المومنین نے میری ضد اور درخواست پر دی تھی اس لئے میں یہاں ہر قیمت پر کامیاب ہونا چاہتا ہوں۔

جاسوسوں اور سالاروں نے انہیں یقین دہانی کرائی کہ وہ ہر صورت میں کامیاب ہونگے۔

''مصر کی فتح اور شکست میرے لئے زندگی اور موت کا معاملہ ہے اگر میں ناکام ہوگیا تو میں زندہ کبھی بھی مدینہ میں نہیں جاؤں گا۔''

عمرو بن العاص نے انتہائی رندھے ہوئے لہجہ میں یہ بات کہی۔

''کیا آپ نے کوئی راستہ سوچا ہے؟'' فہد بن سامر نئے جاسوس نے استفسار کیا؟

عمرو بن العاص: ہاں! سوچا ہے اور یہ راستہ تم اور میرا جاسوس حدید مل کر ہی کھول سکتے ہیں سب سے پہلے ہمیں رسد درکار ہے' اناج اور مویشی' یہ ہم کس طرح حاصل کر سکتے ہیں اس کے لئے صرف تم ہی کام آ سکتے ہو۔

ایک سالار: میری دُعا ہے کہ ہمارے پاس مدینہ منورہ سے جلد کمک آ جائے اس لئے ہمیں انتظار کر لینا چاہیئے۔

عمرو بن العاص: میں انتظار نہ کروں تو بہتر ہے کیونکہ ہم نے مصر کا ایک شہر فتح کر لیا ہے اور دشمن کو بھی اس بات کا بخوبی علم ہے وہ کیل کانٹے سے لیس ہو کر فرما میں ہمارا انتظار کر رہا ہے اور اس انتظار میں اس نے ہمیں شکست دینے کی ہر ممکن کوشش کرنا ہے۔ بہتر ہے کہ ہم خود آگے بڑھ کر اس کے ارادے خاک میں ملا دیں۔

اے میرے جاسوس ساتھیو! اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم ان رومی سپاہ سے برگشتہ گرد و نواح کے عیسائی قبائل سے کس طرح اناج اور مویشی حاصل کرتے ہو اور ان کو اپنے ساتھ ملاتے ہو۔

فہد بن سامر: اے سپہ سالار! میں اس علاقے سے بخوبی واقف ہوں اور ان عیسائی بدوؤں کے رسم و رواج سے بھی بخوبی واقفیت رکھتا ہوں گو کہ یہ رومی سپاہ کے خوف سے عیسائی ہو چکے ہیں لیکن انہوں نے اپنے پرانے رسم و رواج ابھی تک نہیں چھوڑے ہیں۔

ان کے مذہبی عقائد کے مطابق یہ ہر ماہ قمری کی تین تاریخ کو ایک رسم مناتے ہیں اور ابھی تین تاریخ آنے میں ایک ہفتہ باقی ہے اس لئے یہ بات آپ مجھ پر چھوڑیں کہ میں ان قبائل کو کس طرح اسلامی سپاہ کی مدد کے لئے تیار کرتا ہوں اب آپ مجھے اس کے انتظامات کرنے کی اجازت دیں میں اور حدید مل کر ان انتظامات کا مکمل اہتمام کرتے ہیں تا کہ اس تاریخ پر بروقت ان قبائل کو ان کے مذہبی عقیدے کے مطابق قائل اور آمادہ کر سکیں۔

دوسری طرف طربون بھی اس بات سے غافل نہ تھا اور اسے بھی مسلمانوں کی پیش قدمی کی اطلاعات اپنے جاسوسوں کے ذریعے مل رہی تھیں اس نے بھی آس پاس کے علاقوں میں رومی فوجیوں کے دستے متعین کر رکھے تھے تا کہ مسلمانوں کو رسد کے حصول میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑے۔

مسعود بن سہیل مکی کو شتر بانوں کے بھیس میں فرما بھیج دیا گیا تا کہ وہ وہاں کی تازہ ترین صورتحال سے عمرو بن العاص کو آگاہ کر سکے وہ وہاں سے یہ خبر لایا کہ مقوقس اور طربون دونوں کا ارادہ خود فرما میں لڑنے کا نہیں ہے بلکہ انہوں نے رومی سپہ سالار فرما کو حکم بھیجا ہے کہ محاصرے میں بند نہ رہیں بلکہ قلعہ سے باہر نکل کر مسلمانوں پر بار بار حملے کریں تا کہ ان کا جانی نقصان ہوتا رہے اور انہیں شکست دینے میں آسانی ہو۔

شہر اور قلعہ فرما ایک ایسے علاقے میں واقع تھا کہ جہاں دریائے نیل سات مختلف شاخوں میں منقسم ہو جاتا تھا اس کی ایک شاخ پلوزی پر شہر پلوز قائم تھا جبکہ دوسری تمام شاخوں پر بھی کوئی نہ کوئی شہر آباد تھا بحیرہ روم کے کنارے واقع اس علاقے کی سرسبزی اور شادابی' پھلوں کے باغات کی وجہ سے سارے شہر میں بہت زیادہ اہمیت تھی یہ علاقہ گنجان آباد لیکن آسودہ حال تھا لوگوں کے مکانوں کے اردگرد باغیچے بنے ہوئے تھے یہاں کا انگور بھی بہت زیادہ مشہور تھا۔

فرما شہر کو نزدیکی پہاڑی پر بسایا گیا تھا اور اس کی حفاظت اور دفاع کا خصوصی انتظام کیا گیا تھا ایک طرف قلعہ تھا تو دوسری طرف شہر کے اردگرد مضبوط فصیل بھی تھی اس کے باوصف اس شہر کو مختلف مضبوط حد بندیوں میں تقسیم کیا گیا تھا اس طرح اس شہر کی تسخیر ناممکن بنا دی گئی تھی۔

جبکہ مصری بدو اپنے علاقے میں بہت دور دور تک پھیلے ہوئے تھے ان کا علاقہ تمام راستوں سے ہٹ کر صحرا میں واقع تھا البتہ اس صحرا میں کہیں کہیں سبزہ بھی تھا اس صحرا سے آگے سرسبز و شاداب علاقہ شروع ہوتا تھا اس کے نزدیک ہی ایک وسیع نشیب تھا برساتی موسم میں یہ نشیب پانی سے بھر جاتا تھا جس کے لیے دو بلند ترین بند باندھے گئے تھے جس سے یہ مصری بدو تین ماہ تک اپنے کھیتوں کو سیراب کیا کرتے تھے اس نشیب کے پاس چند اونچے نیچے ٹیلے اور چند ایک درخت بھی موجود تھے۔

چونکہ یہ نشیب ان بدوؤں کے لئے بہت زیادہ مقدس تھا اس لئے انہوں نے اسے بہت زیادہ خوبصورت بنا رکھا تھا اس کے قریب ہی کہیں بدوؤں کے مذہبی پیشوا اور ایک دوسردار رہتے تھے۔

رات کا وقت تھا اور چاند کی تیسری تاریخ تھی کہ کم وبیش تین ہزار بدو دائرے میں بیٹھے ہوئے تھے ان کے درمیان جگہ خالی تھی اور اس خالی جگہ کے عین بیچوں بیچ ایک قوی ہیکل مضبوط بیل ایک کھونٹے سے بندھا ہوا تھا اس کے خم کھائے سینگوں کو مختلف رنگوں سے سجایا گیا تھا اور اوپر سبز رنگ کا کپڑا ڈالا گیا تھا ریشمی کپڑا جب ہوا سے ہلتا تھا تو آس پاس کی مشعلوں کی روشنی میں اس کپڑے سے چمکیلی لہریں ابھر کر لوگوں کا دل موہ رہی تھیں بیل

کے کھروں پر بھی رنگدار چمکیلا روغن لگا ہوا تھا اور اس کے گلے میں صحرائی پھولوں کے بے شمار ہار پڑے ہوئے تھے۔

ایک جیسے لباس میں ملبوس بیس جوان لڑکیاں بیل کے اردگرد دائرے میں محورقص تھیں ان کا جسم نیم عریاں تھا اور وہ ڈھول تاشے پر ایک عجیب قسم کا رقص کرنے میں مصروف تھیں جو کہ اپنی ترتیب جیتی کے لحاظ سے بہت ہی منظم طریقے سے لوگوں کا دل لبھا رہا تھا رقص انتہائی وجد آفریں تھا اور صحرا کی مخمور خنکی میں اپنا آتشیں حسن بکھیر رہا تھا۔

بیل کے اردگرد چند ایک چکر پورے کرنے کے بعد ایک لڑکی رقص کرتے ہوئے اپنی اداؤں کے بل پر بیل کے سامنے پہنچی اور اس کا منہ چوم کر پھر دائرے میں محورقص ہو گئی اس طرح باری باری تمام لڑکیوں نے ایسا ہی کیا اور پھر یہ دائرہ ایک قطار کی شکل بناتا ہوا یکے بعد دیگرے اندھیرے میں گم ہو گیا۔

رقص کی جگہ پر پانچ مشعلیں جل رہی تھیں تیسری کا چاند اپنی آب وتاب دکھلا کر اندھیرے میں ڈوب گیا تھا اور رات تاریک ہو گئی تھی۔

آخری لڑکی کے اندھیرے میں گم ہوتے ہی سازوں کی آواز تیز ہو گئی اور شہنائیوں کی تھاپ بھی اپنا رنگ بدل کر فوجی دھن میں بدل گئی اس دھن نے نوجوانوں کے خون کو گرمایا اور پھر اچانک تاریکی کی ایک جانب سے بیس بدوؤں کا یکساں لباس میں ملبوس لشکر ایک قطار میں مشعلوں کے سامنے پہنچا اور پھر بیل کے اردگرد ایک دائرہ میں رقص کرنے لگا ان کا رقص بہت ہی زیادہ منظم تھا۔

جنگی طرز پر ناچتے ہوئے ہر جوان نے ایک ہاتھ میں برہنہ تلوار اور دوسرے ہاتھ میں ڈھال تھام رکھی تھی اور تلواروں کو مانند چرخی انتہائی تیزی سے گھما گھما کر عجیب انداز میں نظارہ پیش کر رہے تھے ڈھول اور دف کی لے مزید تیز ہو گئی اور جوانوں کے اس رقص میں بے انتہا تیزی آ گئی تماشائیوں کا جوش بھی دیدنی تھا۔

ناچنے والے ان بدوؤں میں سے دو بدوؤں نے سب سے الگ قسم کی تلواریں اٹھا رکھی تھیں جو اپنی ساخت کے لحاظ سے چوڑی اور وزنی تھیں یہ دونوں بدو ناچتے ناچتے دائرہ سے باہر نکل کر بیل کی جانب آئے اور بیل کی گردن کے ایک طرف ایک جوان اور دوسری طرف دوسرا جوان کھڑا ہو گیا باقی بدو بدستور دائرے میں محورقص رہے پھر اچانک دو رقاصائیں اندھیرے سے بھاگتی ہوئی آئیں دونوں نے پیتل کا ایک بہت بڑا تھال اٹھا رکھا تھا۔

چوڑی تلوار والے بدو نے تلوار بلند کی اور پوری طاقت سے تلوار بیل کی گردن پر سر کے قریب ماری اور آدھی گردن کاٹ دی جس کے فوراً بعد دوسری طرف والے بدو نے بھی بیل کی بقایا آدھی گردن بڑے ہی زوردار طریقے سے تلوار مار کر سر کو دھڑ سے الگ کر دیا اور بیل کا سر اس بڑے تھال میں جا گرا جو یہ دونوں لڑکیاں آمنے سامنے تھامے کھڑی تھیں۔

بیل ایک پہلو کی جانب گرنے ہی والا تھا کہ ناچنے والے دو بدو تیزی سے دوڑے آئے ان کے ہاتھوں میں مٹی کی ایک بہت بڑی تھال تھی جس کے کنارے بالشت بھر اونچے تھے بیل کے گرتے ہی انہوں نے بیل کی کٹی ہوئی گردن کے نیچے اس تھال کو رکھ دیا اور گردن کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

بیل بہت زیادہ تڑپ رہا تھا لیکن انہوں نے خون کا ایک قطرہ بھی ضائع نہیں ہونے دیا اب بدوؤں کا رقص بند ہو گیا تھا اور سب نے

تڑپتے ہوئے بیل کو قابو کر رکھا تھا۔

بیل کا خون جوان بدوؤں کے لئے متبرک تھا اس کو پانی کے مٹکوں میں ڈال کر اس کا شربت بنایا گیا اور سب بچوں' بوڑھوں' مریضوں اور عورتوں کو پلایا گیا تا کہ اس سے بیماریاں' بلائیں اور آفتیں دور ہوں۔

بیل کے گرنے کے ساتھ ہی تمام بدوؤں نے کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ آسمان کی جانب پھیلائے اور بڑے فلک شگاف نعروں سے فضا میں تھرتھلی مچا دی ایسے میں ان کا مذہبی پیشوا آگے بڑھ کر اونچی آواز میں بولا۔

''مقدس بیل کا خون مبارک ہو' تمہاری قربانی قبول ہو گئی ہے'' اچانک ایک طرف سے گونجدار آواز آئی۔ ''خدا کی آواز سنو جو سورج کو گرمی اور چاند ستاروں کو روشنی دیتا ہے۔''

مذہبی پیشوا نے وہاں کھڑے کھڑے آواز کی جانب نظر دوڑائی اس کے پاس تین یا چار بدو سردار کھڑے تھے ان کے ساتھ ہی سارا مجمع اس جانب متوجہ ہوا جدھر سے آواز آئی تھی اس طرف نشیب کا ایک کنارہ تھا اور وہاں تک مشعل کی روشنی کسی طرح بھی نہ پہنچ پا رہی تھی مذہبی پیشوا نے اس طرف کھڑے لوگوں کو بیٹھ جانے یا آگے سے ہٹ جانے کو کہا۔

روشنی کے آگے سے جیسے ہی لوگ ہٹے تو انہیں ملگجے اندھیرے میں ایک آدمی کھڑا نظر آیا جس کا چہرہ صحیح نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ ایک سفید ہیولے کی مانند تھا اور اس کے دونوں جانب ایک ایک ڈنڈا بھی گڑا ہوا تھا اور جن کے اوپر والے سروں پر ایک بالشت چوڑائی میں کپڑے لپٹے ہوئے تھے اور مشعلوں کی مانند تھے جن کو ابھی جلایا نہ گیا تھا۔

اس ہیولے کے سر پر بہت بڑی پگڑی اور رومال بھی تھا جو اس کے دونوں شانوں پر لٹکا ہوا تھا شانے کے نیچے ٹخنوں تک سفید چوغہ تھا اور اس نے اپنے دونوں بازو آگے کی جانب دائیں' بائیں پھیلا رکھے تھے اس کی داڑھی کالی' گھنی اور لمبی تھی کسی میں اتنی جرات نہ تھی کہ آگے بڑھ کر اس کی جانب دیکھتا ان کی نگاہ میں تو وہ کوئی آسمانی مخلوق تھی اور کوئی روحانی شے معلوم ہوتی تھی سفید براق جیسے لباس کی وجہ سے وہ اسے جن یا بھوت بھی قرار نہ دے سکتے تھے۔

کنارے پر کھڑے ہیولے سے پھر آواز ابھری ''مت ڈرو' میں تم جیسا انسان ہوں مجھے خدا نے بھیجا ہے خدا کا تمہارے لئے پیغام لایا ہوں اور ساتھ ہی روشنی بھی۔''

پھر اچانک ہی اس کے دائیں طرف والی مشعل جل اٹھی اور اس کے فوری بعد بائیں جانب والی۔ یہ مشعلیں خود بخود جلی تھیں کیونکہ انہوں نے اس ہیولے کو کوئی ایسی حرکت کرتے ہوئے نہ دیکھا تھا اس حیرت انگیز منظر نے بدوؤں' ان کے سرداروں اور مذہبی پیشواؤں پر بہت گہرا اثر ڈالا۔

اس ہیولے سے پھر آواز ابھری۔

''خدا کا بھیجا ہوا پیغام اس کے ایلچی سے سنو۔''

اس کے ساتھ ہی وہ نہایت آہستگی سے نشیب میں اترنے لگا اس کا پاؤں اٹھ نہ رہا تھا بلکہ سرک رہا تھا دائیں بائیں جلنے والی مشعلیں اس کو اور زیادہ پراسرار بنارہی تھیں وہ نہایت ہی آہستہ آہستہ نیچے کو سرکنے لگا اور جہاں وہ کھڑا تھا وہاں ایک نوجوان لڑکی کا ہیولا ابھرنے لگا تھا اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس آدمی کے وجود سے ہی لڑکی کا وجود ابھر رہا ہو۔

یہ لڑکی کوئی آسمانی حور نظر آ رہی تھی جس کے حسین ترین خدوخال مشعلوں کی روشنی میں خوب لشک رہے تھے ریشمی بال کھلے ہوئے اس کے شانوں پر لہرا رہے تھے اور سینے پر بکھرے ہوئے تھے۔ بازو ننگے تھے' گردن لمبوتری اور جسم ایک ہی سفید کپڑے میں ملبوس تھا اس نظارے نے تو بدوؤں کے مذہبی پیشوا اور سرداروں سمیت سب کے ہوش وحواس گم کر دیے تھے۔

لڑکی نے بازو پھیلا کر کہا" تمہاری قربانی قبول ہو گئی ہے' خبردار رہو' خون کا طوفان آ رہا ہے' تمہارے دودھ والے جانوروں کو اڑا اور بہا لے جائے گا تم میں سے بہت سے اڑ جائیں گے اگر تم خدا کے حکم کی تعمیل کرو گے تو خدا تمہیں بچالے گا کل تمہارے پاس تین آدمی آئیں گے اور ان کی نشانی یہ ہوگی کہ وہ اونٹ پر سوار ہونگے خدا نے انہیں اشارہ دے دیا ہے وہ جو کہیں اسے خدا کا پیغام سمجھنا ورنہ بیل کا خون رائیگاں جائے گا اور تمہاری تباہی کو کوئی نہیں روک سکے گا۔ تم تک خدا کا پیغام پہنچا دیا گیا ہے۔ میں آسمان کی جانب واپس خدا کے پاس جا رہی ہوں۔"

مردانہ ہیولہ آہستہ آہستہ الٹے قدموں پھر ڈھلوان پر نمودار ہونے لگا لڑکی اس کے پیچھے اس کے وجود میں گم ہوتی گئی اور آدمی دونوں مشعلوں کے درمیان جا کر کھڑا ہو گیا اور پکارا۔

یہ خدا کی روشنی کی مشعلیں ہیں یہ ساری رات جلتی رہیں گی کل صبح اکھاڑ کر اپنے پاس رکھ لینا اور انہیں صرف قربانی کی رات جلایا کرنا ہم جا رہے ہیں صبح تک یہاں کوئی نہیں آئے گا اگر کوئی آیا تو اس پر آسمانی بجلی گرے گی اس کے ساتھ ہی وہ الٹے قدموں پچھلی ڈھلان پر اس طرح اتر گیا جیسے وہ غائب ہو گیا ہو مشعلیں بدستور جل رہی تھیں اور بدو حیرت کے مارے گم سم کھڑے تھے۔

بالآخر مذہبی پیشوا نے گہرے سکوت کو توڑا اور بولا۔

"مت ڈرو! یہ خدائی اشارہ ہے خوش قسمت ہے وہ قوم جس کو ایسے مقدس اشارے ملتے ہیں جشن مناؤ' کل جو آدمی آئیں گے ان سے خدا کی کچھ اور باتیں معلوم ہونگی۔

اگلے روز بدوؤں کا مذہبی پیشوا اور پانچ سردار اس نشیب کے اوپر کھڑے بے تابی سے ان خدائی ایلچیوں کا انتظار کر رہے تھے جن کے بارے میں انہیں بتا دیا گیا تھا۔

کافی انتظار کے بعد انہیں دور سے تین شتر سوار اپنی طرف آتے نظر آئے تو ان سرداروں اور مذہبی پیشوا کے درمیان ہلچل مچ گئی اور وہ ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں کہنے لگے۔

"فرمان کے مطابق وہ تین ہی ہیں۔"

ان کے نزدیک یہ بھی کوئی آسمانی مخلوق تھی۔ یہ شتر سوار مسعود' حدید اور فہد تھے جو اپنے جنگی لباس میں ملبوس تھے انہوں نے بدوؤں کے

سرداروں اور مذہبی پیشوا کو دیکھ لیا تھا اس لئے وہ اس طرف اپنے اونٹوں کو بھگاتے ہوئے چلے آئے دوسری طرف مذہبی پیشوا اور سرداروں نے آگے بڑھ کر ان کا استقبال کیا اور کہا۔

''ہم آپ کے ہی منتظر تھے' ہمیں یقین ہے کہ آپ لوگ وہی ہیں جن کے بارے میں رات ہمیں خدائی پیغام ایک حور کی زبانی ملا تھا اور انہوں نے تمہاری یہ نشانی بتائی تھی کہ تم اونٹوں پر سوار ہو گے' کیا تم وہی ہو؟

مسعود: ہمیں یہ تو علم نہیں ہے کہ آپ لوگوں کو کیا پیغام ملا ہے' ہمیں ہمارے سپہ سالار نے بھیجا ہے اسے خواب میں اللہ تعالیٰ کی جانب سے ایک پیغام ملا تھا کہ اس صحرا میں ہماری ایک مخلوق رہتی ہے جس کا پرسان حال کوئی نہیں ہے اس مخلوق کو اپنے ساتھ ملا لو اور اس کے نفع ونقصان کی ذمہ داری اپنے سر لے لو' خواب میں آپ لوگوں کے بارے میں جو نشانیاں انہیں بتائی گئی تھیں اس کے مطابق ہم تمہاری طرف آئے ہیں۔

ہمیں جو نشانیاں دی گئی ہیں اس کے مطابق یہ وہی جگہ ہے اور تمہاری صورتیں بعینہ وہی ہیں جو خواب میں سپہ سالار کو دکھائی گئی ہیں۔

ان میں سے ایک سردار نے انہیں رات کی ساری تفصیل بتائی کہ ان کو خدا کا پیغام کس طرح ملا تھا۔

مسعود: ہمیں یہ تو علم نہیں ہے کہ گذشتہ رات تم نے کیا دیکھا ہے ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ ہمارے سپہ سالار کو خدائی پیغام ملا ہے تو وہ تمہیں بھی ملا ہوگا اس لئے بہتر یہ ہے کہ ہم بیٹھ کر بات کر لیں۔

نشیب کے نزدیک ہی پیشوا کا کشادہ خیمہ تھا جو چمڑے کا بنا ہوا تھا پیشوا سرداروں اور ان تینوں کو اپنے خیمے میں لے گیا اور پھر ان سے پوچھا کہ ان کا سپہ سالار کہاں ہے۔

مسعود: ہمارے سپہ سالار نے عریش کو فتح کر لیا ہے اور یہاں سے کافی فاصلے پر اس وقت خیمہ زن ہے۔

سردار! کیا تم مسلمان ہو؟

مسعود! جی ہاں! ہم مسلمان ہیں۔

سردار! نہ جانے ان مسلمانوں میں کونسی قوت ہے جو ان کی تھوڑی سی تعداد بھی بڑے بڑے لشکر کو میدان جنگ سے بھگا دیتی ہے اور جس طرف جاتی ہے کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔

مسعود: اس میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں ہے یہ خدائی طاقت ہے جو صرف ان کو عطا ہوتی ہے جن کے دلوں میں انسانوں کے لئے محبت ہو اور وہ کمزوروں پر ہاتھ نہ اٹھاتے ہوں اور نہ ہی دوسروں کے مذہبی عقائد اور رسومات میں دخل دیتے ہوں' نہ ہی کسی کمزور اور نادار انسان کو اپنا محتاج اور غلام بناتے ہوں۔

اس کے بعد مسعود نے تفصیل کے ساتھ مسلمان لشکر کی شام میں کامیابی کی تفاصیل بتائیں تاکہ ان کو پتہ چل سکے کہ مسلمان کیسے ہیں۔

مذہبی پیشوا: ہمیں یہ بتاؤ کہ ہمارے لئے خدائی پیغام کیا ہے؟

مسعود: تمہارے لئے پیغام بڑا صاف اور فائدے مند ہے اپنے تمام قبیلوں کے ان آدمیوں کو جوڑنے کے قابل ہیں ہمارے سپہ سالار کے پاس بھیج

دواوراس کی سپہ سالاری کو قبول کر لوتا کہ تمہیں رومی فوج کے ظلم وستم سے محفوظ رکھا جا سکے کیونکہ تم ہرقل شہنشاہ روم کو اس معاملے میں انکار کر چکے ہو۔

مذہبی پیشوا: ہمیں تمہاری بات سے کسی بھی قسم کا انکار نہیں ہے لیکن بعض باتوں کی وضاحت ہونا ضروری ہے۔

مسعود: تمہارے جوانوں کو اتنا مال غنیمت ملے گا کہ تمہارے تمام قبیلے مالا مال ہو جائیں گے تمہیں مسلمانوں کے برابر عہدے ملیں گے خدائی پیغام ملنے کے بعد وہ تمہارے نہ تو مال مویشی لوٹیں گے اور نہ ہی تمہیں کسی مصیبت میں تنہا چھوڑیں گے۔

بالآخر ضروری امور طے کر لئے گئے اور یہ تینوں جاسوس وہاں سے رخصت ہو کر سپہ سالار عمرو بن العاص کے پاس پہنچے اور انہیں ساری تفصیلات سے آگاہ کیا جس کو سن کران کا پریشان زدہ چہرہ کھل اٹھا لیکن انہوں نے اسلامی اصولوں کی پاسداری کو اولین صورت قرار دیا۔

اس کے بعد عمرو بن العاص نے اپنے سالاروں کے ساتھ ان بدوؤں کے استعمال اور فرما شہر کی جانب پیش قدمی اور اس کی فتح کے بارے میں تبادلہ خیال کیا اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کیا اگلے روز ہی بدوؤں کا دو ہزار فوجیوں پر مشتمل لشکر اسلامی لشکر میں شامل ہو گیا۔

اسلامی فوج کی رسد گاہی کے لئے باہمی مشورہ سے ان بدوؤں کو استعمال کیا گیا ان بدوؤں کے لشکر کو کئی حیثیتوں میں تقسیم کر دیا گیا اور انہیں میں سے ایک کمانڈر ان پر مقرر کیا گیا اور اس کمانڈر پر اپنا ایک جوان مقرر کر دیا پھر ان بدوؤں کے ذریعہ رسد کا انتظام کیا گیا۔

عمرو بن العاص نے ان بدوؤں کو واضح ہدایت یہ دی کہ صرف رسد اور اناج جائز طریقے سے حاصل کیا جائے۔ عورتوں، بچوں اور ضعیفوں کے ساتھ کسی بھی قسم کا ظلم روا نہ رکھا جائے۔ بڑے شہروں کی فتح سے جو مال و دولت حاصل ہو گا وہ برابر تقسیم ہو گا اور رومی فوجیوں میں سے کسی کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے گا اس طرح ان تمام حبشیوں کے ذریعہ گاؤں گاؤں سے رسد اور اناج با آسانی فراہم ہونے لگا۔

اس کے فوری بعد تمام لشکر کو فرما کی جانب کوچ کا حکم دے دیا۔ دن بھر پیش قدمی کی رفتار سست رکھی گئی اور رات کو ایک جگہ عارضی پڑاؤ کیا گیا۔ نماز فجر کے بعد ہی لشکر آگے کی جانب کوچ کر گیا دوسرے دن کے سفر کے بعد لشکر ایسی جگہ پہنچا جہاں صحرا کے آثار ختم ہو گئے تھے اور قدرے ہریالی نظر آنے لگی تھی تھوڑی ہی دور ایک چشمہ مل گیا جہاں سے مجاہدین نے سیر ہو کر پانی پیا اور اپنے مشکیزے پانی سے بھر لئے اونٹوں اور گھوڑوں کو بھی پانی پلایا گیا اس طرح فوج کی مشکلات میں کافی کمی واقع ہو گئی۔

اب بدوؤں کے تمام حبشیوں کا انتظار اس جگہ پر کیا گیا اور جب ان کے پاس رسد پہنچ گئی تو تمام لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اناج کافی مقدار میں پہنچ گیا تھا۔

اگرچہ ان دیہات میں متعین رومی فوجوں نے کسی حد تک مزاحمت بھی کی تھی لیکن ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا تھا لوگوں کو اس بات کی یقین دہانی کروائی گئی تھی کہ مصر کی فتح کے ساتھ ہی ان کو اس اناج اور مویشیوں کا پورا پورا معاوضہ مسلمان فوج ادا کرے گی اور فتح کے بعد ان کے ساتھ کوئی برا سلوک نہ کیا جائے گا۔

اب لشکر آگے کی جانب روانہ ہوا اور پھر ایک پڑاؤ کے بعد جہاں اگلا پڑاؤ کیا گیا وہاں عمرو بن العاص نے اپنے لشکر کی نئے سرے سے تنظیم نو کی اور بدوؤں کے الگ جیش توڑ کر انہیں اسلامی دستوں میں مدغم کر دیا گیا اور ان کو سارے لشکر میں بکھیر دیا گیا۔

عمرو بن العاص نے یہاں اپنے لشکر سے اس طرح خطاب کیا۔

''ہم مصر کو جانے والے اس راستہ پر جا رہے ہیں جو ایک قدیم ترین راستہ ہے ہمارے پیغمبر اس راستے سے مصر آئے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام' حضرت یعقوب علیہ السلام' حضرت یوسف علیہ السلام' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا پورا خاندان اس راستے سے مصر پہنچا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اسی راستہ سے مصر کے فرعون کی چیرہ دستیوں اور جادوگروں سے منہ پھیر کر اور ان کے دانت کھٹے کر کے مصر سے دنیائے عرب کو گئے تھے یہی وہ دریائے نیل ہے جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم کو راستہ دے دیا تھا اور تعاقب میں آنے والے فرعون رعمیس دوم کو نیل نے راستہ بند کر کے غرق آب کر دیا تھا یہ وہ مقدس راستہ ہے جو ہمارے پیغمبروں کا راستہ ہے اس بات کو ذہن سے نکال دو کہ ہم کوئی ملک فتح کرنے آئے ہیں بلکہ یہ ہماری اپنی سرزمین ہے اس ملک میں صرف اللہ تعالیٰ عزوجل کی ہی حکمرانی چلے گی اور یہ حکمرانی تمہارے ذریعے قائم ہوگی۔ انشاء اللہ......

اسی راستے سے مسلمان حج کے لئے جاتے ہیں یہ راستہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کے لئے بھی اتنا ہی مقدس ہے کیونکہ عیسائی اسی راستے سے بیت المقدس آتے اور جاتے ہیں یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا راستہ ہے لیکن مصر پر قابض رومی فوج نے عیسائیت کا چہرہ مسخ کر دیا ہے اور سچے پیروکار عیسائیت کو ہزاروں کی تعداد میں تہہ تیغ کر دیا ہے ہم ان عیسائیوں کو ہرقل کی عیسائیت' اس کی بربریت اور ظلم وتشدد سے نجات دلانے آئے ہیں۔''

اس کے بعد عمرو بن العاص نے لشکر کو فرما کا مکمل محل وقوع بتایا تا کہ ہر لشکری کے ذہن میں اس کی اہمیت جاگزیں ہو سکے اس کے علاوہ آپ نے تفصیل سے لشکر کو آگاہ کیا کہ فرما میں رومی فوج کی تعداد ان کے لشکر سے تقریباً چار گنا زائد ہے اس لئے ہوسکتا ہے کہ رومی عقب سے بھی حملہ کریں۔

اب یہ تمہارا کام ہے کہ شام کی طرح کم تعداد میں ہونے کے باوجود ہرقل اور اس کی رومی فوج کو کس طرح پسپا کرنا ہے اور ان پر چھائی ہوئی اپنی دہشت کو کس طرح استعمال میں لانا ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ ہر محاذ پر اب تک ہماری کامیابی کا راز اللہ تعالیٰ عزوجل پر لازوال یقین ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ہے اور ہمیں کبھی تنہا اور نامراد نہیں چھوڑے گا اور ہمیں اپنے پیارے رسول ﷺ کی اطاعت ابدی سے نوازا ہے اور ہمارے اوپر جہاد فرض کیا ہے۔

یہاں ہم اپنے فریضہ جہاد کو نبھانے آئے ہیں اور ہمیں اپنی تمام کمزوریوں کے باوصف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے دشمن ہرقل اور اس کی رومی فوج پر غلبہ حاصل کرنا ہے تا کہ اسلامی اصولوں کا پرچم مصر پر بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لہراتا رہے۔

عمرو بن العاص نے قبطی عیسائی پیشوا اور اسقف اعظم بنیامین کی جانب دو جاسوس فوری طور پر بھیجے جن میں حدید بھی شامل تھا ان دنوں بنیامین ہرقل کے ظلم وستم کے خوف سے آبادیوں سے دور ایک دشوار گزار صحرائی علاقے میں چھپا ہوا تھا اور وہیں اس نے ایک گرجا تعمیر کروایا ہوا تھا۔

یہ دونوں جاسوس اس کے پاس پہنچے اور مفصل بات چیت کی انہوں نے عمرو بن العاص کا ایک پیغام اس تک پہنچایا کہ وہ معاہدے کے تحت قبطی عیسائی فوجی میدان جنگ میں ہرقل کے ساتھ نہ لڑیں بلکہ ہو سکے تو اپنی فوج کو دھوکہ بھی دیں اس کے علاوہ تمام قبطی عیسائی ہرقل کی رومی افواج کے ساتھ کسی بھی قسم کا تعاون نہ کریں بلکہ ممکن ہو تو اس کے خلاف بغاوت بھی کریں۔

بنیامین جو کہ بہت ہی زیادہ دور اندیش اور غیر معمولی ذہانت کا مالک تھا اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ وہ لوگوں کو بغاوت پر بالکل نہیں

اکسائے گا کیونکہ ابھی یہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ جنگ میں کس کو فتح حاصل ہو البتہ لوگوں کو اکسانے کی بالکل ضرورت نہیں ہے کیونکہ وہ پہلے ہی ہرقل اور اس کے رومی دستوں کی چیرہ دستیوں سے تنگ ہیں وہ اس کی افواج میں اپنے بچوں کو نہیں جانے دیں گے اور اگر اس سلسلہ میں ہرقل نے زبردستی کی تو وہ گھروں سے نکل کر صحرا میں جا چھپیں گے۔

جہاں تک ہرقل کی فوج میں موجود قبطی عیسائی ہیں ان کو کچھ کہنا سننا اس لئے بے کار ہے کہ وہ پہلے ہی رومیوں کے ہاتھوں تنگ ہیں اور وہ جانیں قربان کر دینے والی لڑائی نہیں لڑیں گے بہر حال ان کا رویہ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردانہ ہوگا۔

اس کے اس جوابی پیغام سے عمرو بن العاص کو اطمینان حاصل ہوا اور انہوں نے اپنا دھیان فرما شہر کو فتح کرنے کی جانب مبذول کر دیا۔

☆

دوسری طرف اسکندریہ میں بیٹھا ہوا شاہ مقوقس بھی اپنی جگہ مسلمانوں کی آمد سے حیران و پریشان تھا لیکن اسے رومی افواج کے سپہ سالاروں اور ہرقل کے نامزد کردہ اسقف اعظم قیرس سے بھی سخت شکایت تھی لیکن وہ کسی بھی صورت یہ نہیں چاہتا تھا کہ رومی شکست کھا جائیں اور اسے اپنی بادشاہت سے ہاتھ دھونے پڑیں اس لئے اس نے ایک مشاورتی اجلاس بلایا جو اسقف اعظم قیرس' سپہ سالار طربون اور وہ خود تھا۔ مقوقس نے کہا کہ اس نے اپنے طور پر فرما کا دفاع مضبوط کر دیا ہے اور ایسے احکام بھی بھیج دیے ہیں کہ مسلمان اسے فتح نہ کر سکیں لیکن میں قبطی عیسائیوں کی جانب سے ازحد پریشان ہوں پھر اس نے اسقف اعظم قیرس کی جانب منہ کر کے کہا کہ ''کیا وہ عیسائیوں میں مسلمانوں جیسا جذبہ پیدا کر سکتے ہیں؟''

قیرس:۔نہیں شہنشاہ!

مقوقس:۔ کیوں؟

قیرس:۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہ لوگ مجھے ہرقل کا قصائی کہتے ہیں میرے ہاتھوں ان عیسائیوں کا جو خون بہایا گیا ہے وہ لوگ مجھے وہ خون بخش نہیں دیں گے۔ میں ان لوگوں سے اپنے لئے کسی بھی قسم کی رعایت کی توقع نہیں رکھتا اور نہ ہی ان لوگوں کا سامنا کر سکتا ہوں۔

طربون: بہر حال یہ تو اسقف اعظم قیرس کا فرض ہے کہ وہ شہر بہ شہر جائے اور ان لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکائے۔

قیرس:۔ یہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ مجھے سرکاری جلاد کا خطاب دیتے ہیں مذہبی پیشوا نہیں مانتے۔

بالآخر کافی دیر کے صلاح و مشورہ کے تحت یہ قرار پایا کہ اگلے روز مقوقس اسکندریہ کے گھوڑ میدان میں لوگوں کے اجتماع سے خطاب کرے گا اور اس کے بعد دوسرے شہروں میں بھی جا کر لوگوں سے خطاب کرے گا۔

طربون:۔ آپ صرف لوگوں کو مخاطب کریں جہاں تک فوج کا تعلق ہے میں نے اس کی تیاری اس طرح کی ہے کہ اگر میری افواج درست طریقے سے لڑیں گی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم مسلمانوں کو شکست نہ دے سکیں البتہ لوگوں کو ان کی مدد پر آمادہ جوشیلے خطاب سے کیا جا سکتا ہے۔

مقوقس اگلے روز مقررہ وقت پر شاہانہ انداز میں اس میدان میں آیا اور چبوترے پر جا کر کھڑا ہوا۔ محافظ دستے کے گھوڑ سوار اور اس کے آگے' دائیں بائیں اور پیچھے ایک ترتیب سے کھڑے ہو گئے جو کہ حالات کے تقاضے کے مطابق درست تھی' کیونکہ مقوقس بہر حال شہنشاہ مصر تھا کوئی

معمولی آدمی نہ تھا اس کے ساتھ اس کی بیٹی شہزادی ''ارمانوس'' بھی کروفرانہ انداز میں آئی تھی۔

مقوقس نے فوج اور لوگوں کے دور دور تک پھیلے ہوئے ہجوم کی جانب دیکھا تو اس پر اپنی شہنشاہیت کا نشہ اور گہرا ہو گیا پھر اس نے اس طرح خطاب کیا۔

''بہادر رومیو اور غیرت مند مصریو! مسلمان تمہارے گھر میں آن پہنچے ہیں وہ اس خوش فہمی میں آئے ہیں کہ وہ تمہیں یہاں شکست دے دیں گے انہوں نے شہر عریش پر قبضہ کر کے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم شاید کمزور ہیں لیکن حقیقت کچھ یوں ہے کہ انہوں نے یہ شہر لڑ کر حاصل نہیں کیا بلکہ ہم نے وہاں سے اپنی فوج پہلے سے ہی نکال لی تھی تا کہ مسلمان یہ شہر لے لیں اور ہماری سوچی ہوئی چال کے مطابق آگے اتنا بڑھ آئیں کہ واپسی ان کے لئے بے انتہا مشکل ہو جائے اور وہ ہمارے پھندے میں پھنس کر اپنے آپ کو تباہ کروالیں اب وہ شہر فرما تک پہنچ گئے ہیں اور موت انہیں بڑی تیزی سے گھیر کر ہمارے پھندے میں لے کر آ رہی ہے۔''

بعدازاں اس نے اسلام اور مسلمانوں کے خلاف خوب ہرزہ سرائی سے کام لیا اپنی فوج کو دنیا کی سب سے زیادہ عظیم فوج قرار دیا اور کہا کہ دنیا میں اگر حکمرانی کا حق کسی مذہب کو ہے تو وہ عیسائیت ہے۔

''بہرحال اب یہ تمہارا فرض ہے کہ تم عیسائیت اور اپنے ملک کا مکمل تحفظ کرو جو تم سے قربانی مانگ رہا ہے اگر تم نے شام کی طرح مصر بھی مسلمانوں کو دے دیا تو پھر ہر طرف سے عیسائیت کا خاتمہ ہو جائے گا اور تم ایک بزدل، بے وقار ظالم لوگوں کے بس میں آ کر کچلے جاؤ گے۔

میں یہ جانتا ہوں کہ مصری بزدل قوم نہیں ہیں لیکن اب یہ تمہارا فرض ہے کہ اپنی تلواروں کی پیاس مسلمانوں کے خون سے بجھاؤ اور ان سے شام کی شکست کا انتقام دل کھول کر لو۔''

ہجوم نے جذبات میں آئے بغیر اس کی جوشیلی تقریر سنی لیکن کسی بھی قسم کا ردعمل ظاہر نہ کیا اور بالآخر مقوقس اور سپہ سالار طربون کو شرمندگی کا سامنا کرتے ہوئے وہاں سے محل واپس جانا پڑا۔

مقوقس نے طربون اور قیرس کے مشورے سے فوری طور پر دو کام کئے کہ ایک قاصد ہرقل کی جانب اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ مسلمان فرما کے نزدیک پہنچنے والے ہیں اور قبطی عیسائیوں کا رویہ مخالفانہ لگتا ہے اس لئے ہرقل اس کو مشورہ دے کہ وہ ایسے حالات میں کیا کرے۔

دوسرے فوری طور پر اس نے خالصتاً رومی افواج پر مشتمل دستوں کو فرما کی جانب بھیج دیا اور فرما جا کر جو قبطی دستے وہاں متعین ہیں ان کو اسکندریہ بھیج کر ان کی جگہ سنبھال لیں اور مسلمانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔

ایک دن طربون کو اطلاع ملی۔

''سپہ سالار اعظم! ایک لشکر مصر سے صرف ایک منزل کے فاصلے پر خیمہ زن ہے۔''

ایک چرواہے نے سر جھکا کر طربون کے حضور اس طرح عرض کیا۔

''اس میں خاص بات کیا ہے۔''

طربون نے منہ بنا کر کہا۔

''وہ ہمارا ہی لشکر ہوگا جو ہم سے جدا ہو گیا تھا اور اب ہماری طرف واپس آ رہا ہوگا۔''

''سپہ سالارِ اعظم! میرا بھائی شمالی علاقہ میں رہتا ہے وہ آج ہی میرے پاس آیا ہے اور شہر مصر جا کر مقوقس کو خطرہ سے آگاہ کرنا چاہتا ہے۔''

چرواہے نے کہا۔

''کیا تیرے بھائی کو یقین ہے کہ وہ ہمارا لشکر نہیں ہے۔''

طربون سخت لہجہ میں گویا ہوا۔

''جی ہاں سپہ سالار! اسے پورا یقین ہے کہ وہ نہ تو رومی ہیں اور نہ ہی قبطی۔''

''اسے دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔''

طربون یقین کرنے پر آمادہ نظر نہ آ رہا تھا۔

''ایسی بات نہیں سپہ سالارِ اعظم۔''

چرواہے نے عرض کیا کہ

''حضور! میرا بھائی کہتا ہے کہ اس نے اس شکل وصورت اور لباس کے لوگ پہلے کبھی نہیں دیکھے۔''

''کیوں کیا ان کی چار آنکھیں اور دو سر ہیں؟''

طربون جھلا گیا۔

''ایسا تو نہیں ہے لیکن ان کی داڑھیاں لانبی اور کُرتے ٹخنوں تک پہنچتے ہیں۔''

چرواہے نے بتایا۔

''وہ لوگ معاملہ کے بہت صاف ہیں۔ میرے بھائی نے انہیں دودھ پہنچایا تھا اور انہوں نے اس کی پوری قیمت دی تھی۔''

''ہمارا لشکر بھی قیمت دے کر چیزیں حاصل کرتا ہے۔''

طربون نے اپنے لشکر کے دفاع میں کہہ تو دیا تھا مگر چرواہے کی بات اسے کھٹک رہی تھی کہ مسلمانوں کے بارے میں اس نے بیت المقدس میں بھی اسی قسم کی باتیں سنی تھیں۔ مگر مسلمانوں کا مصر آنا اسے کسی طرح اس بات کا یقین نہ آ رہا تھا۔

''ان کی تعداد کتنی تھی؟''

طربون نے گھبرا کر سوال کیا۔

''اس کے خیال کے مطابق چار ہزار سے زیادہ ہوگی۔''

''جھوٹ، بکواس۔ مسلمان اس قدر بے خوف نہیں کہ صرف چار ہزار لشکر لے کر مصر پر حملہ آور ہو جائیں۔''

یہ کہہ کر طربون اٹھ کر ٹہلنے لگا اور پھر رک کر بولا کہ

''اب وہ کس مقام پر ہیں؟''

چرواہے نے سنبھل کر کہا۔

''سالارِ اعظم! میرا بھائی کہتا ہے کہ اس لشکر نے صرف ایک دن اور ایک رات قیام کیا اور پھر دوسری صبح ایسا غائب ہوا کہ جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔''

''کیا مطلب۔ وہ لشکر کہاں چلا گیا اور کدھر چلا گیا۔''

طربون چڑ گیا۔

''یہی تو تعجب کی بات ہے سالارِ اعظم''

چرواہے نے بتایا۔

''میرے بھائی نے دور دور تک اس کا پتہ لگایا لیکن اس لشکر کی گرد تک نہ ملی۔''

''چلو قصہ ختم ہوا۔ وہ جدھر سے آیا تھا ادھر ہی واپس چلا گیا۔''

طربون نے یوں کہا جیسے یہ کوئی خاص بات نہ تھی۔

چرواہے نے سپہ سالار کا یہ حال دیکھا تو چپ چاپ واپس چلا آیا۔ مگر اسی شام طربون کے جاسوسوں نے اطلاع دی کہ مسلمان لشکر العریش ہوتا ہوا مصری سرحد میں داخل ہو گیا ہے۔

طربون یہ سنتے ہی قلعہ بند ہو گیا۔ اس وقت طربون کے پاس دس ہزار کا لشکر تھا۔

☆

شیطان صاحب

عمران سیریز اور جاسوسی دُنیا جیسے بہترین جاسوسی اور سراغرسانی سلسلے کے خالق اور عظیم اُردو مصنف ابنِ صفی کے شریر قلم کی کاٹ دار تحریروں کا انتخاب۔ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین پر مشتمل یہ انتخاب یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ شیطان صاحب کو کتاب گھر پر **طنز و مزاح** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

مجاہدین اسلام اب اپنے ہدف فرما کی جانب پیش قدمی کر رہے تھے۔ تین روز کے بعد مجاہدین نے فرما شہر اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ شہر پہاڑی پر ہونے کے ناطے سے مسلمانوں کے لئے اس کا مکمل محاصرہ کرنا اگر چہ مشکل تھا لیکن پھر بھی انہوں نے اپنی تدبیر کے مطابق اس کا محاصرہ کر لیا تھا۔

مجاہدین کے لئے شہر کی فصیلوں اور قلعوں سے آنے والے تیر از حد نقصان دہ ثابت ہوتے تھے لیکن مسلمان شہر کی قدرتی حفاظت کی وجہ سے ان تیروں کو سہنے پر مجبور تھے۔

مجاہدین نے از حد کوشش کی کہ کسی طرح وہ دوڑ کر شہر کے دروازں تک پہنچ سکیں اور ان پر قابض ہو سکیں لیکن بے پناہ تیر اندازی کی وجہ سے ان کے لئے شہر کے دروازوں تک پہنچنا از حد مشکل تھا اس لشکر کے پاس محاصرے کا پورا سامان بھی نہ تھا نہ منجنیقیں تھی اور نہ ہی کمند پھینکنے والے رسے اور رسوں والی سیڑھیاں تھیں اگر چہ قلعہ سر کرنے میں مسلمان مہارت رکھتے تھے وہ کمندیں پھینک کر اوپر چڑھ جایا کرتے تھے اور جانیں قربان کرنے سے بھی دریغ نہ کیا کرتے تھے۔

فرما میں کچھ مقامی (مصری) فوج بھی تھی اور سرحد کے قریب ہونے کی وجہ سے اس قلعہ کو مضبوط بنایا گیا تھا۔ مگر مسلمان جذبہ جہاد سے سرشار تھے انہوں نے ایرانی شہنشاہت کا خاتمہ کر دیا تھا۔ عراق اور شام کو تہہ و تیغ کر کے رکھ دیا تھا تو پھر بھلا وہ فرما کے قلعہ کی کیا پرواہ کرتے۔ یہ ضرور تھا کہ عمرو بن العاص احتیاط سے کام لے رہے تھے۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے انہیں تاکید کی گئی تھی کہ بلاوجہ ایک مسلمان کا بھی خون نہ بہایا جائے۔ انہوں نے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور محاصرے میں اس قدر سختی برتی کہ قلعہ کے اندر کوئی چیز نہ جا سکتی تھی۔

طربون روز قلعہ سے اسلامی لشکر کو دیکھتا اور ان کی تعداد گنتا تھا اور چار دن کے بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اسلامی لشکر کی مجموعی تعداد چار ہزار سے کسی طرح زیادہ نہیں تھی۔ مگر اپنے اندازے کو جو روز روز کی گنتی کرنے سے ایک کھلی حقیقت بن گیا تھا طربون نے خود ہی رد کر دیا۔

''فانسو!''

اس نے اپنے نائب سے کہا۔

''تم نے اندازہ لگایا ہے کہ حملہ آوروں کی تعداد کتنی ہوگی۔''

''تین چار ہزار سے زیادہ نہ ہوگی۔''

فانسو نے پورے یقین سے کہا۔

''ہمارے پاس چودہ ہزار کا لشکر ہے اور اگر آپ حکم دیں تو میں انہیں پیس کے رکھ دوں۔''

''وہ کس طرح؟''

طربون نے تعجب سے پوچھا۔

''کھلے میدان میں نکل کر۔''

فانسو نے سینہ تان کر کہا۔

''تم نے پہلے کبھی مسلمانوں کا مقابلہ کیا ہے؟''

طربون نے دلچسپی سے پوچھا۔

''سالار! آپ مسلمانوں کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ میں نے اس سے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔ پھر ان میں دیکھنے کی کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ ہمارے سوار ان سے زیادہ تنومند اور بہادر ہیں۔''

فانسو نے ڈینگ ماری۔

''میرے سوال کا جواب دو۔ تم مسلمانوں سے کبھی لڑے ہو یا انہیں لڑتا ہوا دیکھا ہے۔''

طربون نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔

''نہیں سالار! لیکن مجھے ان سے دو دو ہاتھ کرنے کا شوق ضرور ہے۔''

''وہ وقت آ گیا ہے فانسو!''

طربون نے بڑی متانت سے کہا۔

''مگر ایک بات یاد رکھو کہ مسلمان جو اس وقت چار ہزار نظر آرہے ہیں جب میدان میں اتریں گے تو تمہیں چالیس ہزار نظر آئیں گے۔''

فانسو نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ کس طرح ہوسکتا ہے سالار! میری آنکھیں خراب نہیں ہیں۔ میدان جنگ میں مجھے دشمن کے چار ہزار ایک ہزار سے بھی کم نظر آتے ہیں۔''

''اس کا ثبوت تو وقت ہی دے گا۔ لیکن میں کھلے میدان میں مقابلے کی غلطی نہیں کرسکتا۔''

طربون نے صاف جواب دیا۔

''سردار مجھ سے زیادہ تجربہ کار ہیں یقیناً اس کی کوئی خاص وجہ ہوگی۔''

فانسو کا انداز طنزیہ ہو گیا تھا۔ طربون جو بات نہ بتانا چاہتا تھا وہ اسے بتانا پڑی۔

''فانسو! یہ مشہور ہے کہ آزمائی ہوئی بات کو دوبارہ آزمانا حماقت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ مسلمانوں کے پاس ہمارے جیسا اسلحہ نہیں ہے اور نہ ہی ان کی تعداد زیادہ ہے۔ لیکن وہ بہت چالاک ہیں یہ لوگ اپنی آدھی تعداد سامنے رکھتے ہیں اور آدھی تعداد کو چھپا دیتے ہیں۔ پھر جب قلعہ بند لشکر باہر نکل کر ان پر حملہ کرتا ہے تو ان کا چھپا ہوا لشکر نکل پڑتا ہے اور ان کا یہ حربہ بہت کامیاب ہے۔ اس طرح انہوں نے کئی لڑائیاں جیتی ہیں۔''

''آپ کے خیال میں ہمارا محاصرہ کرنے والا لشکر جتنا دکھائی دیتا ہے اس کا دوگنا ہے۔''

فانسو کا انداز اب بھی طنزیہ تھا۔

''بالکل۔ اس میں ذرا برابر بھی شبہ نہیں ہے۔''

فانسو بے پرواہی سے بولا۔

''میں ابھی دو جاسوس بھیجتا ہوں وہ دشمن کے لشکر کے عقب میں جائیں گے اور پتہ لگائیں گے ان کا باقی لشکر کہاں چھپا ہوا ہے۔''

''اگر ایسا کر سکتے ہو تو ضرور کرو۔ پھر تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ میرا اندازہ کس قدر درست ہے۔''

طربون نے نائب کو اجازت دے دی۔ فانسو نے رات کے اندھیرے میں دو آدمی فصیل سے اتار دیئے اور انہیں تاکید کی کہ وہ دشمن کے لشکر کے پیچھے جائیں اور ہر طرف کم از کم ایک منزل تک گھوم پھر کر یہ پتہ لگائیں کہ دشمن کا باقی کا لشکر کہاں پوشیدہ ہے اور اس کی تعداد کتنی ہے۔

دونوں جاسوسوں نے اندھیرے کا فائدہ اٹھایا اور فصیل سے دور نکل گئے۔ پھر وہاں سے گھوڑے حاصل کر کے مشن پر روانہ ہو گئے۔

جاسوسوں نے ایک ہفتہ تک لشکر اسلام کی پشت پر دور دور تک گھوڑے بھگائے اور چھپے ہوئے لشکر کو ڈھونڈتے رہے، مقامی لوگوں سے بھی پوچھ گچھ کی مگر کوئی بات معلوم نہ ہو سکی۔ سب سے پہلی اطلاع یہی تھی کہ مسلمانوں کا لشکر فرما کا محاصرہ کئے ہوئے ہے۔ جاسوسوں نے جو کچھ دیکھا اور لوگوں سے سنا تھا وہ واپس آ کر فانسو سے بیان کر دیا۔

فانسو نے ایک بار پھر طربون پر زور دیا کہ وہ کھلے میدان میں نکل کر مقابلہ کرے مگر طربون نے صاف انکار کر دیا اور کہا

''فانسو! جوش میں آ کر میں کوئی ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا کہ جس سے میرے لشکر پر ہلاکت آ جائے۔''

طربون نے فانسو کو سمجھایا۔

''جب تک مجھے حمفس سے مدد حاصل نہیں ہوتی میں قلعہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔''

''مگر حمفس کو قاصد بھیجے ہوئے ایک ماہ ہونے والا ہے۔''

فانسو نے قدرے ترشی سے کہا۔

''اور ہم کب تک چوہوں کی طرح بلوں میں گھسے رہیں گے۔ باہر سے ہمیں مدد ملے نہ ملے ہمیں اپنے طور پر کوئی قدم اٹھانا چاہئے۔''

''فانسو!''

طربون نے ادھر ادھر دیکھ کر رازدانہ انداز میں کہا۔

''میرے جاسوسوں نے اطلاع دی ہے کہ قلعہ فرما کے قبطی امراء نے دشمن سے رابطہ قائم کر لیا ہے اور ایسی صورت میں ہم جو بھی قدم اٹھائیں گے اس میں ناکامی کا صاف امکان ہے۔''

فانسو کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔

''کس قدر نمک حرام ہیں یہ لوگ۔ اب ہم ان کے ملک کی حفاظت کر رہے ہیں اور یہ ہم سے بے وفائی پر آمادہ ہیں۔ میرے خیال میں ایسے لوگوں کو سر عام قتل کروا دینا چاہئے۔''

''اس سے حالات اور زیادہ خراب ہو جائیں گے۔''

''لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ آپ نے اس کا کیا حل سوچا ہے۔''

''میرے خیال میں صرف ایک صورت ہو سکتی ہے۔''

''وہ کیا؟''

فانسو نے بے چینی سے پوچھا۔

''دشمن پر شب خون مارا جائے۔''

''بہت خوب۔''

اور فانسو خوشی سے اچھل پڑا۔

''اس طرح اگر مسلمانوں کی فوج کہیں پوشیدہ ہے تو اس کو خبر نہیں ہو سکے گی اور ہم مسلمانوں کو تہس نہس کر دیں گے۔''

''خداوند یسوع مسیح نے چاہا تو اب ایسا ہی ہوگا۔''

طربون اور فانسو کے درمیان کافی دیر تک شب خون مارنے کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ فانسو بہت پُر امید تھا مگر طربون ڈر رہا تھا۔ دراصل اس سے پہلے بھی مسلمانوں پر شب خون مار چکا تھا مگر اسے ناکامی ہوئی تھی۔ وہی دھڑکا اسے اس وقت بھی لگا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مسلمان لشکر دن ہو یا رات ہر وقت ہوشیار اور تیار رہتا ہے پھر بھی اس کی یہ آخری کوشش تھی۔ وہ مسلمانوں کے خلاف صرف ایک فتح کا خواہشمند تھا تاکہ اس کی پچھلی شکستوں کا کچھ تو بدل ہو سکے۔

اس شب فرمانروا قلعہ فرما کو قلعہ بند ہوئے ایک ماہ ہوا تھا۔ طربون نے بڑی رازداری سے شب خون کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ اس نے قلعہ کے اندر مقیم قبطیوں کو شب خون کی خبر نہ ہونے دی تھی۔ تمام انتظامات اس قدر مکمل ہوئے تھے کہ اب طربون بھی پُر امید ہو گیا تھا۔ فانسو کا مسلمانوں سے یہ پہلا مقابلہ تھا۔ وہ جوش غضب سے بے قابو ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں تلوار سنبھال رکھی تھی۔ دوسرے ہاتھ میں ڈھال لینے کی بجائے اس نے تلوار لینے کا فیصلہ کیا تھا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو قتل کر سکے۔

رات بڑی اندھیری تھی۔ ہاتھ کو ہاتھ بجھائی نہ دے رہا تھا۔ طربون نے فصیل کے اوپر سے مسلمان لشکر پر نظر ڈالی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ سارے لشکر میں صرف چار جگہ الاؤ جل رہے تھے۔ باقی ہر طرف سناٹا تھا۔ طربون نے دو سو سواروں کا لشکر شب خون مارنے کیلئے منتخب کیا تھا۔ ان سواروں کیلئے قلعہ سے کچھ فاصلہ پر گھوڑوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ یہ جوان فصیل سے اتر کر ایک طے شدہ منصوبہ کے مطابق اس مقام پر پہنچیں گے جہاں ان کیلئے گھوڑوں کا انتظام کیا گیا تھا۔ پھر گھوڑوں پر سوار ہو کر یہ لوگ سو سو سواروں کی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو جائیں گے اور سو سو سواروں کی یہ ٹکڑیاں آگے پیچھے ہو کر مسلمانوں کے لشکر پر حملہ آور ہوں گے۔ ایک کے بعد ایک ٹکڑی مسلمانوں کے خیموں کے درمیان نہایت تیزی سے آگ لگاتی اور مارتی کاٹتی گزرے گی اور اس کے بعد دوسری ٹکڑی یہ عمل کرے گی۔ اس طرح سوئے ہوئے لشکر میں دم کے دم میں قیامت برپا کر دیں گے۔

رومی سپاہی وقت مقررہ پر فصیل کے مقررہ حصہ سے ریشم کی ڈوریوں کے ذریعے نیچے اترے۔ فصیل کے اس طرف ایک خندق تھی جسے پار کر کے ہی دوسری طرف جایا جاسکتا تھا۔ اس کا انتظام بھی طربون نے کر لیا تھا۔ لکڑی کا چھوٹا سا پُل خندق پر ڈال دیا گیا تھا اور اب سپاہی دوسری طرف پہنچ رہے تھے۔

مسلمانوں کو اب تک کوئی خبر نہ ہوئی تھی اور وہ بظاہر خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ طربون کو آدھی کامیابی ہو چکی تھی اور باقی کام اور زیادہ آسان تھا۔ گھوڑے حاصل کرنا پھر ان پر بیٹھ کر دشمن کو تباہ کرنا باقی رہ گیا تھا اور اس میں کوئی چیز بھی حائل نہ تھی۔

جہاں پہلے سے گھوڑے پہنچا دیئے گئے تھے۔ وہ جگہ فصیل سے چار میل کے فاصلہ پر ایک ویران حویلی تھی اور اجڑا ہوا باغ تھا۔ کہتے ہیں کہ فرعونوں کے کسی جرنیل نے پتھر کی یہ مختصر سی حویلی تیار کروائی تھی جس کے گرد ایک خوبصورت باغ تھا۔ حویلی کو وہ جنرل اپنی عشرت گاہ کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ جس وقت کسی جگہ پر جاتا تھا تو لشکر کو تو آہستہ چلنے کا حکم دیتا اور خود آگے روانہ ہو جاتا تھا اور اس عشرت کدہ میں آ جاتا تھا۔ وہاں درجنوں لڑکیاں پہلے سے جمع کر دی جاتی تھیں۔ ان غریب لڑکیوں کا تعلق مصر کے ان عوام سے ہوتا تھا جن کی سرکاری دربار میں کوئی آواز نہ تھی۔

فرعونیت ختم ہوتے ہی اس حویلی پر بھی زوال آ گیا تھا۔ ان عیاشیوں کے نتیجے میں اکثر لڑکیاں اپنی جان گنوا بیٹھتی تھیں۔ انہیں اس باغ میں دبا دیا جاتا تھا۔ حویلی پر زوال آنے کے بعد بھی یہ مشہور تھا کہ اس حویلی پر بھوت پریت اور چڑیلوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ رفتہ رفتہ لوگوں نے ادھر سے گزرنا چھوڑ دیا اور اس طرح یہ حویلی ہمیشہ کیلئے متروک ہو گئی۔ شکستہ چھتیں، ٹوٹی پھوٹی دیواریں، دروازے اور کھڑکیاں اس میں یوں بھی بہت کم تھیں اور جو تھیں بھی انہیں آس پاس کے لوگ اکھاڑ کر لے گئے تھے۔ اس حویلی پر ایسی حسرت برستی تھی کہ مسلمان لشکر نے اس پر توجہ نہ دی حالانکہ اس کی چار دیواری ابھی تک قائم تھی اور وہ ایک دفاعی مورچہ میں تبدیل کی جاسکتی تھی۔

باغ کی اس چار دیواری میں رات ہوتے ہی ایک ایک کر کے تقریباً دو سو گھوڑے پہنچا دیئے گئے تھے۔ یہ لوگ باغ میں داخل ہوتے ہی گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ ایک جاسوس کو مسلمان لشکر کی طرف روانہ کیا گیا تا کہ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر شب خون مارنے کا وقت مقرر کیا جائے۔ جاسوسوں نے تین گھنٹے بعد واپس آ کر اطلاع دی کہ دشمن کے لشکر میں معمول کے مطابق چوکی پہرے کا انتظام ہے اور سوائے معمولی انتظام کے اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔ خیموں میں بھی تاریکی ہے اور سب لوگ سو رہے ہیں۔

ادھر سے مطمئن ہونے کے بعد طربون نے پچاس سواروں کے چار دستے بنائے اور انہیں حکم دیا کہ سو گز کے فاصلے پر جا کر چاروں دستے آگے پیچھے دشمن کے خیموں پر حملہ آور ہوں اور مارتے کاٹتے، آگ لگاتے دوسری طرف نکل جائیں۔ قبل اس کے دشمن کے حواس درست ہوں وہ پھر پلٹ کر حملہ کرتے ہوئے واپس آ جائیں۔ قلعہ میں واپسی کیلئے مغربی دروازے کو کھولنے کا حکم پہلے ہی دیا جا چکا ہے۔ شب خون کی کمان خود طربون کو کرنی تھی۔ وہ سوار ہو کر پہلی ٹکڑی میں شامل ہوا۔ اس کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ سواروں نے مشعلیں روشن کر لیں جنہیں شب خون کے دوران دشمن کے خیموں پر پھینکا جانا تھا۔

مشعلیں روشن ہوتے ہی طربون نے شب خون مارنے کا اشارہ کیا اور سب سے پہلے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ سواروں کا پہلا ٹکڑا

مشعلیں لہراتا ہوا انتہا کی تیز رفتاری سے مسلم خیموں کی طرف بڑھا۔ ہر سوار کے دائیں ہاتھ میں مشعل اور بائیں ہاتھ میں تلوار تھی۔ شب خون کے دوران جب مشعلیں پھینکی جاتیں اس کے ساتھ ہی تلوار سوار کے بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں چلی جاتی اور بائیں ہاتھ میں ڈھال پکڑ لی جاتی۔ سواروں کا پہلا ٹولہ بڑی تیزی سے مسلم خیموں کے قریب ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جب یہ سوار خیموں کے صرف پچاس گز کے فاصلہ پر رہ گئے تو یوں محسوس ہوا کہ جیسے سواروں کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں یکے بعد دیگرے صرف چند لمحوں میں گل ہو گئی تھیں۔

پچاس سواروں کی دوسری ٹکڑی جوان کے پیچھے گھوڑے بڑھائے چلی آ رہی تھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیموں کے چالیس گز کے فاصلے پر ان سواروں کی مشعلیں بھی گل ہو گئیں۔ تیسرے دستے نے شاید خطرہ محسوس کیا۔ انہوں نے راسیں کھینچ کر گھوڑے روکنے کی کوشش کی لیکن گھوڑے رُکتے رُکتے خیموں سے پچاس گز کے فاصلہ پر پہنچ گئے۔ ان میں بیشتر ہاتھوں کی مشعلیں گل ہو گئیں۔ چوتھے اور آخری دستے کے سواروں نے خطرے کو پوری طرح محسوس کر لیا تھا۔ اس لئے انہوں نے گھوڑے روک کر قلعہ کے مغربی دروازے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا کیونکہ اُدھر ہی سے انہیں قلعہ میں واپس جانا تھا۔ مگر وائے ناکامی ان کا راستہ مسلمان سواروں نے روک لیا۔ مسلمان سواروں کی تعداد ان سے کم تھی لیکن یہ گھبرائے ہوئے جان بچا کر بھاگ رہے تھے اور انہیں روکنے والے ان کی موت بنے بیچ راستے میں پھیلے کھڑے تھے۔ مجبوراً انہیں مشعلیں پھینک کر تلواریں بلند کرنا پڑیں۔ اگرچہ ہر طرف اندھیرا پھیلا ہوا تھا لیکن آخری دنوں کا چاند چمک رہا تھا اور ہلکی روشنی پھیلتی جا رہی تھی۔ مسلمانوں نے رومی سواروں کو تلوار پر رکھ لیا اور دم کے دم میں انہیں کاٹ کے رکھ دیا۔ بہت کم سوار بچ کر جا سکے۔

پچاس پچاس کی تین ٹکڑیاں جوان سے پہلے گئی تھیں ان کے سواروں کا حال بھی انہی کی طرح کا ہوا تھا۔ مسلمانوں نے شب خون سے بچنے کیلئے لشکر کے چاروں طرف دس فٹ گہری خندق کھود کر اسے شاخوں اور گھانسوں سے چھپا رکھا تھا۔ رومی بڑی آسانی سے ان خندقوں کا شکار ہو گئے تھے اور سوار نیچے جا گرے تھے۔ آدھے سے زیادہ کا خاتمہ تو خندق میں گرنے سے ہو گیا تھا جو باقی بچے انہوں نے دہائی دے کر امان طلب کی۔ عمرو بن العاص سپہ سالار لشکر اسلام نے تمام رومیوں کی جان بخشی کا اعلان کر دیا اور حکم دیا کہ زخمیوں کا معقول طریقے سے علاج اور مرہم پٹی کی جائے۔

فرما کے اس ناعاقبت اندیشانہ شب خون نے سیاہ رات کی طرح رومیوں کی قسمت میں بھی سیاہی لکھ دی اور مسلمانوں کو فتح سے ہمکنار ہونے کا مژدہ سنایا۔ رومیوں کے دو سو بہتر سوار مارے گئے یا پھر مسلم کیمپوں میں ان کی مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ طربون نے خود اس شب خون کی سرداری کی تھی وہ پہلی ٹکڑی کے سواروں میں شامل تھا اور اس کا گھوڑا سب سے آگے تھا۔ جس وقت طربون کے گھوڑے کو جھٹکا لگا تھا تو وہ سمجھ گیا تھا کہ آگے خندق ہے اور گھوڑا اس میں گر رہا ہے۔ اس نے بڑی تیزی سے جست لگائی مگر اس کی بدقسمتی کہ ایک پیر رکاب میں سے نہ نکل سکا اور دوسرا الجھ کر رہ گیا۔ پھر یہ الجھا ہوا پیر اس وقت رکاب سے باہر آیا جب وہ خندق میں تقریباً زمین تک پہنچ سکا تھا۔ اس سے اس کو یہ فائدہ ہوا کہ وہ گھوڑے کے نیچے نہیں دبا بلکہ الگ جا کر گر گیا۔ لیکن فوراً اس پر دو تین سوار آ کر گرے اور اس کی ہڈیاں کڑ کڑا کر رہ گئیں۔

طربون بہت سخت جان سپاہی اور سالار تھا۔ زخمی ہونے کے باوجود اس نے خود کو سنبھالا اور رینگتا ہوا کسی نہ کسی طرح خندق سے باہر آ گیا۔ باہر قیامت کا منظر تھا۔ ایک کو ایک کا پتہ نہ تھا۔ ہر طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ جنہیں مسلم سپہ سالار عمرو بن العاص کے حکم سے خندق سے

نکال کر جمع کیا جا رہا تھا۔ زخمیوں کو الگ کر کے مرہم پٹی کیلئے بھیجا جا رہا تھا۔ طربون جان بچاتا ہوا اور رینگتا ہوا دور نکل گیا لیکن اس کے ساتھ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا والا حساب ہوا۔ طربون خندق سے بچ گیا اور اس دروازے پر بھی پہنچ گیا جس سے شب خون مارنے والے سواروں نے واپس قلعہ میں داخل ہونا تھا لیکن جب وہ دروازے کی طرف پوری رفتار سے بھاگ رہا تھا تو ایک مسلمان سوار کی نظر اس پر پڑی۔ وہ گھوڑا بھگا کر فوراً اس کے سر پر پہنچ گیا اور تلوار کے پہلے ہی وار میں اسے زمین پر لٹا دیا۔

شب خون کی ناکامی کی خبر قلعہ والوں کو رات ہی میں مل گئی تھی۔ رومی زخمی سوار مغربی دروازے کے سامنے مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ قلعہ والوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کے سوار گاجر اور مولی کی طرح کاٹ کے رکھ دیئے گئے ہیں ورنہ شاید وہ مغربی دروازہ کھول دیتے اور رومیوں کے بجائے مسلمان قلعہ میں داخل ہو جاتے۔

اس ناکامی کے بعد مقوقس کی طرف سے شہر کے نئے رومی سپہ سالار کے پاس حکم نامہ آیا کہ اس کے دفاعی دستے مسلمانوں کو مار بھگانے کے لئے روزانہ ایک دو دستے باہر بھیجیں اور وہ مسلمانوں پر حملہ کر کے کچھ دیر مقابلہ کریں اور پھر واپس قلعہ میں داخل ہو جائیں نیز اوپر سے تیر اندازوں سے بہت زیادہ تیراندازی کروائی جائے تا کہ مسلمان فوج کی نفری کم سے کم ہوتی جائے اور پھر ایک ہی حملے سے ان کو شکست دے کر ان پر قابو پایا جائے۔

اس فرمان کے مطابق اب رومی فوجوں نے وطیرہ پکڑ لیا کہ وہ روزانہ قلعہ کا دروازہ کھول کر قدرے تعداد میں نکلتے تھے اور مسلمانوں پر اچانک حملہ آور ہوتے دوسری طرف مسلمانوں کی مجبوری یہ تھی کہ وہ کوئی چال چلنے کی پوزیشن میں نہ تھے اندر سے جب بھی حملہ ہوتا تو انہیں پیچھے ہٹنا پڑتا نیز پہاڑی ڈھلوان انہیں اپنے قدم جمانے نہ دیتی تھی جس سے انہیں پہاڑی سے نیچے آنا پڑتا۔ رومی فوج نیچے نہ آتی تھی البتہ موقع محل کے مطابق حملہ کر کے واپس قلعے کے اندر تیزی سے چلی جاتی تھی اور دروازے بند ہو جاتے تھے۔

عمرو بن العاص اس صورتحال سے بے حد پریشان تھے بالآخر انہوں نے تمام سالاروں کو اکٹھا کیا اور اس سے نمٹنے کے لئے ایک جامع پلان تیار کیا اور اس پلان کو سارے سالاروں کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا۔

ایک روز قلعے کے ایک طرف کے دو دروازے کھلے اور رومی فوج رکے ہوئے سیلاب کی مانند بڑی ہی تیزی اور شدت سے باہر نکلی اور اس طرف کے مجاہدین پر ہلہ بول دیا اب سالاروں نے اپنے طے شدہ پلان کے مطابق بڑی تیزی سے حرکت کی اور مقررہ سالار اپنا دستہ لے کر دیوار کے ساتھ ساتھ آیا تا کہ دروازوں پر قبضہ جما لیا جائے لیکن رومی زیادہ تیز نکلے اور انہوں نے مسلمانوں کی چال کو بھانپ لیا وہ فوراً واپس ہوئے اور تیزی سے قلعہ میں داخل ہو کر دروازے بند کر لئے جو رومی باہر رہ گئے ان کو مسلمانوں نے باوصف کم تعداد ہونے کے پوری طرح کاٹ کر رکھ دیا اور ان میں سے ایک بھی رومی زندہ نہ بچ سکا اگر چہ مسلمانوں کا بھی بے پناہ نقصان ہوا اور بہت سے مجاہدین بھی شہید ہو گئے۔

مجاہدین کے لشکر کی نفری اور کم ہو گئی شہر کا دفاعی نظام ایسا مستحکم تھا کہ شہر کے باہر جو درخت تھے وہ سب کاٹ دیئے گئے تھے تا کہ محاصرہ کرنے والے درختوں کے ذریعہ دیواروں پر نہ چڑھ سکیں اور اندر والوں پر تیراندازی کر سکیں۔

عمرو بن العاص اور ان کے سالاروں کے لئے ایسی صورتحال پیدا ہوگئی تھی کہ جس سے بڑے بڑے جرنیل بھی دلبرداشتہ ہو جایا کرتے ہیں لیکن وہ بددل نہیں ہوئے ایسے میں عمرو بن العاص نے گرجدار آواز میں کہا۔

''مایوسی جیسے گناہ سے بچو انشاء اللہ تعالیٰ فتح ہماری ہوگی۔''

جنگ کی نئے سرے سے پلاننگ کی گئی اور سالاروں کو نئی ہدایات دی گئیں تا کہ اس شہر پر فتح حاصل کی جا سکے۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سورماؤں (رومیوں اور قبطیوں) کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا تھا جس نے مسلمانوں کے قلعہ پر قبضہ کو آسان بنا دیا تھا۔ کیونکہ دوسرے دن جب صبح کو قلعہ کا صدر دروازہ کھلا اور سفید جھنڈا لہراتا ہوا نظر آیا۔ ایک وفد سپہ سالار لشکر اسلام عمرو بن العاص کی خدمت میں حاضر ہوا۔

''ہم سپہ سالار لشکر اسلام سے صلح کی بات چیت کرنے کیلئے حاضر ہوئے ہیں۔''

وفد کے ایک رکن نے کہا۔

وفد کو قلعہ سے نکلتے دیکھ کر عمرو بن العاص خیمہ سے نکل کر سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے دائیں بائیں چھوٹے بڑے سردار کھڑے تھے۔ اس ترتیب کو دیکھ کر وفد کے ارکان کو اندازہ ہو گیا کہ درمیان میں کھڑا جوانسان ہے وہ ان کا سردار اعلیٰ ہے یا کم از کم ایسا شخص ضرور ہے جو سپہ سالار کی بجائے گفتگو کر سکتا ہے۔ چنانچہ وہ فوراً عمرو بن العاص کے پاس پہنچے۔ وفد کی بات سن کر انہوں نے اپنے نائب سے کچھ کہا اور اپنے خیمے میں واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد نائب نے کہا۔

''سپہ سالار امن کے وفد کو خوش آمدید کہتے ہیں وہ آپ لوگوں کا خیمہ میں انتظار کر رہے ہیں۔''

وفد نائب کے ساتھ عمرو بن العاص کے خیمے میں چلا گیا۔

عمرو بن العاص نے کھڑے ہو کر وفد کا استقبال کیا اور فرش پر جس پر ایک معمولی دری بچھی ہوئی تھی وفد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ان کے ساتھ بیٹھ گئے۔

سپہ سالار نے کہا۔

''یہ کہاں تک درست ہے کہ رومیوں کا شکست خوردہ جنرل طربون قلعہ فرما میں موجود ہے؟''

وفد کے ایک سن رسیدہ رکن نے جواب دیا۔

''کل رات تک جنرل طربون قلعہ میں تھا لیکن اب پتہ نہیں کہ وہ کہاں ہے۔''

عمرو بن العاص کو یہ سن کر افسوس ہوا۔ انہوں نے سوال کیا کہ

''آپ لوگ کس عہدے پر نامزد ہیں اور کس نے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے؟''

''اے سپہ سالار لشکر اسلام! ہم سب قبطی ہیں یعنی مصر کے اصل باشندے۔ ہمیں کسی نے نہیں بھیجا ہے اور نہ ہی ہم کسی عہدے پر فائز

ہیں۔ ہمارا شمار شہر کے معززین میں سے ہوتا ہے۔"

"لیکن یہ ایک فوجی محاصرہ ہے اور قلعہ پر رومی فوج کا قبضہ ہے۔ میں فوجی گورنر جنرل ہی سے بات کر سکتا ہوں۔"

عمرو بن العاص نے ایک اصولی بات سمجھائی۔

وفد میں ایک شخص جو دوسروں کی نسبت کم عمر معلوم ہوتا تھا بڑے غصہ سے بولا۔

"اے مسلم سپہ سالار! ہم آپ کو فاتح تسلیم کرتے ہیں اور قلعہ پر رومیوں کا نہیں ہمارا قبضہ ہے۔ ہم قلعہ کی چابیاں لے کر آپ کے پاس آئے ہیں اور آپ فرمایئے کہ آپ ہم سے کن شرطوں پر صلح کرتے ہیں۔"

عمرو بن العاص فکر میں پڑ گئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ وفد کو کیا جواب دیں۔ قلعہ پر مصریوں کا قبضہ بھی سمجھ میں آنے والی بات نہ تھی۔ ان کی اطلاع کے مطابق فرما کے قلعہ میں دس بارہ ہزار فوج موجود تھی اور ان میں اکثریت رومیوں کی تھی۔ پھر یہ قلعہ پر قبضہ کا دعویٰ کیسے کئے ہوئے ہیں۔ دوسری بات بھی قابل غور تھی کہ وفد قلعہ کے صدر دروازے سے باہر نکلا تھا۔ اگر وفد کو قلعہ کی کسی بڑی طاقت کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو وہ صدر دروازہ کیسے کھلوا سکتا تھا۔

مسلم سپہ سالار کو فکر میں مبتلا دیکھ کر وفد کے ارکان میں بے چینی پیدا ہوگئی۔ وہ اشاروں ہی اشاروں میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے تھے۔ آخر میں زیادہ تیز اور کم عمر سردار نے چابیوں کا گچھا نکال کر عمرو بن العاص کے سامنے ڈال دیا۔

"امیر لشکر! قلعہ کی چابیاں حاضر ہیں۔ صلح کی شرطیں آپ خود لکھ لیں۔ ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ طربون لاپتہ ہوگیا ہے اور رومی فوج صبح ہونے سے پہلے قلعہ چھوڑ کر بلبیس کی جانب روانہ ہوگئی ہے۔ قلعہ پر ہمارا مکمل قبضہ ہے۔"

عمرو بن العاص نے حیرت سے وفد کے ارکان کو دیکھا۔

"قلعہ کی چابیاں غیر مشروط طور پر پیش کی گئی ہیں۔ اس لئے ہماری طرف سے قلعہ والوں کی شرائط پر معاہدہ کیا جاتا ہے اور جب تک معاہدہ ترتیب نہیں دیا جاتا ہماری طرف سے یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ لشکر اسلام قلعہ میں پہنچ کر کسی فوجی یا غیر فوجی کو قتل نہیں کرے گا۔ قلعہ کے تمام لوگوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کی ذمہ داری لشکر اسلام پر ہے۔ جو لوگ قلعہ چھوڑ نا چاہیں وہ اپنا سامان لے جا سکتے ہیں۔ بقیہ لوگ جزیہ دے کر رہ سکتے ہیں۔"

لشکر اسلام کے اعلان کے بعد معمر رکن وفد نے کہا۔

"ہم نے مسلم سپہ سالار لشکر کے اعلان کے مطابق اپنی شرطیں ترتیب دی ہیں اور ہم اپنی شرائط پر صلح تسلیم کرتے ہیں۔"

وفد کے ارکان کھڑے ہوگئے۔ ایک رکن نے کہا۔

"ہم سپہ سالار لشکر اسلام کو قلعہ میں داخل ہونے کی دعوت دینے کو تیار ہیں۔ تشریف لے چلئے۔ عمرو بن العاص کھڑے ہوگئے۔ پھر انہوں نے لشکر تیار کرنے کا حکم دیا۔ سپاہیوں کے گھوڑے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ وہ دوڑ دوڑ کر گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے صفیں بن گئیں۔ نصف لشکر نائب سردار کی سرکردگی میں قلعہ بھیج دیا گیا۔ اس کے کچھ دیر کے بعد عمرو بن العاص باقی لشکر کے ساتھ قلعہ پہنچے۔ قلعہ کی فصیل اور اہم مقامات

پر پہرہ لگا دیا گیا۔ عمرو بن العاص نے فرما کیلئے ایک فوجی گورنر مقرر کیا۔ انتظامی امور کیلئے معززین شہر کی ایک مجلس بنائی جسے فوجی گورنر کی ''مجلس مشاورت'' کا نام دیا گیا۔ فرما پر قبضے میں ایک ماہ لگ گیا۔ اس کے بعد عمرو بن العاص نے کچھ سوار چھوڑ کر آگے بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ وہ جلد سے جلد مصر کے دارالسلطنت شہر (خمص) پہنچنا چاہتے تھے۔ جب انہوں نے اپنے سواروں اور فرما کی مجلس مشاورت سے رائے طلب کی تو ایک قبطی امیر نے کہا۔

''سپہ سالار! شہر مصر تک آسانی سے پہنچنا بہت مشکل ہے۔ رومی فوجیں ہر قلعہ پر قبضہ جمائی بیٹھی ہیں اور جگہ جگہ مدافعت ہوگی۔''

''مدافعت توڑنے ہی تو ہم آئے ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ بتایا جائے کہ سب سے زیادہ مدافعت کہاں ہوگی۔''

سپہ سالار نے دریافت کیا۔

''فرما اور شہر مصر کے درمیان یوں تو بہت سے قلعے ایسے ہیں جہاں مدافعت کا خطرہ ہے۔ لیکن سب سے اہم مقام بلبیس ہے۔ جس طرح ''فرما'' مصر کا دروازہ کہا جاتا ہے اس طرح خمض کا دروازہ بلبیس ہے۔ اگر آپ نے بلبیس پر قبضہ کر لیا تو پھر شہر مصر تک آپ کو کوئی نہیں روک سکے گا۔''

بلبیس کی جانب پیش قدمی کے دوران عمرو بن العاص نے لشکر کی ترتیب حسب ذیل رکھی کہ سب سے آگے ہراول دستہ تھا اور اس دستہ سے بہت آگے کچھ مجاہدین کو مقامی لوگوں کے بھیس میں بطور جاسوسی کرنے کے لئے مختلف سمتوں میں بھیج دیا تھا کچھ دستے ہراول سے دور پیچھے تھے ان کے دائیں اور بائیں خاصے فاصلے پر ایک ایک دستہ جا رہا تھا اور ایک دو دستے عقب میں آ رہے تھے یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی نفری بے حد کم تھی اور عمرو بن العاص جیسے سپہ سالار کی نظر میں رومیوں کی جانب سے کہیں سے بھی اور کسی بھی پہلو سے بھی حملہ ہو سکتا تھا کیونکہ مسلمان اس وقت تک مصر کے اندر جہاں تک پیش قدمی کر چکے تھے وہ شیر کے منہ میں با آسانی شکار دینے والی بات تھی دوسرے ابھی تک مسلمانوں کو مدینہ سے کمک بھی نہیں ملی تھی۔

عمرو بن العاص چونکہ روایتی طرز کے جرنیل نہ تھے بلکہ وہ دشمن کی ہر قسم کی شاطرانہ چالوں کو سمجھنے اور پرکھنے کی صلاحیت سے معمور تھے اس لئے انہوں نے دشمن کی ہر قسم کی چالوں، گھاتوں اور وارداتوں کو مدنظر رکھ کر ہی ایسا نظام قائم کیا تھا کہ انہیں کہیں بھی ذرا سی غلطی کی وجہ سے اپنے اور اپنی نفری کے لئے پریشانی نہ اٹھانا پڑے جاسوسی کا سلسلہ بھی اس لئے اتنا تیز ترین اور مضبوط رکھا گیا تھا کہ انہیں دشمن کی ہر چال کی بروقت اطلاع مل جایا کرتی تھی۔

چونکہ مسافت بہت زیادہ طویل تھی اور دریائے نیل اپنی منقسم شاخوں کی وجہ سے راستہ کو دشوار گزار بنا رہا تھا ایک علاقہ دلدلی تھا، درختوں کی بہتات بھی تھی کچھ علاقہ پہاڑی اور غیر ہموار بھی تھا ان تمام شاخوں کو عبور کرنا بھی ایک مسئلہ تھا اور اوپر سے اس بات کا خطرہ بھی تھا کہ دشمن کی فوج کہیں گھات نہ لگائے بیٹھی ہو اور ذرا سی بے خبری میں مسلمان فوج کسی نقصان سے دوچار نہ ہو جائیں۔

عمرو بن العاص نے اس اطلاع پر قبطیوں کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے ہر جگہ یہی محسوس کیا کہ مصر کے پرانے باشندے (قبطی) اور رومی فوجوں کے دستوں کے درمیان اختلافات کی گہری خلیج موجود ہے اور اگر ذرا سی بھی عقلمندی سے کام لیا جائے تو دونوں کے باہمی نفاق سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ لشکر اسلام آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ رومی دستوں اور قلعہ والوں سے اس لشکر کا کئی جگہ ٹکراؤ ہوا مگر نصرت مسلمانوں کے ساتھ

چل رہی تھی۔ یہاں تک کہ عمرو بن العاص فتح کے ڈنکے بجاتے ہوئے قازیق پہنچ گئے۔ یہ قصبہ مصر کے مشہور قصبے بلبیس کے قریب واقع تھا۔ عمرو بن العاص نے یہیں لشکر کو خیمہ زن ہونے کا حکم دیا اور بلبیس کے محاصرہ کی کوشش میں لگ گئے۔

☆

شاہ مقوقس نے اپنے جرنیل جارجس اور تھیوڈور اسقف اعظم کی ایک مجلس مشاورت بلائی اور اس میں شہزادی ارمانوس کو بھی شریک کیا گیا۔ اس مجلس مشاورت میں نئی صورتحال پر غور وفکر کیا گیا۔ شہزادی ارمانوس نے بہت ہی تند و تیز تقریر کی اور رومی جرنیل اور اسقف اعظم کو شرم دلائی کہ وہ ابھی تک کسی بھی لحاظ سے مسلمانوں کو روکنے میں نا کام رہے ہیں آخر میں اس نے شاہ مقوقس کو مشورہ دیا کہ ایسے حالات میں یہ بہتر ہے کہ کسی طرح مسلمانوں سے عارضی صلح کر لی جائے۔

کافی دیر کے بحث مباحثہ کے بعد شاہ مقوقس نے اس تجویز کو اس طرح تشکیل دیا کہ پادریوں کا ایک وفد مسلمانوں کے سپہ سالار کی جانب بھیجا جائے تا کہ وہ اس سے مذاکرات کرے اور اس سے معلوم کرے کہ مسلمان کن شرائط کے تحت مصر کو خیر باد کہہ سکتے ہیں۔

رومی جرنیل جارجس:- اگر مسلمانوں نے یہ شرط پیش کر دی کہ انہوں نے مصر کا جو علاقہ فتح کر لیا ہے وہ اس کو اپنی عملداری میں رکھیں گے اور آگے کی جانب پیش قدمی نہیں کریں گے تو کیا ہم ان کی اس شرط کو منظور کر لیں گے ہو سکتا ہے وہ ہم سے بلبیس کا بھی مطالبہ کریں۔

مقوقس:- میں انہیں مصر کی ایک انچ زمین بھی نہیں دوں گا۔

شہزادی ارمانوس:- درحقیقت ہمیں ان کو کسی الجھاوے میں پھنسانا ہوگا تا کہ وہ با آسانی ہمارے شکنجہ میں گرفتار ہو کر اپنی ساری نفری کو مروادیں اور مصر پر ان کی حکومت کرنے کا خیال خاک میں بکھر جائے۔

مقوقس:- میں نے جو منصوبہ سوچا ہے اس کے مطابق پادریوں کا ایک وفد مسلمان سپہ سالار کے پاس جا کر اس کو مذاکرات کے الجھاوے میں پھنسائے اور تم اپنی فوج کو مکمل تیار کر و تا کہ مسلمانوں پر کسی بھی وقت اچانک حملہ کر کے ان کو شکست سے دو چار کر کے ان سے اپنی توہین اور ذلت کا بدلہ لیا جا سکے چونکہ مجھے اس بات کا خطرہ لاحق ہے کہ قبطی عیسائی کہیں غداری نہ کر بیٹھیں اس لئے میں نے ان کے اسقف بنیامین کو بھی اپنے جال میں ایک چال کے ذریعہ پھانسنے کا الگ سے منصوبہ شہزادی ارمانوس کے مشورہ سے تیار کیا ہے۔

ہرقل نے سرکاری اسقف قیرس کو حکم دیا کہ وہ اس سلسلہ میں پادریوں کا وفد تشکیل دے تا کہ انہیں سپہ سالار عمرو بن العاص کے پاس ساری تفصیل سمجھا کر بھیجا جا سکے۔

بلبیس کے محاصرے کے ایک ہفتہ بعد عمرو بن العاص کو یہ اطلاع ملی کہ مصری پادریوں کا ایک وفد ان سے ملنے کے لئے آیا ہے آپ نے اس وفد کو اپنے خیمے میں بلایا اور آنے کا مقصد دریافت کیا۔

مصری وفد کے سربراہ نے آپ کے ساتھ مذہب کے حوالے سے بات کی اور امن وامان اور بنی نوع انسان کی فلاح کے حوالے سے ایک وعظ بھی دیا اور صلح کی مصلحت پر زور دیا۔

عمرو بن العاص نے اس وفد کے سربراہ کی ساری بات بڑے غور وتحمل سے سنی اور واضح الفاظ میں پوچھا کہ وفد کے آنے کا اصل مقصد کیا ہے؟

پادری:۔مسلمان مصر کو چھوڑ کر چلے جائیں اگر اس سلسلہ میں ان کی کوئی شرط ہوتو وہ بتائی جائے تاکہ اس کی روشنی میں غور وحوض کے بعد اس شرط کو پورا کیا جاسکے۔

عمرو بن العاص:۔(دوٹوک لہجے میں)!میری طرف سے شاہ مقوقس کو بتادیں کہ ہم اپنے مذہبی اصولوں کے پابند ہیں اس لئے اسلامی اصول کے مطابق ہماری شرائط حسب ذیل ہے۔

(i) میں آپ کو اور آپ کے حکمرانوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہوں جتنے لوگ بھی اسلام قبول کرلیں گے اسلامی قانون کے مطابق ہم اور ان میں کوئی فرق نہ ہوگا اور ہم ایک دوسرے کے دکھ اور درد کے ساجھے ہونگے اور اسلامی قانون کے مطابق اسلامی مساوات سے کام لیا جائے گا۔

(ii) اگر اسلام لانا قبول نہیں تو پھر آپ لوگ ہماری حاکمیت کو تسلیم کریں اور جزیہ ادا کریں اس طرح آپ لوگ ہماری حفاظت میں آجائیں گے آپ کے مال واموال' عزت وآبرو کی نگہبانی اور حفاظت ہمارے ذمہ ہوگی اور اس سلسلہ میں آپ کی ہمہ اقسام کی ضروریات کے ہم ضامن ہونگے۔

(iii) تیسری صورت میں آپ کے اور ہمارے درمیان فیصلہ بذریعہ تلوار ہوگا۔

پادری:۔آپ کے لئے بہتر یہ ہے کہ آپ لڑائی یہاں ہی روک دیں اور واپس چلے جائیں آپ کی نفری کم ہے جبکہ مصری ورومی افواج کی نفری بہت زیادہ ہے آپ لوگ مفت میں مارے جائیں گے ہاں اگر آپ کو مال وزر کی خواہش ہے تو پھر اس کے لئے ہمارا بادشاہ مقوقس آپ کو حسب خواہش مال وزر دینے کے لئے تیار ہے۔

عمرو بن العاص:۔ہمیں نہ تو مال وزر کی لالچ ہے اور نہ ہی ملک گیری کی ہوس' ہم تو اسلام کے فرمان جہاد کے مطابق آپ لوگوں کو صراط مستقیم دکھلانے آئے ہیں اگر آپ کو ہماری شرائط منظور نہیں ہیں تو پھر آپ اپنے بادشاہ مقوقس کو واضح الفاظ میں بیان کردیں کہ ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ صرف تلوار ہی کرے گی۔

اس کے بعد عمرو بن العاص نے کسی بھی قسم کی بات چیت سے انکار کردیا اور وفد اپنے ارادوں میں یکسر ناکام رہ کر واپس چلا گیا اور شاہ مقوقس اور اس کی بیٹی ارمانوس کی یہ شاطرانہ چال ناکام ہوگئی کہ تھوڑی سی مہلت حاصل کر کے رومی ومصری فوج کو منظم کر کے مسلمانوں کو چالاکی و ہوشیاری سے قابو میں لایا جاسکے اور ان کا مکمل قلع قمع کیا جاسکے۔

بلبیس سے کچھ فاصلے پر ام دنین رومیوں کی ایک اہم چھاؤنی تھی۔اس طرح مسلمانوں کو بیک وقت دونوں قلعوں پر قبضہ کرنا تھا۔بلبیس اور ام دنین دونوں جگہ شام اور فلسطین کے بھگوڑے موجود تھے۔ان کو جب معلوم ہوا کہ مسلمان صرف چھ ہزار سواروں کے ساتھ مصر میں داخل ہوئے ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔انہیں یوں محسوس ہوا کہ جیسے دشمن خود اپنے جال میں پھنس گیا ہوا اور اب اسے بلبیس اور ام دنین کے درمیان گھیر کر مارا جاسکتا ہے۔ان کا

خیال کسی حد تک درست تھا کوئی اور دشمن ہوتا تو شاید وہ ان کے نرغے میں آ کر شکست کھا جاتا لیکن ان کا مقابلہ مسلمانوں سے تھا۔ ان مسلمانوں سے جن کیلئے یہ مشہور تھا کہ یہ قوم انسان نہیں بلکہ جنوں اور دیوؤں پر مشتمل ایک بلا ہے جو موت سے ڈرتی ہے نہ کسی تکلیف کی پرواہ کرتی ہے۔

سپہ سالار عمرو بن العاص کو کچھ سوار فرما میں چھوڑنے پڑے تھے۔ انہوں نے چار ہزار کے مختصر لشکر سے بیک وقت دونوں مقامات پر حملہ کیا۔ بلبیس والے سوچ رہے تھے کہ جب مسلمان ام دنین کا رخ کریں گے تو وہ قلعہ سے باہر نکل کر مسلمانوں پر پشت سے حملہ کر دیں گے۔ اس طرح ام دنین والوں نے سوچا تھا کہ وہ بلبیس کا رخ کریں گے تو ام دنین والے چھاؤنیوں سے نکل کر مسلمانوں پر حملہ کر دیں گے اور انہیں پیس کر رکھ دیں گے۔ لیکن عمرو بن العاص نے دونوں کو اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ نصف فوج کو بلبیس کے محاصرہ پر لگا کر باقی نصف سواروں کے ساتھ انہوں نے ام دنین پر حملہ کر دیا۔

ام دنین کے رومیوں نے اب تک مسلمانوں کی تلوار کی کاٹ نہ دیکھی تھی۔ اس لئے وہ کچھ زیادہ ہی پُر جوش اور پُر امید نظر آتے تھے۔ ان کی تعداد بھی کافی تھی۔ اس لئے انہوں نے مسلمانوں سے کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا۔ پھر جب ان کے آٹھ ہزار جوانوں کے سامنے عمرو بن العاص کے صرف دو ہزار جوان صفیں باندھے کھڑے تھے تو رومی خوب ہنسے۔

عمرو بن العاص اس جنگ میں شریک نہ تھے۔ وہ بلبیس کو زیادہ اہمیت دے رہے تھے اور وہ اس میں حق بجانب تھے کیونکہ بلبیس میں وہ رومی تھے جو مسلمانوں سے شکست کھا چکے تھے اور مسلمانوں کی حکمت عملی سے کسی حد تک واقف تھے۔ بلبیس میں اگر چہ دس روز تک مسلسل حملے ہوتے رہے مگر قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ برخلاف اس کے ام دنین کے رومیوں نے پہلے دن تو تلوار کے خوب جوہر دکھائے اور بہت جم کر مقابلہ کیا لیکن دوسرے دن ان میں سستی کے آثار پیدا ہو گئے اور بڑھ بڑھ کر حملے کرنے کا سلسلہ ختم ہو گیا اور تیسرے روز تو یہ کیفیت ہوئی کہ جیسے رومی فوج کو زبردستی میدان جنگ میں بھیجا گیا ہے۔ انہوں نے صبح ہی سے مدافعتی جنگ لڑنا شروع کر دی۔ مسلمانوں کو شاید اسی وقت کا انتظار تھا۔ انہوں نے اللہ اکبر کا نعرہ لگایا اور میمنہ و میسرا پر ٹوٹ پڑے۔ وہ ابھی سنبھلنے نہ پائے تھے کہ قلب جس میں خود عمرو بن العاص تھے وہ اتنی تیزی سے آگے بڑھے کہ رومی انہیں روکنے میں ناکام رہے اور یہی حملہ ان کی شکست کا پیش خیمہ بن گیا۔ رومیوں نے شکست کھا کر قلعہ میں داخل ہونے کی کوشش کی لیکن مسلمان ان سے پہلے ہی قلعہ کے صدر دروازے میں داخل ہو چکے تھے اور ام دنین پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور اب عمرو بن العاص نے بلبیس کی فتح کی جانب بھرپور توجہ دی کیونکہ ان کے سر سے اُم دنین کی جانب سے مسلمانوں پر حملے کا خطرہ ٹل گیا تھا۔

☆

جب وفد نا کام شاہ مقوقس کے پاس پہنچا تو مصری جرنیل بہت ہی جزبز ہوا کیونکہ وہ اس تجویز کے حق میں نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے ساتھ کھلی جنگ کرنا چاہتا تھا اس نے فوری طور پر بارہ ہزار فوج تیار کی اور شاہ مقوقس کی رضامندی کے بغیر ہی بلبیس کی جانب مسلمانوں پر حملہ کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔

ایک روز بعد تمام مسلمان لشکر نماز کی تیاری میں مصروف تھا کہ اچانک ہزاروں دوڑتے ہوئے گھوڑوں کا طوفان ان کی جانب بڑھا یہ

مصری جرنیل کی بھیجی ہوئی بارہ ہزار کی فوج تھی جس کی کمان ایک سالار مقریوس کر رہا تھا اور ان کا منشاء یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کے عقب سے اس وقت اچانک حملہ کریں گے جس وقت مسلمان اپنی عبادت میں مصروف ہونگے اور ان کے پاس دفاع کے لئے تیار ہونے کا وقت نہ ہوگا۔

اگرچہ مقریوس نے اپنی جانب سے بے خبری میں حملہ کرنے میں کسی بھی قسم کی کسر نہ چھوڑی تھی لیکن عمرو بن العاص اور ان کے سالار پہلے ہی اس بات کے لئے تیار تھے کیونکہ انہیں جاسوسوں کی مدد سے پہلے ہی اطلاع مل چکی تھی اس لئے مسلمان اس صورت حال سے نپٹنے کے لئے بالکل مسلح کھڑے تھے۔

اس وقت عمرو بن العاص کی فوج کی تعداد بمشکل پانچ ہزار کے قریب تھی آپ نے فوری طور پر جوابی حملے کا حکم دے دیا اور مسلمان لڑائی والی ترتیب میں منظم ہو گئے۔

بلبیس کی جانب سے حملے سے بچنے کے لئے عمرو بن العاص نے پہلے ہی اپنے محفوظ دستوں کو اس جانب لگا رکھا تھا اور ان کو ہدایت یہ تھی کہ وہ ہر صورت میں شہر کے اندر داخل ہونے کی کوشش کریں اسی لئے محفوظ دستہ دو حصوں میں بٹ کر قلعے کے دروازوں کے ارگرد چھپا بیٹھا تھا۔

ابھی حملے میں تیزی آئی ہی تھی کہ عمرو بن العاص کے پہلوؤں کے بل چھپے ہوئے دستوں نے بھی مقریوس کی فوج پر پہلوؤں کی جانب سے حملہ کر دیا اسی طرح رومی فوج کی تندہی اور تیزی رک گئی اور انہیں اپنی جان کے لالے پڑ گئے۔

دوسری طرف بلبیس میں موجود رومی فوج نے قلعہ کے اندر سے نکلنے کی جرأت ہی نہیں کی اور مسلمانوں پر اس طرف سے حملہ نہ ہو سکا۔

ابھی آدھا دن بھی نہ گزرا تھا کہ رومی پیچھے ہٹنے لگے اس موقع پر عمرو بن العاص نے تمام سالاروں کو حکم دیا کہ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے رومیوں کا تعاقب بالکل نہ کریں تاکہ ان کی نفری محفوظ رہ سکے۔ مقریوس لاتعداد لاشیں چھوڑ کر اور خاصی تعداد میں زخمی ہونے والے رومی فوجیوں کے ساتھ واپس بھاگ گیا اور اس طرح شاہ مقوقس اور اس کی بیٹی ارمانوس کو ایک اور گہرے صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔

مقریوس نے وہاں سے تقریباً چار میل پیچھے کی جانب لوٹ کر پڑاؤ ڈالا تاکہ زخمیوں کی دیکھ بھال کر سکے اور دوبارہ تیاری کر کے مسلمانوں پر حملہ آور ہو سکے عمرو بن العاص نے اپنے سالاروں کے مشورے سے پچاس سواروں پر مشتمل ایک چھاپہ مار دستہ تشکیل دیا اور اسے آدھی رات کو رومیوں پر شب خون مارنے کا حکم دیا۔

آدھی رات کو جب مقریوس اور اس کی تھکی ماندی فوج خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی کہ اس چھاپہ مار دستے نے اچانک شب خون مارا اور جب تک رومی خواب غفلت سے بیدار ہوتے ان کی اچھی خاصی تعداد کو نقصان پہنچا کر یہ دستہ واپس آ گیا۔

اس کے بعد چار روز تک یہ چھاپہ مار دستہ مسلسل مقریوس کی رومی فوج پر چھاپہ مارتا اور انہیں مجبور کر دیا کہ وہ واپس مصری دارالسلطنت کی جانب بھاگ جائیں۔

دوسری طرف عمرو بن العاص نے بلبس شہر پر حملے کی ذرا برابر بھی کاروائی نہ کی اور اس انتظار میں رہے کہ رومی قلعہ سے باہر آ کر مقابلہ کریں گے لیکن ایسی کوئی صورت حال پیدا نہ ہوئی۔

ایک روز رومی جرنیل مقریوس نے قلعہ بلبیس والوں کواطلاع بھیجی کہ اگلی صبح ایک طرف سے وہ مسلمانوں پرحملہ آور ہوگا اور دوسری طرف سے وہ قلعہ سے باہر نکل کرمسلمانوں پرحملہ کریں اوراس طرح مسلمانوں کودونوں طرف سے گھیر کران کا خاتمہ کیا جاسکے۔

اگلی صبح مقریوس اپنے بچے کچے لشکر کے ساتھ رومی پرچم لہراتا نمودار ہوا تو دوسری طرف سے رومی فوج شہر بلبیس کے دروازے کھلوا کر باہر نکلی مسلمانوں نے اس صورت حال میں فوری حرکت کرتے ہوئے سب سے پہلے مقریوس کونشانہ بنایا اوراس کا پرچم نیچے گرادیا اور ایک زوردار آواز کے ساتھ رومی پرچم کے گرنے اور مقریوس کے مارے جانے کا اعلان کردیا۔

یہ اعلان سنتے ہی رومی فوج بھاگ کھڑی ہوئی اور قلعہ سے نکلنے والی فوج بھی رک گئی اوراس نے قلعہ میں واپس داخل ہونے کی کوشش کی لیکن مجاہدین کے محفوظ دستوں نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازوں پر موجود رومی فوج پرحملہ کردیا اور رومی فوج کواندر جانے سے نہ صرف روک لیا بلکہ خودبھی شہر میں داخل ہوگئے۔

اس طرح رومی فوج دوحصوں میں بٹ کر بدحواس ہوگئی اور بجائے اپنا دفاع کرنے کے وہ بھاگ اٹھی۔

مجاہدین کالشکر شہر میں داخل ہوگیا اور شہر بلبیس کے اندر موجود رومی سپاہ نے ہتھیار ڈال دیے۔

بلبیس کی فتح نے مسلمانوں کیلئے شہر مصر تک کا راستہ بالکل صاف کردیا۔عمرو بن العاص کسی قسم کی تاخیر کرکے رومیوں کوسنبھلنے کا موقع نہیں دینا چاہتے تھے۔انہوں نے شہر مصر کا رُخ کیا۔ایک اندازے کے مطابق شہر مصر میں ایک لاکھ سے زیادہ رومی اور مصری (قبطی) لشکر موجود تھا۔انہیں بلبیس کے محاصرہ کی خبر مل چکی تھی۔وہاں سے انہوں نے تین چھوٹے چھوٹے دستے بلبیس کی مدد کو بھیجے لیکن رومیوں کی یہ کمک بلبیس والوں کے کام نہ آسکی۔ایک تو بلبیس اور ام دبنین کے درمیان کا تمام علاقہ میدان جنگ بنا ہوا تھا اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں نے بلبیس کا اس قدر سخت محاصرہ کیا تھا کہ قلعہ کے اندر پرندہ بھی پر نہ مار سکتا تھا۔پس شہر مصر سے آئی ہوئی یہ کمک راستہ میں ایک جگہ اکٹھی ہوگئی تھی اور یہ سوچ رہا تھا کہ مسلمانوں کونقصان پہنچانے کے کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔اس دوران انہیں بلبیس کی مسلمانوں کے ہاتھوں فتح کی خبر ملی۔اس سے ان میں بڑی بے چینی پیدا ہوگئی۔ وہ بے نیل ومراد شہر مصر میں واپس نہیں جانا چاہتے تھے۔

بہت غور وفکر کے بعد کمک کے ان دستوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مسلمانوں پر اثنائے راہ میں حملہ کرکے انہیں نقصان پہنچائیں گے۔عمرو بن العاص کومعلوم ہوگیا تھا کہ شہر مصر تک اب کسی بھی جگہ مدافعت کا امکان نہیں لیکن وہ بڑی احتیاط سے قدم بڑھا رہے تھے۔اگلی منزل پر روانہ ہونے سے پہلے وہ سوسواروں کا دستہ روانہ کرتے اور انہیں تاکید ہوتی تھی کہ وہ راستے کے دونوں طرف دور دور تک پتہ لگائیں کہ کہیں دشمن گھات میں تو لگا نہیں بیٹھا ہے۔یہ ایک قسم کا ہراول دستہ ہوتا تھا۔اس دستے نے خود کو کئی ٹکڑیوں میں بانٹ رکھا تھا تاکہ ایک تو دور دور تک پتہ لگایا جاسکے اور اگر دشمن کے کسی لشکر سے اچانک مڈبھیڑ ہوجائے تو کم ازکم نقصان ہو۔

عمرو بن العاص کی اس حکمت عملی کا پہلی ہی منزل پر اندازہ ہوگیا۔ ہراول دستہ کے پندرہ سوار ایک طرف کو گھوڑے اڑائے چلے جارہے تھے کہ انہیں دشمن کا ایک پورا لشکر راستہ روکے دکھائی دیا۔اس لشکر نے اونچی جگہوں پر قبضہ کررکھا تھا اور مقابلے کیلئے صفیں درست کرلی تھیں۔اس

خطرے کو دیکھتے ہی سواروں نے تیزی سے گھوڑے موڑے اور لشکر اسلام کی طرف گھوڑے دوڑانا شروع کر دیئے۔ عمرو بن العاص آہستہ آہستہ کوچ کرتے آ رہے تھے کہ ہراول سوار گھبرائے ہوئے ان کے پاس پہنچ گئے۔

''سردار! آگے دشمن راستہ روکے کھڑا ہے۔''

ایک ہراول دستہ نے اطلاع دی اور عمرو بن العاص نے فوراً پڑاؤ کا حکم دے دیا۔ جب پڑاؤ پڑ گیا اور ہر طرف پہرے و چوکی کا معقول انتظام ہو گیا تو عمرو بن العاص نے اطلاع دینے والوں میں سے ایک کو بلایا۔

''اب بتاؤ۔ دشمن ہم سے کتنے فاصلے پر ہے؟''

''تقریباً نصف منزل پر دشمن موجود ہے۔ سالار!''

''دشمن کی تعداد کا کیا اندازہ ہے؟''

''دشمن میدان میں صفیں باندھے کھڑا ہے۔ سالار میں صحیح اندازہ نہیں کر سکا لیکن ان کی تعداد کئی ہزار معلوم ہوتی ہے اور وہ مقابلہ کیلئے بالکل تیار نظر آتے ہیں۔''

عمرو بن العاص نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا اور پھر یہ احکام جاری کئے۔

پہلا حکم یہ تھا:۔

''آگے بڑھ کے ضرب لگانے کی بجائے اس کا انتظار کیا جائے۔''

دوسرا حکم تھا:۔

''پورا لشکر خود کو میدان جنگ میں سمجھے اور سوائے انتظامی دستوں کے باقی لشکر مدافعتی جنگ کیلئے کیل کانٹے سے درست رہے۔''

تیسرا حکم یہ تھا:۔

''فوراً گھوم پھر کر اونچے اور محفوظ مقامات پر قبضہ کر لیا جائے۔''

اس دوران ہراول دستہ کے دو ٹکڑیاں اور واپس آ گئیں۔ کم و بیش ان کی بھی یہی اطلاع تھی کہ دشمن صفیں باندھا کھڑا ہے اور لشکر اسلام کے حملہ کا منتظر ہے۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ رومیوں نے اردگرد کے تمام اہم مقامات پر تیر اندازوں کے دستے مقرر کئے ہیں۔ عمرو بن العاص نے ہراول دستوں کو پھر آگے بھیج دیا اور خود دفاعی انتظامات دیکھنے میں لگ گئے۔ ابھی دن کا کچھ حصہ باقی تھا اور اگر دشمن تیزی سے بڑھتا تو وہ شام تک پہنچ سکتا تھا لیکن شام تک ان کے بارے میں کوئی اطلاع نہ آئی۔ لشکر اسلام نے یہ رات بڑی بے چینی سے گزاری۔ صبح دم اطلاع آئی کہ دشمن اپنی جگہ بدستور ڈٹا ہوا ہے اور مسلمانوں کا انتظار کر رہا ہے۔

وہ دن بھی گزر گیا مگر دشمن نے پیش قدمی نہیں کی۔ عمرو بن العاص کو چونکہ ابھی تک دشمن کی صحیح تعداد کا اندازہ نہ ہو سکا تھا اس لئے انہوں

نے آگے بڑھنے سے گریز کیا اور پہرے و چوکی میں اور زیادہ اضافہ کر دیا۔

بالآخر عمرو بن العاص نے ایک چھاپہ مار دستہ تیار کیا اور اسے اس رومی پڑاؤ پر چھاپہ مارنے کا حکم دیا چھاپہ مار دستے نے ایک جگہ گھات لگائی اور پھر اچانک رومی فوج پر حملہ کر دیا رومی اس شب خون سے گھبرا گئے اور وہ سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ ان کا اچھا خاصا نقصان کر کے یہ دستہ جدھر سے آیا تھا اسی سمت تیزی سے واپس چلا گیا اس لڑائی میں عیسائی رومی فوج کا تجربہ کار جرنیل ختنا بھی مارا گیا۔

آخر دوسری رات نصف شب کے بعد چھاپہ مار دستے کے کچھ سوار واپس آئے۔

''سپہ سالار! دشمن خوفزدہ ہو کر پسپا ہو رہا ہے۔''

ایک سوار نے بڑی مسرت سے بتایا۔

عمرو بن العاص جو کہ اس وقت جاگ رہے تھے اور اپنے خیمے میں بیٹھے حالات پر گفتگو کر رہے تھے۔ وہ دشمن کی پسپائی کی خبر سن کر فوراً سجدے میں جھک گئے۔ ان کے سرداروں نے ان کی تقلید کی اور بارگاہ ایزدی میں سر کو جھکا دیا۔ کچھ دیر کے بعد عمرو بن العاص نے سجدے سے سر اٹھایا۔

''دوستو! دشمن کی پسپائی ہماری فتح کی نوید ہے اور اب دشمن کو موقع نہ ملنا چاہئے۔''

سردار اگرچہ خاموش رہے مگر ان کے چہرے خوشی سے چمک اٹھے تھے۔

''ہمیں کوچ کی تیاری کرنی چاہئے۔''

عمرو بن العاص کھڑے ہو گئے۔

ان کے نائب سردار نے ادب سے عرض کیا۔

''سپہ سالار! کیا علی الصبح کوچ کرنا چاہتے ہیں۔''

''صبح کا انتظار نہیں کیا جا سکتا۔''

عمرو بن العاص نے بڑے جوش سے کہا۔

''اسلام کا لشکر ابھی اور اسی وقت کوچ کرے گا۔''

سپہ سالار کا حکم بالکل واضح تھا۔ ہر طرف کوچ کوچ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ خیمے اکھاڑ لئے گئے اور بار برداری کے جانوروں پر لادے جانے لگے۔ اللہ اللہ کیا جوش تھا مسلمان مجاہدین میں۔

ادھر سپہ سالار عمرو بن العاص فتح و نصرت کا پھریرا اڑاتے شہر مصر کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کے قدم بڑھانے کا انداز یہ تھا کہ چھوٹا بڑا جو قلعہ فتح ہوتا تھا اس کے فوری انتظام کرتے۔ ان کے پاس لشکر بہت کم تھا اور کسی طرف سے کمک آنے کی کوئی امید نہ تھی۔ اس لئے جب تک وہ مفتوحہ علاقوں کا انتظام درست نہیں کر لیتے تھے وہ دوسرے قلعہ کی جانب نہیں بڑھتے تھے۔ آگے بڑھتے وقت وہ کچھ مسلمان سواروں کو بھی مفتوحہ علاقوں میں چھوڑ دیتے تھے تاکہ وہ مقامی آبادی کی انتظامی ضرورتوں میں مددگار ثابت ہوں۔ اس طرح ان کی رفتار اگرچہ کچھ سست ہو گئی تھی لیکن مفتوحہ علاقوں

پر قبضہ مستحکم ہوتا جارہا تھااورانہیں یہ فکر نہ تھی کہ ان کے آگے بڑھنے سے بغاوت ہوجائے گی۔

دراصل عمرو بن العاص مصر کو شکست ہی نہ دینا چاہتے تھے بلکہ مصر کو فتح کر کے اس پر مسلمانوں کا قبضہ ہمیشہ کیلئے برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ یہی طریقہ مسلمانوں کا ہر جگہ رہا تھا۔ انہوں نے جس مقام کو بھی فتح کیا اس پر پہلے قبضہ مستحکم کیا اور پھر آگے بڑھے۔

☆

شاہ مقوقس اس رومی لشکر کو بھیج کر یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ وہ کسی بھی گھڑی مسلمانوں کی شکست کی خبر سن لے گا اس وقت وہ شہر بابلیون میں بیٹھا اس خبر کو سننے کے لئے بے تاب تھا کہ اچانک اسے اطلاع ملی کہ اس کا بھیجا ہوا جرنیل خنا مارا گیا ہے اور رومی فوج پسپا ہوکر آرہی ہے اس خبر نے اسے اور اس کی بیٹی ارمانوس کو بدحواس کردیا یہ ان کے لئے بے حد نا قابل برداشت صدمہ تھا کیونکہ خنا کا تعلق ہرقل کے شاہی خانوادے سے تھا اور اب انہیں یقین ہوگیا کہ وہ شاید مصر کی بادشاہت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہوجائیں گے۔

جب خنا کی لاش اس کے پاس لائی گئی تو اس نے بلند اور غصیلی آواز میں عہد کیا کہ اب وہ مصر سے مسلمانوں کو نکالنے کے لئے اپنی تمام تر جنگی قوت استعمال کرے گا اور مسلمانوں کا نام ونشان بھی مصر سے مٹا دے گا جبکہ صورت حال یہ تھی کہ رومی فوج کا جنگی جذبہ بہت زیادہ پست ہو چکا تھا۔

شاہ مقوقس بابلیون میں بیٹھا پیچ وتاب کھا رہا تھا۔ عمرو بن العاص نے بابلیون کی جانب کوچ کرنے کا حکم لشکر کو سنایا تا کہ اس شہر کو محاصرہ میں لے لیا جائے۔

اسی روز بعد نماز ظہر انہیں اطلاع ملی کہ شاہ مقوقس اور سپہ سالار تھیوڈور بہت زبردست تیاری کررہے ہیں اور اس مرتبہ رومی فوج شہر سے باہر نکل کر مسلمانوں کو للکارے گی اس خبر سے عمرو بن العاص بہت خوش ہوئے اور اپنے سالاروں کو بلا کر تفصیلی مشورہ کیا۔

سب سے پہلے لڑائی کے میدان کا انتخاب کیا گیا اس کے بعد فوج کی ترتیب تو سمجھائی گئی اور قبل اس کے رومی فوج شہر سے نکل کر اپنی پسند کا میدان منتخب کرے مسلمان فوج اس جگہ پر اپنا تسلط قائم کرے تا کہ رومی فوج کو اپنی پسند کی جگہ پر شکست دے سکے۔

بعد از نماز عشاء عمرو بن العاص کو اطلاع ملی کہ رومی فوج شہر سے باہر نکل آئی ہے اور اس کا رخ عین الشمس کی جانب ہے رومیوں کی تعداد سے بھی انہیں مطلع کیا گیا اس موقعہ پر عمرو بن العاص نے مسلمان فوج سے یوں خطاب کیا۔

”رومی فوج پہلی مرتبہ کھلے میدان میں آرہے ہیں اور ان کی تعداد بھی ہم سے بہت زیادہ ہے تم نے کبھی تعداد کی پرواہ نہیں کی کیا ہمارا یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے جس نے تمہیں اتنی کم تعداد میں ہونے کے باوجود دریائے نیل تک پہنچا دیا ہے یہ بات یاد رکھو کہ اگر آج ہمارے قدم اکھڑ گئے تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہ جا سکے گا ہمارا نام ونشان تو مٹ جائے گا لیکن مصر میں اسلام کے لئے دروازے ہمیشہ بند ہوجائیں گے۔“

اب عمرو بن العاص نے عین الشمس اور بابلیون کے درمیانی علاقے میں موجود پہاڑی علاقے کے غاروں میں گھات لگانے کے لئے ایک دستہ روانہ کیا اور دوسرے دستہ کو دوسری جانب گھات لگانے کا حکم دیا۔

جب رومی جرنیل تھیوڈور کو پتہ چلا کہ مسلمان عین الشمس میں لڑنے کیلئے آرہے ہیں تو وہ بہت خوش ہوا اور اس نے رومی فوج سے یوں خطاب کیا۔

''سلطنت روم کے جانبازو! تمہارا دشمن تمہیں بزدل اور کمزور سمجھتا ہے آج وہ تمہارے سامنے آ کر لڑنے آ رہا ہے اس کی تعداد تمہاری تعداد کے نصف سے بھی بہت کم ہے آج ثابت کر کے دکھا دو کہ بزدل کون ہے اگر آج تم اس میدان سے پیچھے ہٹ گئے تو پھر اتنے زرخیز اور خزانوں سے بھرے ہوئے ملک سے محروم کر دیے جاؤ گے سلطنت روم بحیرہ روم کے پار سکڑ جائے گی پھر تمہاری قسمت میں مسلمانوں کی غلامی یا بحیرہ روم میں ڈوب مرنا لکھ دیا جائے گا آج قسم کھالو کہ ان مٹھی بھر مسلمانوں کو کاٹ کر اس ریگستان میں پھینک دو گے۔'' جس پر ساری فوج نے فتح حاصل کرنے یا جانیں دینے کی قسم کھائی۔

صبح کو دونوں افواج آمنے سامنے صف آراء ہوئیں۔ عمرو بن العاص نے اعلان کروادیا کہ رومی حملے میں پہل کریں تا کہ ان کے دل میں کسی بھی قسم کا افسوس نہ رہے کہ عرب کے مسلمانوں نے ان کو پہل کرنے کا موقع نہیں دیا جس پر تھیوڈور نے باقاعدہ حملے کا حکم دے دیا۔

عمرو بن العاص کی ہدایات کے مطابق پہلوؤں والے دستے اور زیادہ دائیں اور بائیں جانب کو چلے گئے رومی افواج نے یک دم ہلہ بولا تو مسلمان سپہ سالار عمرو بن العاص نے رومیوں کا سامنا کیا اور پہلے سے دی گئی ہدایات کے مطابق فوج کو آہستہ آہستہ پیچھے ہٹانے لگے اور اس طرح رومی لشکر اور زیادہ آگے آ گیا۔

اس جگہ انتہائی گھمسان کا رن پڑا اچانک رومیوں پر دونوں پہلوؤں سے حملہ ہوا اور وہ اندر کی جانب سمٹنے لگے یہاں تک کہ ان کے لئے پینترے بدلنے کی جگہ تک نہ بچی ان کے گھوڑے آپس میں ہی ٹکرانے لگے۔

دوسری طرف تھیوڈور بھی بہت اچھی چالیں چل رہا تھا اپنی فوج کو یوں سمٹتے ہوئے دیکھ کر اس نے اپنی فوج کو پیچھے ہٹالیا اس نے بھی اب مجاہدین کے پھیلاؤ کے مطابق اپنے دستے پھیلا دئے تھے۔

مغرب کے قریب مسلمانوں نے رومی فوج کو پھر گھیرے میں لے لیا اور عین اس وقت بنووائل کے غاروں میں چھپے ہوئے مسلمانوں کے تازہ دم دستے نے رومیوں پر عقب سے حملہ کر دیا۔ رومی اس حملے سے گھبرا گئے اور ان کی صفوں میں انتشار پھیل گیا اور وہ جس طرف منہ اٹھا اسی طرف بھاگ کھڑے ہوئے۔

جیسے ہی وہ پہاڑی کے دوسری طرف پہنچے تو ان پر مجاہدین کے دوسرے دستے نے حملہ کر دیا اس طرح رومی بری طرح مارے گئے اور بری طرح بدحواس ہو کر بھاگ نکلے اور ان کی بہت بڑی تعداد قتل ہوگئی اور انتہائی کم تعداد میں رومی زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو سکے اور قلعہ بابلیون میں جا کر پناہ گزین ہوئے۔

مقوقس جو بابلیون میں تھا اپنی فوج کا یہ حشر دیکھ کر بوکھلا اٹھا دوسری طرف اس کی بیٹی بھی پاگلوں کی طرح باپ کا منہ دیکھنے لگی اور انہیں شدید صدمہ پہنچا لیکن مسلمانوں نے بابلیون پر حملہ کرنے کی بجائے اپنی پیش قدمی کا رخ موڑ دیا جس پر مقوقس اپنی بیٹی کو ہمراہ لے کر ممفس واپس چلا گیا اور قلعہ کسی جرنیل کی ذمہ داری پر چھوڑ گیا جسے بعد میں مسلمانوں نے بڑی زبردست جدوجہد کے بعد فتح کر لیا۔

☆

حمقس کا قلعہ اور شہر پناہ بہت ہی مضبوط اور خوبصورت تھا اس کے پاس سے ایک چوڑا نالہ جو دراصل دریائے نیل کی ایک شاخ تھی وہ گزرتی تھی قلعہ کا صدر دروازہ اس نالے کی طرف تھا اور اس طرح یہ قلعے کے دفاع کا کام دیتا تھا۔

مجاہدین کا لشکر جب حمفس کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ فوج قلعے کے باہر ان کے استقبال کے لئے کھڑی ہے جاسوسوں کی اطلاع کے مطابق رومی فوج کی جس قدر تعداد قلعہ سے باہر تھی اسی قدر قلعہ کے اندر تھی عمرو بن العاص نے اپنی فوج کی ترتیب درست کی اتنے میں رومی فوج نے حملے میں پہل کی عمرو بن العاص نے نہایت ہوشیاری سے اپنے انداز سے حملے کو روکنے کے لئے اپنے دستوں کو آگے بڑھایا لیکن اپنے محفوظ دستے پیچھے ریزرو میں رکھے۔

رومیوں نے نہایت شدومد سے زوردار حملہ کیا تھا لیکن عمرو بن العاص کی ہدایت کے تحت تمام سالار سپاہیوں کی مانند نہ صرف لڑ رہے تھے بلکہ اپنے اپنے دستوں کو تنظیم سے بکھرنے سے بچا بھی رہے تھے اس دن ہر مجاہد کی یہ سوچ تھی کہ یا تو آج شہید ہونا ہے یا رومی فوج کو شکست فاش دینا ہے۔ بعض مجاہدین کی کوشش یہ تھی کہ رومی پرچم بردار تک پہنچا جائے اور رومی پرچم خاک زمین کر دیا جائے۔ سارا دن شدید ترین لڑائی جاری رہی رومیوں کا بہت زیادہ جانی نقصان ہوا ادھر مجاہدین بھی کئی شہید ہو گئے بہرحال غروب آفتاب کے بعد جنگ روک دی گئی اور رومی لشکر دوبارہ قلعہ بند ہو گیا۔

آٹھ دن کی مسلسل لڑائی کے باوجود بھی مسلمان اس شہر کو فتح نہ کر سکے تھے اور ان آٹھ دنوں میں مجاہدین کی تعداد دن بدن کم ہوتی جا رہی تھی۔ اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے مجاہدین کی بیویاں جو لشکر کے ہمراہ تھیں انہوں نے بھی مردوں کے شانہ بشانہ لڑنے کا عزم صمیم عمرو بن العاص کے سامنے ظاہر کیا لیکن عمرو بن العاص نے ان کو اس بات سے اس وقت تک کے لئے روک دیا جب تک مجاہدین کے اندر دم خم باقی تھا۔

اس جنگ کی طوالت کو دیکھتے ہوئے اور مجاہدین کی دن بدن کمی کو مدنظر رکھتے ہوئے عمرو بن العاص پریشان سے ہو گئے اور بالآخر انہوں نے میدان جنگ سے قدرے پیچھے ہٹ کر اپنی محفوظ فوج نے نماز صلوٰۃ الخوف پڑھی اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کے حضور دُعا مانگی کہ وہ مجاہدین کی جانوں کی قربانی قبول کر لے اور مسلمانوں کو فتح نصیب فرما دے۔

بالآخر ان کی دُعا بارگاہ ایزدی میں بازیاب ہوئی اور قلعہ بند رومی فوج اور شہریوں کے درمیان اختلافات ابھرنے لگے اور وہ ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگے بالآخر مجاہدین نے سالار زبیر بن العوام کی تجویز پر اپنی جان پر کھیل کر نالہ پار کیا اور نالے کے اوپر موجود پلوں کو کاٹ دیا گو پلوں کے ستون پوری طرح تو نہ کٹ سکے لیکن کافی حد تک کمزور ہو گئے۔

اگلی صبح جیسے ہی رومی فوج سیلاب کی مانند قلعہ سے باہر نکلی اور ان پلوں پر سے گزری تو بہت تھوڑی فوج نالے کے اس طرح پہنچ سکی اور رومی فوج کا معتد بہ حصہ اپنے گھوڑوں سمیت اس نالے میں جا گرا اور دریا کی طغیانی میں بہہ نکلا بہت سے رومی غرق آب ہوئے اور بہت کم زخمی حالت میں اسکندریہ پہنچے جو رومی فوج کے اس طرف آ گئے تھے ان کو مجاہدین نے اچانک حملہ کر کے تہہ تیغ کر دیا۔

اس حملے کو شاہ مقوقس، اس کی بیٹی ارمانوس اور جرنیل تھیوڈورا اور جارجس بھی دیکھ رہے تھے رومی فوج کی اس طرح کی تباہی نے ان کا دماغ

خراب کر دیا اور وہ متوحش حالت میں کافی دیر سکتے میں کھڑے رہے جب ہوش آیا تو فوراً قلعہ کی سیڑھیوں سے اتر کر محل میں پہنچے اور وہاں سے اپنا سب کچھ سمیٹ کر قلعہ کے پچھلے دروازے سے بھاگ اٹھے اور سیدھے اسکندریہ جا کر دم لیا۔

ادھر مسلمانوں نے شہر میں مچنے والی افراتفری سے فائدہ اٹھایا اور رومی جو قلعہ کا دروازہ عجلت میں بند کرنا بھول گئے تھے نالہ پار کر کے اس دروازے سے اندر داخل ہو گئے اور اندر گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی جو نصف دن تک جاری رہی جبکہ بھگوڑے شہری اور رومی فوجی قلعہ کے پچھلے دروازوں سے شہر چھوڑ کر افراتفری میں بھاگتے رہے اور اپنی ہی افراتفری کی لپیٹ میں کچلے جاتے رہے اس طرح بہت تھوڑے رومی شہر ممفس سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے بہت زیادہ قیدی بنا لئے گئے اور ان کو عمرو بن العاص نے قتل کروا دیا تا کہ مسلمانوں کے لئے عقب سے آئندہ رومی حملے کا امکان باقی نہ رہے۔

رومیوں کا گورنر قیروس اسکندریہ میں مقیم تھا۔ اسکندریہ رومیوں کا سب سے مضبوط گڑھ، سب سے اہم قلعہ اور سب سے بڑی فوجی چھاؤنی تھا۔ چونکہ اسکندریہ بحر روم میں واقع تھا اس لئے رومیوں کیلئے سب سے زیادہ اہم تھا۔ انہیں یہاں سے فوری بحری مدد مل سکتی تھی اور اس بحری مدد سے غریب قبطی اب تک ان کے پنجے سے نہ نکل سکے تھے۔ قیروس کا نائب جارجس شہر مصر کے قلعوں کا قلعہ دار تھا اور وہاں اس کی کمان چلتی تھی۔ قلعہ قصر الشمع میں یوں تو مقوقس شاہ مصر معہ اپنی خوبصورت بیٹی شہزادی ارمانوس کے موجود تھا لیکن دراصل بات جارجس کی چلتی تھی اس لئے وہ اس وقت گورنر اور سپہ سالار دونوں کے فرائض سنبھالے ہوئے تھا۔

جارجس اور شہزادی ارمانوس کے درمیان ایک عرصہ سے اختلاف چلا آ رہا تھا۔ اسی وجہ سے شہزادی عام طور پر شہر مصر کی بجائے اسکندریہ میں ہی رہتی تھی کیونکہ وہ وہاں جارجس کے شر سے محفوظ تھی۔ لیکن جب مسلمانوں کے مصر پر حملہ کی اطلاع ملی تو شاہ مقوقس بے چین ہو گیا اور اپنے دارالسلطنت ممفس یعنی شہر مصر پہنچ گیا اور اس لئے شہزادی ارمانوس اپنے باپ کے ساتھ شہر مصر آ گئی تھی۔ جس دن شہزادی ارمانوس نے شہر مصر میں قدم رکھا تھا اسی دن جارجس اور ارمانوس کی پرانی دشمنی پھر سامنے آ گئی تھی۔ شاہ مقوقس، شہزادی اور جارجس کے اختلافات بھی اپنے آپ ابھر آئے تھے بلکہ پورے ملک میں پھیل گئے تھے۔

شاہ مقوقس کو مصر کی بحری طاقت پر بڑا ناز تھا مگر اس کا مالک جارجس تھا۔ اس لئے شاہ مقوقس چاہتا تھا کہ ان دونوں کا اختلاف ختم ہو جائے مگر شہزادی کو اپنے ملک کا سپہ سالار بالکل پسند نہ تھا۔ شاہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ مصر کی بحری طاقت جارجس کے ہاتھ میں تھی اس لئے وہ شہزادی کو ہر موقع پر سمجھاتا رہتا تھا اور اسے تاکید کرتا کہ جارجس کے سائے سے بھی بچی رہے۔ شہزادی خود بہت احتیاط کرتی مگر اس احتیاط کے باوجود اس کا کسی نہ کسی وقت سپہ سالار جارجس سے سامنا ہو جاتا تھا جو تلخی کا باعث بنتا تھا۔

اسکندریہ میں کیا حالات تھے ان کے بارے میں جاننے کے لئے عمرو بن العاص نے جاسوسی کا جو جال پھیلا رکھا تھا ان کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ شہر کے اندر کسی نہ کسی طرح داخل ہوں اور وہاں کے حالات سے آگاہی حاصل کر کے آئیں انہی جاسوسوں میں ایک انتہائی خوبصورت جوان قاسم بھی شامل تھا۔

چونکہ جارجس نے شاہ مقوقس اور مذہبی پیشوا قبروس کے ساتھ مجلس مشاورت کے تحت قلعہ اور شہر کے تمام دروازے مکمل طور پر بند کر رکھے تھے شہر کو شمال کی طرف سے بحر روم تحفظ دیتا تھا اور جنوب کی طرف سے دریائے نیل گزرتا تھا مشرق کی جانب دلدلی علاقہ تھا جبکہ ایک ہی راستہ مغرب کی طرف کا کھلا ہوا تھا جس راہ پر مسلمان ممفس کو فتح کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔

قاسم نے دریائے نیل کی جانب سے شہر تک پہنچنے کی اسکیم تیار کی اور وہ دریا کنارے پہنچ گیا اور وہاں کسی کشتی کا انتظار کرنے لگا۔ دوسری طرف جارجس نے بے حد سخت انتظامات کئے ہوئے تھے اور کسی بھی اجنبی کو سخت تلاش اور پوچھ گچھ کے بغیر شہر میں داخلے کی اجازت نہ تھی۔

قاسم کو تیسرے روز یہ کامیابی حاصل ہوئی کہ ایک چھوٹی کشتی دریا پار کرنے کے لئے میسر آ سکی قاسم نے ایک دہقان کا روپ دھارا ہوا تھا لیکن کشتی جب عین دریا کے وسط میں پہنچی تو کہیں سے ایک تیر آیا اور قاسم کے دماغ پر آن کر لگا جس سے قاسم زخمی ہو گیا اور چکر آنے کی وجہ سے دریائے نیل میں جا گرا۔

دریا اس کو بہاتا ہوا اس سمت میں لے گیا جس طرف شہزادی ارمانوس کا محل تھا وہ اس وقت محل کی کھڑکی میں سے دریا کا نظارہ کر رہی تھی اس کے ساتھ اس کی رازدان کنیز تلشا بھی کھڑی تھی کہ اچانک انہوں نے ایک خوبصورت جوان کو بے ہوشی اور زخمی حالت میں دریا میں بہتا ہوا اپنی سمت آتا دیکھا شہزادی کو یہ صورتحال دلچسپ معلوم ہوئی لیکن جیسے ہی اس کی نظروں نے قاسم کے چہرے کی دلکشی' شادابی اور اس کے حسین سراپا کا جائزہ لیا اس کے دل میں اس کے لئے رحم کا جذبہ ابھرا اور اس نے کنیز کو حکم دیا کہ کسی کو فوری طور پر بھیج کر اس جوان کو دریا میں غرق ہونے سے بچائے اور اس کو اس کے شاہی محل میں لا کر شاہی طبیب سے اس کا علاج کروائے تا کہ پتہ چل سکے کہ یہ کون جوان ہے اور کس بنا کی بنا پر دریا میں زخمی ہو کر گرا ہے۔

کنیز نے حکم کی تعمیل کی اور محل کا دریائی جانب والا دروازہ کھول کر باہر شہزادی کے بجرے کے ملاح کو بلایا اور اس کو شہزادی کا حکم سنایا۔

ملاح جو کہ شہزادی کا باوفا ملازم تھا اس نے شہزادی کے حکم پر سر خم کیا اور دریا میں کود کر اس بے ہوش نوجوان قاسم کو اپنے ہمراہ دریا کنارے لے آیا اس نے اس بات کا بھی خیال رکھا کہ کہیں جارجس کے گشتی دستے کی نظروں میں نہ آ جائے جس سے کوئی مصیبت نہ کھڑی ہو جائے اور اس طرح قاسم عالم بے ہوشی میں شہزادی کے محل کے مہمان خانے میں پہنچ گیا۔

شہزادی نے اس کے علاج کے لئے اپنے طبیب خاص کو مقرر کیا شہزادی روزانہ خود بھی دن میں دو مرتبہ قاسم کو دیکھنے آتی تھی اور طبیب سے بھی مشورہ کرتی رہتی تھی البتہ اس نے کنیز اور طبیب کو سختی سے یہ ہدایت کی ہوئی تھی کہ یہ راز محل سے باہر کسی کو بھی نہ پتا چلے وگرنہ جارجس اس معاملے میں دخل اندازی کرے گا اور جس کا نتیجہ شہزادی اور اس کے درمیان موجود چپقلش کا واضح انداز میں اظہار ہوگا اور ہو سکتا ہے کہ خون خرابہ بھی ہو۔

احتیاط اس لئے بھی ضروری تھی کہ انسانوں کے اس شہر میں رومی افواج کی تعداد زیادہ تھی جبکہ شاہ مقوقس کا اثر قدرے کم تھا رومی افواج کی کمان اس وقت جارجس کے ہاتھ میں تھی جو انتہائی بدقماش' کینہ پرور اور عورتوں پر بری نظر رکھنے والا سپہ سالار تھا اس کی لالچی اور جنسی تلطظ والی نظریں ہمہ وقت شہزادی کے حسن کو اپنی دسترس میں رکھنے پر لگی رہتی تھیں اور وہ ہر صورت کسی نہ کسی بہانے کی تلاش میں بھی مگن رہتا تھا یہ تو شہزادی ارمانوس تھی جو اس کو نہ تو کوئی موقع فراہم کرتی تھی اور نہ ہی اس کے کسی دام فریب میں اب تک آئی تھی۔

شہزادی پہلی ہی نظر میں محبت کے تیر کا شکار ہو چکی تھی اور اس کے دل میں اس جوان کی رعنائی اس قدر رکھب گئی تھی کہ وہ ایک پل بھی اس کو دیکھے بغیر چین نہ لیتی تھی دن میں کئی مرتبہ اس کے کمرے میں جاتی اور اکثر ٹکٹکی باندھے اس کے چہرے کا اپنی نظروں سے طواف کرتی رہتی۔

دوسری طرف جیسے ہی قاسم کو ہوش آیا تو اس کی نظر نے جس شے کو سب سے پہلے دیکھا وہ شہزادی کا حسین وجمیل سراپا اور حسن بے پناہ تھا ایسے میں جیسے ہی اس کی نظریں شہزادی کی نظروں سے ٹکرائیں وہ بھی محبت کے کیوپڈ کے چلائے ہوئے تیر کا شکار ہو گیا اور کافی دیر تک دونوں ایک دوسرے کی طرف مبہوت بنے تکتے رہے پھر قاسم کو ہوش آیا تو اس نے شہزادی کی طرف سے اپنی نگاہیں پھیر لیں لیکن ساتھ ہی دل سے ایک ہوک سی اٹھی کہ یہ حسین صورت اس کے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہے۔

چونکہ وہ یہاں اجنبی تھا اس لئے اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یہ حسین وجمیل پیکر کون ہے؟ جس کی پہلی ہی نظر نے اس کے دل کا چین اور قرار چھین لیا ہے۔

دو دن کی مسلسل دیکھ بھال کے بعد جب اس کی طبیعت اور زخم قدرے درست ہوا تو بالآخر اس نے تیسرے دن پہلی مرتبہ اپنی زبان کھولی اور شہزادی سے اس کے بارے میں مختلف سوال کیئے۔

جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ تو انجانے میں مصر کی شہزادی ارمانوس کے ہتھے چڑھ گیا ہے تو جہاں سے ایک طرف اس بات کی خوشی بھی ہوئی کہ وہ بحفاظت شہزادی کی پناہ میں آگیا ہے دوسری طرف اس کے فرض نے اسے کچوکا لگایا کہ ذرا دھیان سے، کہیں تیرا اصل راز کھل گیا تو تیری خیر نہیں ہے اور تو مفت میں مارا جائے گا اور سپہ سالار میرے انتظار میں شہر پر حملے کا کوئی غلط منصوبہ نہ بنالیں جس سے تمام مجاہدین ہلاکت میں پڑ جائیں لیکن شہزادی کی طرف سے التفات روز بروز بڑھتا ہی چلا گیا اور وہ دونوں تنہائی میں ایک دوسرے کے دل سے آگاہی پانے لگے۔

ایک دن موقعہ پا کر جب شہزادی نے اس سے اس کے بارے میں جاننا چاہا پہلے تو قاسم ہچکچایا لیکن جب اس کے دل اور دماغ نے گواہی دی کہ شہزادی اس کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے گی بلکہ وہ اس کی محبت کی اسیر ہو کر جذباتی انداز فکر اپنا چکی ہے تو اس نے نہ صرف اپنے مسلمان ہونے کا اقرار کیا اور بہانہ بنایا کہ میں شہر سے اپنے کھلیان میں دیکھ بھال کے لئے کچھ اوزار لینے آیا تھا لیکن غلام تیر کا شکار ہو کر بے ہوش ہو گیا اور دریا میں غش آجانے کی وجہ سے گر گیا اور بعد میں جب مجھے ہوش آیا تو وہ شہزادی کے محل میں زیر علاج تھا۔

شہزادی نے اس کو پکڑنے اور محل میں لانے کا سارا حال بتایا جارجس اور اپنی چپقلش سے بھی آگاہ کیا اور کہا کہ وہ میرے محل میں محتاط انداز میں رہے کہیں راز افشاء ہونے پر اسے کوئی گزند نہ پہنچ جائے بہر حال وہ اس کی ہر لحاظ سے حفاظت کرے گی خواہ اسے اس کی خاطر کتنے بڑے طوفان سے ہی کیوں نہ ٹکرانا پڑے۔

روز روز کی ملاقاتیں رنگ لائیں اور وہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ نہ سکتے تھے ذرا سی دوری بھی انہیں پہاڑ مانند نظر آتی تھی اس دوران قاسم مختلف انداز میں بات بدل بدل کر شہزادی سے شہر، فوج، انتظامات اور دیگر قسم کی معلومات بھی حاصل کرتا رہا اور اپنے حافظے میں انہیں مرقوم کرتا رہا۔

پھر پندرہ دن کے بعد وہ دن بھی آ گیا جب اسے شہزادی سے رخصت ہونا پڑا۔

خوبرو قاسم کے سر کا زخم بھر چکا تھا اور واپس جا رہا تھا۔ اس نے شہزادی ارمانوس کے محل میں دس دن گزارے تھے۔ اس عرصہ میں اس کی اور شہزادی کی دن میں کئی بار ملاقات ہوتی۔ شہزادی کو قاسم سے کچھ ایسا تعلق خاطر ہو گیا تھا کہ جب تک وہ دن میں دو تین بار قاسم کے کمرے کا چکر نہ لگا لیتی تھی اسے چین نہ ملتا تھا۔ اب تو قاسم جا رہا تھا اس لئے شہزادی صبح سویرے ہی اس کے پاس آ گئی تھی۔

شہزادی ارمانوس اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ اس کی ماں کا پہلے ہی انتقال ہو گیا تھا۔ شاہ مقوقس باپ اور ماں دونوں کے فرائض ادا کر رہا تھا۔ وہ شہزادی کے معاملات میں بہت کم دخل دیتا تھا۔ جہاں تک شہزادی کی دوستی کا تعلق تھا تو شاہ اسے محض شناسائی سمجھ رہا تھا لیکن اس میں اس کی طمانیت کا بھی پہلو تھا۔ اس لئے کہ قاسم بہر صورت نائب گورنر جارجس سے اچھا تھا۔ شہزای کی طرح شاہ کو بھی جارجس قطعاً پسند نہ تھا لیکن جارجس کے ہاتھ میں فوجی طاقت تھی اس لئے شاہ مقوقس کو اس کا لحاظ کرنا پڑتا تھا۔ شہزادی ارمانوس جب صبح کو قاسم کے پاس آئی تھی تو خوب چہک رہی تھی۔ قاسم کے سامنے وہ روز ہی چہکتی تھی اور قہقہے لگاتی تھی لیکن جوں جوں قاسم کے جانے کا وقت قریب آ رہا تھا شہزادی کا چہرہ مرجھاتا جا رہا تھا اور اب تو اس کی آواز ہی بند ہو گئی تھی۔

''کیا ہوا شہزادی تمہیں۔ منہ سے کچھ کیوں نہیں بولتیں۔''

دس دن کی مسلسل ملاقاتوں نے قاسم کو شہزادی کے حضور میں کافی بے تکلف اور بیباک کر دیا تھا۔

شہزادی نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔

''اب کب آؤ گے۔ قاسم۔''

شہزادی نے یوں پوچھا کہ جیسے اس میں اور قاسم میں برسوں کی دوستی اور شناسائی ہو۔

''میں ابھی شہر مصر میں کچھ روز قیام کروں گا۔''

قاسم نے اسے تسلی دی۔

مگر افواہیں پھیلی ہوئی ہیں کہ مسلمان بہت جلد شہر مصر پر حملہ کرنے والے ہیں۔ لوگ دور دور کے شہروں کو بھاگے جا رہے ہیں اور تم....... شہزادی کہتے کہتے رُک گئی۔

''شہزادی!''

قاسم سانس کھینچ کر بولا۔

''شہر مصر اور شہر والے مجھے اس قدر پسند کرتے ہیں کہ میں یہیں ہمیشہ کیلئے آباد ہونا چاہتا ہوں۔''

''قاسم! اگر ایسا ہو جائے تو کیا اچھا ہو۔''

شہزادی کے چہرے پر سُرخی آ گئی۔

''تم اگر یہاں رہنے کا فیصلہ کرو تو کیا ہی اچھا ہو۔ تم اگر کوئی کاروبار کرنا چاہو تو میں اس کا بھی انتظام کروا دوں گی۔''

''مگر جارجس؟......''

قاسم نے بات کاٹی۔

''میں تو یہی کچھ چاہتی ہوں مگر یہ جارجس کب ہماری امیدیں پوری ہونے دے گا۔''

''کاش یہ کمینہ مسلمانوں کے ہاتھوں مارا جائے۔''

شہزادی نے بڑے دُکھ کے ساتھ کہا۔

''پتہ نہیں رومیوں کا مصر سے قبضہ کب اٹھے گا۔''

''رومیوں کا قبضہ اٹھے گا تو مسلمانوں کا قبضہ ہو جائے گا۔''

قاسم نے بے پروائی سے کہا۔

''کسی کا بھی قبضہ ہو لیکن یہ تو نکلیں مصر سے۔''

شہزادی نے بُرا سامنہ بنایا۔

''کیا پتہ مسلمان ان سے بدتر ہوں۔''

قاسم نے شہزادی کو کُریدا۔

''یہ تو ہو نہیں سکتا۔ مسلمان ان سے ضرور بہتر ہوں گے۔''

شہزادی گویا ہوئی۔

''یہ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟''

قاسم نے پوچھا۔

''تمہیں دیکھ کر۔''

اور شہزادی خود بخود شرما گئی۔

''ہم تمہارے رحم و کرم پر تھے شہزادی۔''

قاسم نے متانت سے جواب دیا۔

''ایسے موقعوں پر ظالم سے ظالم بھی نرم دل ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میں تمہارے احسان کی وجہ سے تمہارے سامنے خود کو نیک ظاہر کر رہا ہوں اور یہاں سے نکلتے ہی اپنا رویہ بدل ڈالوں۔''

''قاسم! تم سمجھتے ہو کہ میں حالات سے بے خبر ہوں۔''

شہزادی نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

''ایسا نہیں ہے قاسم!...... مسلمانوں کے آگے بڑھنے کی خبریں ہم تک پہنچ رہی ہیں۔فرما کے قلعہ پر قبضہ ہونے کے بعد بھی مسلمانوں نے کسی کو کوئی تکلیف نہیں دی۔نہ کسی کی عزت و آبرو پر ہاتھ ڈالا اور نہ کسی سے اس کی دولت چھینی۔بچوں، بڑوں اور عورتوں کا تو انہوں نے خاص خیال رکھا۔صرف ان کا مقابلہ کرنے والے ہی ان کے ہاتھوں مارے گئے۔فرما والوں سے کچھ ٹیکس لے کر انہیں ان کے گھروں میں رہنے کی اجازت دے دی گئی۔قلعہ چھوڑنے والوں کو اپنا سامان ساتھ لے جانے کی اجازت عام دی گئی اور جس فاتح قوم کا اپنے مفتوح کے ساتھ ایسا سلوک ہو تو اسے کون پسند نہیں کرے گا۔''

''میں تمہیں بتاتا ہوں شہزادی۔''

قاسم نے کہنا شروع کیا۔

''مسلمان جس دین وعقیدے کے پیروکار ہیں ان میں مفتوحہ علاقوں کے باسیوں کے ساتھ تو ایسا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔مسلمان میدان جنگ میں جان توڑ کر لڑتے ہیں لیکن ان کے سپہ سالار کو حکم ہوتا ہے کہ وہ ایک مسلمان کی جان بھی فضول ضائع نہ کریں ورنہ ان سے بھی جواب طلبی ہوگی۔دین اسلام ایک معمولی آدمی کو خلیفہ وقت کی غلطی پکڑنے کا حق دیتا ہے۔''

''اور شاید یہی وجہ ہے کہ مصری حدود میں داخل ہونے کے بعد مسلمانوں کے لشکر نے کسی جگہ شکست نہیں کھائی اور ان کے قدم آگے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔''

ان کی گفتگو ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک کنیز نے آکر عرض کیا کہ

''شہزادی صاحبہ! نائب رومی سردار جارجس قلعہ کے گشت پر ہے اور ہوسکتا ہے کہ وہ ادھر آجائے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

شہزادی چیخ پڑی۔

''اس نے ادھر آنے کی کوشش کی تو میرے محل کے پہریدار اس کے سامنے سینہ سپر ہوجائیں گے۔''

''شہزادی جوش میں نہ آیئے۔''

قاسم نے سمجھایا۔

''اس وقت اقتدار جارجس کے ہاتھ میں ہے اور اقتدار وہ طوفانی لہر ہے جو اپنے سامنے آنے والی ہر چیز کو توڑ دیتی ہے اور ساتھ بہالے جاتی ہے۔''

''میں اس قدر بزدل نہیں ہوں کہ اس کتے سے ڈر جاؤں۔میں اس کا مقابلہ کروں گی۔''

''شہزادی آپ کوئی عام شہری نہیں ہیں۔آپ میں اور عام عورت میں کوئی فرق ہونا چاہئے اور یہ فرق ہے احساس ذمہ داری کا اور تدبر کا۔

آپ جار جس کو طاقت کی بجائے حکمت عملی سے شکست دے سکتی ہیں۔"

اس کے بعد قاسم کھڑا ہوا اور اس نے کہا۔

"مجھے اجازت دیجئے شہزادی! اگر جار جس کی نظر مجھ پر پڑ گئی تو خوامخواہ آپ کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں گی۔"

شہزادی کی سمجھ میں قاسم کی باتیں آ گئیں اور اس نے کنیز سے کہا۔

"قاسم کو پوشیدہ طور پر گھاٹ تک پہنچایا جائے۔ یہ ہماری کشتی پر دریا پار کریں گے۔"

کنیز نے شہزادی کے حکم پر سر جھکایا۔

قاسم کنیز کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ شہزادی حسرت بھری نظروں سے اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔ یہاں تک کہ کنیز اور قاسم پُر پیچ راہداریوں میں اُوجھل ہو گئے۔ مگر ہائے ری محبت اور حالات کی گلکاریاں۔ اگر چہ وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے تھے مگر یوں معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اب بھی وہ ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہوں اور اس طرح باتیں کر رہے ہیں کہ جن کا کوئی اختتام نہیں ہے۔

قاسم اپنے خیالوں میں کہہ رہا ہے کہ

"شہزادی میں ہوش میں آ گیا ہوں لیکن تم بے ہوش ہوتی جا رہی ہو۔ ذرا نظریں اٹھا کر چاروں طرف دیکھو۔ سب کی نظریں ہم دونوں پر لگی ہوئی ہیں۔ جار جس پہلے ہی تمہارے خلاف ہے اور تمہارے اپنے بھی تمہاری مخالفت پر آمادہ ہو جائیں گے اور پھر پتہ نہیں کیا ہو گا۔"

"مگر قاسم!"

اور شہزادی کی آواز کپکپا کر رہ گئی۔

"شہزادی! دل پر قابو رکھو اور مجھ پر اعتبار رکھو۔"

"تم بس آنے کا وعدہ کرو قاسم! میں تو تمہارے بغیر مر جاؤں گی۔"

"شہزادی! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ میں تمہارے پاس ضرور آؤں گا۔ خواہ ہمارے درمیان دریا ہی کیوں نہ حائل ہو جائے میں اپنی جان کی بازی ہار کر بھی تم تک پہنچوں گا۔"

شہزادی ارمانوس نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسا نہ کہو تمہیں کیا معلوم تم میرے لیے کیا ہو۔"

کنیز قریب آئی تو شہزادی نے چونک کر پوچھا۔

"مہمان کو کشتی میں سوار کروا دیا۔"

"جی ہاں شہزادی! ملاح کو مسافر کی اہمیت سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔"

"کشتی خیریت سے پہنچ جائے گی؟"

شہزادی نے کنیز کو حسرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

شہزادی عالیہ! آپ نے مجھے حکم دیا تھا کہ جب تک کشتی روانہ نہ ہو جائے میں اسے دیکھتی رہوں۔ میں نے تمام احتیاطی تدابیر سے ملاح کو آگاہ کر دیا ہے آپ قطعاً کوئی فکر نہ کریں۔

شہزادی نے کہا۔

''جارجس پر نگاہ رکھنا۔ وہ کسی وقت بھی کوئی حرکت کر سکتا ہے۔ وہ بڑا کمینہ ہے۔''

کنیزوں کو تاکید کرنے کے بعد ارمانوس اپنے محل سے نکل کر قلعہ کے اس حصہ کی طرف چلی گئی جہاں اس وقت عام طور پر اس کا باپ شاہ مقوقس بیٹھا کرتا تھا۔ شہزادی نے شاہ مقوقس سے اب تک قاسم کے بارے میں کچھ نہ کہا تھا۔ اس نے ایک دوبار ارادہ بھی کیا تھا لیکن سرحد کی طرف سے کچھ ایسی خبریں آرہی تھیں جس کے پیش نظر شہزادی نے اس ذکر کو چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس وقت بھی شاہ مقوقس کی طرف وہ اس خیال سے جا رہی تھی کہ حالات میں اگر ذرا بھی ٹھہراؤ آیا ہے تو وہ قاسم کے متعلق کچھ گفتگو کرے گی۔

شہزادی نے شاہ کے کمرے میں قدم رکھا تھا کہ ٹھٹک کر رہ گئی۔ جارجس شاہ کے پاس سے اٹھ رہا تھا۔ اس کی نظر شہزادی پر پڑی تو فوراہی بیٹھ گیا۔ ایسی صورت میں شہزادی کا جانا مناسب نہیں تھا۔

ادھر شاہ نے شہزادی کو مخاطب کیا۔

''آؤ۔ آؤ شہزادی! ہمیں تمہارے مشورے کی ضرورت ہے۔''

''شاہ رہنے دیجئے۔ شہزادی سے کیا مشورہ کرنا۔ ان کے تو کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔''

جارجس نے ایسا بھرپور طنز کیا کہ شہزادی تلملا کر رہ گئی۔

شاہ کو بھی بہت غصہ آیا مگر وہ ضبط کر گیا اور بات ختم کرنے کیلئے بولا۔

''نہیں جارجس! ارمانوس کے بارے میں تمہارا اندازہ غلط ہے۔ کھیل کے وقت یہ نئے نئے کھیل ایجاد کرتی ہے مگر کوئی عقلمندی کا مسئلہ ہو تو اس کی عقل ایسے کام کرتی ہے کہ سننے والا دنگ رہ جاتا ہے۔''

''تو پھر ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔''

جارجس بڑے بے ڈھنگے پن سے ہنسا۔

''شہزادی سے پوچھئے کہ ہم رومیوں اور مسلمانوں میں جو مقابلہ ہوگا اس کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟''

''جارجس غلط سوال کر رہے ہیں۔''

شہزادی تڑپ کر بولی۔

''مصر رومیوں کا نہیں قبطیوں کا ملک ہے اور شہر مصر میں قبطی اپنی مادر وطن کی حفاظت کیلئے اپنی جانیں بھی لڑا دیں گے۔''

''ٹھیک ٹھیک۔ شہزادی نے ٹھیک کہا ہے۔''

شاہ نے اپنی بیٹی کی تائید کی۔

''شہر مصر کی جنگ میں مسلمانوں کے خلاف رومیوں کے شانہ بشانہ قبطیوں کا لشکر ہی ہوگا۔''

''چلئے یونہی سہی۔''

جارجس نے بات آگے بڑھائی۔

''قبطیوں کے پاس کوئی طاقت نہیں اگر ان کی طاقت تسلیم بھی کر لی جائے تو جنگ کا کیا انجام ہوگا؟''

''انجام عام طور پر وہی ہوگا جو عام طور پر قلعہ بند فوج کا ہوتا ہے''

شہزادی نے اس بیباکی سے کہا کہ جارجس اس کا منہ دیکھ کر رہ گیا۔

''شہزادی کیا کہنا چاہتی ہیں؟''

جارجس تقریباً چیخ پڑا۔

''جارجس کو غصہ کیوں آرہا ہے۔''

شہزادی نے تحمل سے کہا۔

''انہیں حقیقت کا سامنا کرنا چاہئے۔ دشمن سینکڑوں میل کا سفر کر کے ہماری سرحدوں میں داخل ہو گیا اور ہم خاموش بیٹھے تماشہ دیکھتے رہے۔ اگر دشمن کو سرحد کے باہر ہی کم از کم پوری طاقت سے روکا گیا ہوتا تو آج ہمیں اس مسئلہ پر غور کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ مسلمانوں نے فرما کا محاصرہ کیا مگر رومی گورنر کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ فرما کو کمک بھیجتا۔ فرما چیختا رہا مگر اسکندریہ یا شہر مصر کے حاکموں کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اب بلبیس گرداب میں ہے اس کا انجام بھی اچھا نظر نہیں آتا۔''

''لیکن یہ سب ہم اپنی جنگی حکمت عملی کے تحت کر رہے ہیں۔''

جارجس نے غصے سے جواب دیا۔

''ہم دشمن کو اس کے مستقر سے دور سے دور کرتے رہے ہیں تاکہ انہیں پیچھے سے کوئی مدد نہ ملے اور ہم انہیں شہر مصر میں گھیر کر ان کا شکار کھیلیں۔''

''غلط۔ بالکل غلط۔''

شہزادی کی آواز بھی اونچی ہوگئی۔

''بیت المقدس سے آنے والے مسلمانوں کے اس لشکر کو جس کے بارے میں ہر جاسوس کا بیان ہے کہ اس کی مجموعی تعداد چار ہزار سے زیادہ نہیں ہے۔ اس مختصر سے لشکر کو کہیں پر نہیں روکا گیا۔ فرما نے بڑی ہمت کی تو قلعہ بند ہو کر بیٹھ گئے اور پھر یہ قلعہ بندی کسی کام نہیں آئی۔ یہی کچھ شہر

مصر میں ہوگا۔ مسلمانوں کے آتے ہی قلعہ عین الشمس اور قلعہ قصر الشمع میں منہ چھپا کر بیٹھ جائیں گے اور دعا مانگیں گے کہ دیوتا آسمان سے ہماری مدد کریں۔ ہم دیوتاؤں کا انتظار ہی کرتے رہیں گے اور مسلمان تمام حصاروں کو توڑتے ہوئے قصر الشمع میں دندناتے پھر رہے ہوں گے۔"

"بس۔ بس شہزادی۔ بس۔ آپ نے رومیوں کو بہت ذلیل کیا ہے میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔"

جارجس آپے سے باہر ہو گیا۔

"ہم مسلمانوں کی چٹنی بنا کر رکھ دیں گے۔"

"صرف منہ سے کہنے سے ایسا نہیں ہوگا۔"

شہزادی بہت جوش میں تھی اور بے دھڑک جو منہ میں آتا تھا وہ کہتی چلی جا رہی تھی۔

"اگر تمہیں مصر کی فکر ہوتی تو تم نے مصری سرحدوں کو مضبوط کیا ہوتا۔ اگر تمہیں اس ملک کی سرزمین سے محبت ہوتی تو تم اس وقت قصر الشمع میں بیٹھے باتیں بنانے کی بجائے بلبیس کو بچانے کیلئے میدان جنگ میں کھڑے ہوتے۔ جنگیں باتوں سے نہیں تیروں اور تلواروں سے جیتی جاتی ہیں۔"

"شہزادی آپ رومی تاج کی توہین کر رہی ہیں۔ میں اس کی اطلاع اسکندریہ کو دوں گا۔"

"ٹھیک ہے تم اسکندریہ کو اطلاع دو اور میں شہنشاہ قسطنطین کو خبر بھیجوں گی کہ جس وقت مسلمان حملہ آوروں کے قدم مصر کی سرزمین کی طرف بڑھ رہے تھے تو اس وقت مصر کا فوجی گورنر اسکندریہ میں رقص و سرور کی محفلیں سجا رہا تھا اور اس کا نائب قصر الشمع میں دبکا بیٹھا مسلمانوں کا شہر مصر پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔"

شہزادی نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"شاہ آپ انہیں روکیں۔ یہ اپنی شاہانہ شخصیت کا فائدہ اٹھا رہی ہیں۔"

جارجس نے شاہ سے شکوہ کیا۔

"تم بھی تو اپنے مرتبے کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہو۔"

شاہ نے شہزادی کی حمایت جاری رکھی۔

"شہزادی نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔ اگر اس وقت شہر مصر کا لشکر تمہاری بجائے میری کمان میں ہوتا تو میں یہاں بیٹھنے کی بجائے سرحد پر موجود ہوتا۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں اور نہ ہی آپ کو میری حکمت عملی پر بھروسہ ہے۔"

جارجس نے شہزادی کے ساتھ ساتھ شاہ مقوقس پر بھی الزام لگایا۔

"تم پر اعتماد کرنے یا نہ کرنے کا مصر کے رومی لشکر پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ لشکر تمہاری کمان میں ہے اور وہ صرف اس حکم کی تعمیل کرے گا جو تمہاری زبان سے نکلے گا۔"

دراصل شاہ غصہ کی آگ ٹھنڈی کرنا چاہتا تھا۔

''آج آپ کو میری حکمت عملی پر اعتراض ہے لیکن کل جب آپ دیکھیں گے کہ وہ مسلمان دریائے نیل کے اس پار کھڑے اپنا گریبان چاک کر رہے ہوں گے تو آپ کو میری دانائی اور عقلمندی پر یقین آ جائے گا۔''

جارجس نے اس طرح کہا جیسے مسلمان دریائے نیل کے کنارے آتے ہی بے بس ہو جائیں گے۔

''تم عجیب بات کہہ رہے ہو جارجس۔''

شاہ مقوقس نے اسے بے اعتمادی سے دیکھا۔

''جب دشمن دریا کے اس کنارے تک آ جائیں گے تو اسے دریا پار کرنے سے کون روک سکے گا۔''

''دشمن کو دریا روکے گا۔ دریائے نیل کی طوفانی لہریں اس کو غرق کر دیں گی۔''

جارجس نے ایک بار پھر اس طرح ڈینگ ماری جیسے دریائے نیل اس کے باپ کے حکم کا پابند ہو۔

شاہ مقوقس چلا اٹھا۔

''جارجس! دریائے نیل اس قدر خودسر ہے کہ اس نے فرعون مصر کو بھی غرق کر دیا تھا۔ پھر وہ بھلا تمہاری کیا پرواہ کرے گا۔ تم نے نیل کے ساتھ کونسی بھلائی کی ہے۔''

''نیل کو میرا حکم ماننا پڑے گا۔''

جارجس کے منہ سے غصہ سے تھوک اڑ رہا تھا۔

''نیل تمہارا حکم کیوں مانے گا۔ وہ تمہارا ملازم نہیں، غلام نہیں، پابند نہیں ہے۔ پھر تم یہ دعویٰ کیوں کر رہے ہو۔''

''اس لئے کہ میں نے نیل کو بھینٹ دی ہے اور نیل نے میری بھینٹ قبول کر لی ہے۔''

''قربانی۔ تم نے قربانی دی ہے۔ قربانی کا یہ کون سا وقت ہے۔ نیل کو قربانی دی جا چکی ہے اور اس میں سیلاب آ چکا ہے اور پانی اتر بھی چکا ہے اور اب کسی قربانی کے دینے سے کیا ہوگا۔'' شاہ مقوقس نے دلیل پیش کی۔

''یہ جھوٹ ہے۔ میں نے آج بھی نیل کو بالکل پُرسکون دیکھا ہے۔'' شہزادی نے تائید کی۔

جارجس نے بڑی سختی سے بات کی تردید کی۔ اسے بڑا غصہ تھا مگر معلوم نہیں کیا ہوا اس کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور وہ سر جھکائے وہاں سے چپ چاپ چلا گیا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی اور پھر شاہ مقوقس نے کہا۔

''اسے منہ نہ لگایا کرو شہزادی۔ یہ موذی بھی ہے اور کمینہ بھی۔''

''بات اس نے خود ہی شروع کی تھی۔''

شہزادی ابھی تک غصہ میں بھری ہوئی تھی۔

''یہ تو ہر گھڑی میری تلاش میں رہتا ہے اور دیکھا نہیں آپ نے اچھا خاصا جا رہا تھا اور مجھے دیکھ کر بیٹھ گیا۔''

''لیکن یہ دعویٰ کیا کر رہا ہے۔ کیا نیل واقعی چڑھ رہا ہے؟''

شاہ نے تشویش ظاہر کی۔

بکواس کر رہا ہے۔ قربانی صرف ایک بار دی جاتی ہے اور دریا بھی ایک بار ہی چڑھتا ہے۔''

شہزادی کہہ تو رہی تھی مگر اس کا دل اندر سے دھک دھک کر رہا تھا۔

شاہ نے دیکھا کہ شہزادی کا غصہ ابھی تک کم نہیں ہوا تو اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

رات شہزادی نے بڑی بے چینی سے کاٹی۔ قاسم سے جدائی کا دکھ اور جار جس سے خوامخواہ کی تکرار۔ تلشا اس کے ساتھ ہی کمرے میں سوئی۔ رات کے کسی پہر شہزادی جاگ پڑی۔ تلشا پہلے ہی جاگ رہی تھی۔ شہزادی شام سے پریشان دکھائی دے رہی تھی اس لئے تلشا جاگتی رہی تھی۔

''طبیعت کیسی ہے شہزادی کی؟''

تلشا نے ادب سے پوچھا۔

''تیرا کیا خیال ہے تلشا؟''

شہزادی نے جیسے تلشا کی بات سنی ہی نہیں۔

''کس بارے میں شہزادی!''

''قاسم پھر آئے گا کہ نہیں؟''

تلشا نے آہستہ سے سانس لیا اور کہا۔

''ضرور آئے گا شہزادی!''

''کب آئے گا؟''

''بس آئے گا۔ آج ہی تو گیا ہے''

تلشا نے تسلی دی۔

''مگر آئے گا کیسے؟ دریا کے دونوں طرف پہرہ سخت ہوتا جا رہا ہے۔''

شہزادی خود ہی سوال کر رہی تھی اور خود ہی جواب دے رہی تھی۔

''آج تو وہ خیریت سے دوسری طرف پہنچ گیا ہے۔''

''تم سے کس نے کہا؟''

شہزادی نے چونک کر پوچھا۔

''میں گھاٹ پر معلوم کرنے گئی تھی۔ ملاح نے بتایا کہ اس نے قاسم کو کشتی سے اتار کر ایک گھوڑے پر سوار کرا دیا تھا۔ تا کہ وہ آسانی سے اپنی منزل پر پہنچ سکے۔''

تلشا نے واقعی گھاٹ پر جا کر معلومات حاصل کر لی تھیں۔ وہ جانتی تھی کہ شہزادی کسی بھی وقت اس سے پوچھ سکتی ہیں۔

''اچھا! وہ تو بہت ہی عقلمند نکلا۔''

''شہزادی! ہر کنیز اور غلام آپ ہی کا دم بھرتے ہیں۔ ملاح نے وہی کیا جو ایک وفادار ملازم کو کرنا چاہیے۔''

تلشا نے شہزادی کو خوش کرنے کیلئے کہا۔

''مگر آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ دوبارہ سیلاب آیا ہو۔''

''ٹھیک فرماتی ہیں شہزادی صاحبہ! ایسا کبھی نہیں ہوا۔ لیکن دریائے نیل دیوتاؤں کے بس میں ہے وہ خداوند کا حکم نہیں ٹال سکتا۔''

''لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے دیوتا ایک رومی کی بات کیوں مانیں گے۔ انہیں کیا پڑی ہے کہ وہ جارجس کے کہنے پر دریائے نیل میں دوبارہ سیلاب لے آئیں۔''

تلشا کا سوال صحیح بیٹھا تھا۔ وہ شیر ہو کر بولی۔

''جبھی تو میں کہتی ہوں کہ ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ اگر دیوتا ہم پر مہربان ہو جائیں تو ایک بار کیا دس بار سیلاب آ سکتا ہے۔''

شہزادی کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ تلشا نے ذرا رک کر کہا۔

''شہزادی! آپ آرام فرمائیے۔ زیادہ جاگنے سے طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ صبح کو جارجس کے جھوٹ کا پول کھل جائے گا۔''

شہزادی ارمانوس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا سر تکیے کے اوپر پہلے ہی ٹک چکا تھا۔

صبح کو شہزادی پہلے ہی جاگی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ سامنے نیل کی لہریں چمک رہی تھیں۔ شہزادی گھبرا کر بیٹھ گئی۔ اس نے جلدی سے تلشا کو جگایا۔ تلشا ٹیک لگائے سو رہی تھی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''کیا نیل کا پانی واقعی چڑھ رہا ہے؟''

شہزادی بار بار آنکھیں جھپکاتی اور باہر دیکھتی تھی۔

''جی شہزادی!''

تلشا کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

''یہ کیا نیل میں پانی زیادہ معلوم ہوتا ہے۔''

''ٹھیک سے دیکھو۔ تلشا!''

شہزادی پر وحشت سوار ہو گئی۔

''دیوتاؤں نے جارجس کی بات کیوں مانی؟''

''یہ دیوتاؤں کی مرضی ہے شہزادی! پتہ نہیں انہوں نے کس کی بات مانی ہے۔''

تلشا نے جارجس کے اثر کو کم کرنے کیلئے کہا۔

''ہمارا ملک اس وقت دشمن کی زد پر ہے۔ تمام لوگ سلامتی اور امن کی دعا مانگ رہے ہیں ممکن ہے کسی کی دعا لگ گئی ہو۔''

''ہاں۔ ہاں یہی بات ہے۔''

شہزادی خوش ہوگئی۔

''ہمارے ہی کسی آدمی کی دعا کا اثر ہے کہ پانی اوپر کو چڑھ رہا ہے۔ جارجس کی کیا ہستی ہے؟''

تلشا کھڑکی میں جھکی نیل کو دیکھ رہی تھی۔ بلاشبہ نیل میں طغیانی کے آثار تھے۔ شام کو اتنا پانی نہ تھا۔ بعض کشتیاں رات میں خشکی کی طرف کھینچ لی جاتی تھیں اور پانی رات کے کسی پہر کشتیوں تک پہنچ گیا تھا اور کشتیوں کے سرے لہروں سے ڈول رہے تھے۔ شہزادی گھبرا کر باہر آگئی اور تلشا بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر آگئی۔

شہزادی بالکونی پر کھڑی دریا کو گھور رہی تھی۔ پھر اسے ایک دم خیال آیا کہ دریا چڑھ گیا تو پھر اس کا محبوب ملنے کیسے آئے گا۔ سیلاب کے زمانے میں دریائے نیل میں کشتیاں چلنی بند ہو جاتی تھیں۔ ہونہہ آنے والے کو کس نے روکا ہے۔ یہ تو صرف دریا ہے۔ آنے والے تو آگ کے دریا کو بھی پار کر لیتے ہیں۔ شہزادی کے دل کو جیسے اطمینان ہوا۔ تلشا اس کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔

''کیا سوچ رہی ہیں شہزادی''

تلشا نے اسے چونکا دیا۔

''ہوں۔ ہاں۔ کچھ بھی نہیں تلشا!''

شہزادی گھبرا کر بال درست کرنے لگی۔ اس نے اب تک منہ بھی نہ دھویا تھا۔

''اس میں فکر کی کیا بات ہے۔ اگر دریا چڑھے گا تو ہمارا ہی فائدہ ہوگا۔''

تلشا نے ایک پہلو نکالا۔

''فائدہ۔ ہمارا فائدہ.....؟''

شہزادی کہتے کہتے رُک گئی۔

''جی ہاں شہزادی! اگر دشمن دریا کے اس پار آگیا تو دریا اس کا بیری ہو جائے گا اور لہریں اسے قلعہ پر حملہ نہ کرنے دیں گی۔''

تلشا نے دل کو لگتی بات نہیں کہی تھی اس لئے شہزادی کا دل نہ کھلا بلکہ اس کا دل مسوس کر رہ گیا۔

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن......''

چالاک تلشا اس کے دل کی بات فوراً سمجھ گئی۔

''وہ تو آوے ہی آوے۔ نیل کی لہریں جوانمردوں کے پیروں کی زنجیریں نہیں بن سکتیں۔ وہ نہیں آئے گا تو میں اپنی شہزادی کا پیغام لے کر دریا پار جاؤں گی۔''

''کیا سچ؟''

شہزادی کے دل کی کلی ایک دم کھل اٹھی۔

''تو کتنی اچھی ہے تلشا!''

اور شہزادی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کمرے میں واپس چلی گئی۔

''مگر یہ انہونی ہوئی ہے۔ شہزادی!''

کمرے میں پہنچ کر تلشا نے خیال ظاہر کیا۔

''ہے تو بالکل انہونی مگر جارجس کو اس کی خبر کیسے ہوئی؟''

''ہم نے اور آپ نے کل شام غور نہیں کیا تھا۔ پانی کل شام سے ہی چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔''

''ابھی معلوم ہو جاتا ہے۔ تم ملاح کو بلاؤ۔''

شہزادی نے تلشا کو ادھر بھیجا اور خود فکر میں ڈوب گئی۔

ذرا دیر کے بعد قلعہ میں شور مچ گیا اور ہر طرف دیوتاؤں کی جے جے کار پڑ گئی۔ بہت سی کنیزیں شہزادی کے کمرے میں گھس آئیں۔

''مبارک ہو شہزادی! طغیانی پھر آ گئی۔''

شاہ نے اعلان کروا دیا ہے کہ دریا کے کنارے کے لوگ دریا سے دور ہٹ جائیں۔

شہزادی سوچنے لگی کہ اسے تو اب معلوم ہوا۔ شہر والوں کو تو پہلے ہی پتہ لگ چکا ہے۔ چونکہ یہ خوشی کی بات تھی اس لئے شہزادی نے بھی مسرت کا اظہار کیا اور غریبوں میں خیرات تقسیم کی۔

دن چڑھے شاہ مقوقس کے محل میں دربار خاص لگا۔ جارجس پورے قلعے میں خوشی سے ناچتا پھر رہا تھا۔ اس نے علی الاعلان کہا تھا کہ نیل میں دوبارہ طغیانی لانے کا کارنامہ اس نے انجام دیا ہے۔ دربار خاص میں اس نے بڑی پُر جوش اور مدلل تقریر کی۔ وہ قبطیوں کی توہم پرستی اور ضعیف الاعتقادی سے اچھی طرح واقف تھا اُس نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک فرضی کہانی گڑھ لی اور اسے لہک لہک کے بیان کر رہا تھا۔ تقریر اس قدر دل پذیر تھی کہ سننے والے سُن رہے تھے اور سر دُھن رہے تھے۔ جارجس نے اپنی تقریر کا آغاز بڑے ہی پُر جوش انداز میں کیا۔ پس اس نے لوگوں کو بتایا۔

''اسے مصریوں کے خدا فتاح اور بھل دیوتا سے کوئی عقیدت نہیں تھی۔ لیکن جب اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ دریائے نیل کو عروس نیل کی قربانی دینے سے دریائے نیل اپنے کناروں سے باہر نکل کر ملک کو سیراب کرتا ہے تو اس فتاح اور بھل پر ایمان لانا پڑا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے

ان کی در پردہ پرستش شروع کر دی۔ ادھر کچھ دنوں سے عربی فوجوں کی مصر کی طرف آنے کی خبریں آنے لگیں۔ اس نے ہبل دیوتا سے دعا مانگی کہ مصر کی سرزمین کو عربی بھیڑیوں سے محفوظ رکھا جائے تو ہبل دیوتا نے اسے بشارت دی کہ اگر مصر کی چند خوبصورت لڑکیوں کو دریائے نیل کی قربانی دی جائے تو یہ مصیبت ٹل سکتی ہے اور دریا میں ایک بار پھر طغیانی آسکتی ہے۔''

شہزادی ارمانوس جس وقت شاہ مقوقس کے دربار میں پہنچی تو جارجس اس وقت اپنی تقریر کے آخری حصہ پر تھا وہ کہہ رہا تھا کہ

''میں نے آسمانی دیوتاؤں کے حکم سے دریائے نیل کو چند کنواری لڑکیوں کی قربانی دی۔ مجھے فوراً خبر ہوگئی کہ میری دی ہوئی قربانی قبول ہوگئی ہے اور اس کے ساتھ ہی دریائے نیل میں سیلاب آنا شروع ہوگیا۔ میں نے کل شام سے ہی اعلان کروادیا تھا کہ سیلاب آرہا ہے اور نیل اس قدر بھر جائے گا کہ دشمن کا لشکر اسے پار کرنے کی جرأت نہ کر سکے گا۔ میں نے یہ بات شاہ مقوقس کو بتائی تھی۔ آپ چاہیں تو شاہ سے اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں۔''

پھر اس نے شاہ مقوقس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''اے مصر کے تاجدار شاہ مقوقس! آپ فرمایئے کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ کیا کل میں نے آپ سے نہیں کہا تھا کہ نیل میں طغیانی آئے گی اور دیوتاؤں نے میری قربانی قبول کر لی ہے۔''

شاہ اگرچہ تذبذب میں گرفتار تھا لیکن جارجس کی بات رد نہ کر سکا۔ جبکہ نیل میں واقعی سیلاب آگیا تھا۔ شاہ نے اقرار کیا۔

''میں اپنے نائب کی بات کی تائید کرتا ہوں۔ انہوں نے کل کہا تھا کہ ان کی قربانی قبول ہوگئی ہے۔ دریا میں طغیانی آئے گی اور دشمن دریا پار نہیں کر سکے گا۔ اس وقت مجھے یقین نہیں آیا تھا لیکن اس وقت تو یہ حقیقت بن کر ہمارے سامنے ہے۔''

''دوستو! اب آپ کو میری بات کا یقین آگیا ہوگا۔''

جارجس نے بڑے غرور سے سر اونچا کر کے کہا۔

''اگر آپ کو شاہ کی بات کا یقین نہیں ہے تو میں اس کی گواہی پیش کر سکتا ہوں۔''

''نہیں نہیں۔ ہمیں شاہ کے بیان کی تصدیق کیلئے کسی گواہی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں شاہ کی بات کا یقین ہے۔''

ایک امیر نے غصہ سے کہا۔

''کسی دوسرے کی گواہی مانگنا ہمارے شاہ کی توہین ہے۔''

''شاہ مقوقس! تاجدار مصر! میرے لئے بھی اتنے ہی محترم ہیں جتنی آپ لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ بھلا میں شاہ کی بات کسی کم درجہ کے آدمی سے تصدیق کروانے کی جرآت کیسے کر سکتا ہوں۔ جس وقت میں نے اپنی قربانی اور نیل میں دوبارہ طغیانی آنے کی بات شاہ مقوقس سے کی تھی تو اس وقت شہزادی مصر ارمانوس بھی وہیں موجود تھیں۔ آپ چاہیں تو ان سے خود دریافت کر سکتے ہیں۔''

یہ کہہ کر جارجس کی نظریں شاہ مقوقس سے ہٹ کر شہزادی کے چہرے پر لگ گئیں۔ تمام درباریوں کی نظریں نہ چاہنے کے باوجود شہزادی کی

طرف اٹھ گئیں۔ پورے دربار کو اپنی طرف مخاطب دیکھ کر شہزادی ارمانوس پریشان ہوگئی۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ جیسے جارجس کے ساتھ سب لوگ اس سے تصدیق کے خواہشمند ہیں حالانکہ یہ ان کا محض وہم تھا۔ آخر شہزادی نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''میں تصدیق کرتی ہوں کہ جارجس نے نیل میں طغیانی آنے کی پیشگوئی کی تھی۔''

''شہزادی کو یاد ہوگا کہ میں نے اپنی قربانی کا بھی ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ دیوتاؤں نے میری قربانی قبول کر لی ہے۔'' جارجس نے دوبارہ شہزادی کو مجبور کیا کہ وہ اس کی دوسری بات کی بھی تصدیق کر دے۔

شہزادی ارمانوس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''مجھے یاد نہیں پڑتا کہ جارجس نے اس بارے میں اور کیا کہا تھا۔ لیکن وہ طغیانی کسی قربانی کی وجہ سے نہیں بلکہ دیوتاؤں کی مہربانی کی وجہ سے آئی ہے کہ خداوند فتاح نے ہمیں دشمنوں سے محفوظ رکھنے کیلئے طغیانی بھیجی ہے۔''

جارجس نے کچھ اور کہنا چاہا لیکن شہزادی نے اسے موقع نہ دیا اور دوسرے ہی سانس میں بولی۔

''تمام لوگوں کو چاہئے کہ وہ دیوتاؤں کی عبادت کریں اور بعل دیوتا کا شکریہ ادا کریں۔''

یہ کہہ کر شہزادی نے اپنی طرف سے مجلس برخاست کرنے کا اشارہ دیا۔

درباری سلام کر کر کے رخصت ہونے لگے۔ جارجس کھڑا پیچ وتاب کھا رہا تھا لیکن شہزادی یا بادشاہ نے اس سے مزید گفتگو نہ کی۔ شہزادی نے بادشاہ کو سہارا دیا اور دونوں آہستہ آہستہ دربار کے بغلی کمرے میں چلے گئے۔ جارجس کچھ دیر کھڑا سوچتا رہا پھر وہ بھی دربار سے چلا گیا۔

کمرے میں پہنچ کر شہزادی ایک چھوٹی مسہری پر اس طرح بیٹھی جیسے گر گئی ہو۔ شاہ نے فوراً کنیز سے ٹھنڈا گلاس مشروب کا منگوایا۔ اس نے ایک گلاس مشروب اپنے ہاتھ سے شہزادی کو پلایا اور دوسرا گلاس خود پیا۔ شہزادی کے سر میں درد شروع ہوگیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ دوسری طرف شاہ مقوقس، جارجس سے بیحد مرعوب نظر آتا تھا۔ شہزادی کو یہ خطرہ پیدا ہوگیا کہ کہیں جارجس نے اس کے آنے سے پہلے شاہ سے اس کے بارے میں کوئی بات نہ کی ہو اور شاہ نے اس سے مرعوب ہو کر کوئی وعدہ نہ کر لیا ہو۔

''اب کیسی طبیعت ہے میری شہزادی کی؟''

شاہ نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔''

شہزادی نے بے دلی سے جواب دیا۔

''کسی بات کی فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

شاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''دیوتا ہم پر مہربان ہیں۔''

شہزادی کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے جلدی سے پوچھا۔

''آپ کو کس طرح معلوم ہوا شاہ بابا؟''

شاہ مقوقس مسکرایا۔

''دیکھونا شہزادی! ایسے موقع پر جب دشمن سر پر چڑھا ہوا ہو اور دریائے نیل میں طغیانی آ جانا کیا یہ عجیب بات نہیں ہے۔ اسے سوائے دیوتاؤں کی مہربانی کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔''

''نیل کا چڑھنا ایک اتفاقیہ بات بھی ہو سکتی ہے۔''

شہزادی نے آہستہ سے کہا۔

''توبہ کرو شہزادی توبہ۔''

شاہ بھڑک اٹھا۔

''اس کیلئے بڑی ریاضت ہوئی ہے اور بہت بڑی قربانی دی گئی ہے تب جا کر دیوتا مانے ہیں۔''

''کس نے ریاضت کی اور کس نے قربانی دی؟''

شہزادی کی تیوریاں چڑھ گئیں۔

''یہ سب جارجس نے کیا ہے۔ بڑا گیان دھیان رکھنے والا بچہ ہے۔ تم تو اس سے یونہی خفا رہتی ہو۔ حالانکہ تمہاری تعریف کرتے ہوئے اس کی زبان گھسی جاتی ہے۔''

شاہ کے دل میں جو کچھ تھا اس نے اگل دیا۔

شہزادی سناٹے میں آ گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ جارجس نے طغیانی کی آڑ میں مقوقس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ شہزادی نے اپنے جذبات دبانے کی کوشش کی لیکن غصہ نے اسے پاگل کر دیا۔ اس کا انداز ایک دم جارحانہ ہو گیا۔

''تو آپ کو اس نے شیشے میں اتار لیا ہے۔ بابا یہ خیال کر کے میں اس شیطان کے منہ پر تھوکنے پر بھی آمادہ نہیں ہوں۔ آپ اس کا ذکر مجھ سے کبھی مت کیجئے گا۔''

''مگر شہزادی، میری پیاری بیٹی.........۔''

''بس شاہ بابا! بہت ہو چکی۔ مجھے جو کہنا تھا میں نے وہ کہہ دیا۔''

اور شہزادی یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔

یہ ٹھیک تھا کہ رات کے دوران دریائے نیل کا پانی کچھ بڑھ گیا تھا جس کے پیش نظر جارجس خود کو ایک دیوتا سمجھنے لگا تھا۔ جارجس کے دماغ میں یہ خیال اس وقت آیا جب گذشتہ دوپہر کو اسے معلوم ہوا کہ دریائے نیل میں ایک کشتی ڈوب گئی ہے۔ جس میں مع دولہا اور دلہن کے ساری بارات

سوار تھی۔ اس وقت تک تو یہ جارجس کیلئے محض ایک خبر تھی لیکن شام کے وقت محض اتفاقیہ طور پر دریا کا پانی کچھ چڑھ آیا۔ جارجس کے چالاک ذہن نے فوراً کشتی کے واقعہ کو نیل کے پانی چڑھ جانے سے جوڑ دیا۔

سب سے پہلے جارجس نے ہی یہ اندازہ لگایا کہ نیل میں پانی چڑھ رہا ہے۔ جارجس کو قبطیوں کی اس توہم پرستی کا حال معلوم تھا کہ یہ لوگ سال کے سال ایک مخصوص تاریخ کو عروس نیل کے نام سے شہر مصر کی ایک حسین دوشیزہ کی قربانی دیتے ہیں۔ بس اس نے مشہور کر دیا کہ اس نے دریائے نیل کو عروس نیل کی قربانی دی ہے۔ یہ قربانی قبول ہوگئی ہے اور دریا میں سیلاب آنا شروع ہوگیا ہے۔

چونکہ یہ اتفاقات یکجا ہو گئے تھے اس لئے شاہ مقوقس اور اس کے درباریوں کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ سیلاب جارجس کی ریاضت اور قربانی کا نتیجہ ہے۔ جارجس نے درباریوں کو یقین دلا دیا کہ دریائے نیل میں اس وقت تک طغیانی موجود رہے گی جب تک دشمن ناکام ہو کر واپس نہ چلے جائیں۔ پھر جب دشمن ناکام ہو کر واپس ہو جائیں گے تو نیل کا پانی اُتر جائے گا۔

جارجس نے اپنی چرب زبانی سے سب کو متاثر کر لیا تھا۔ لیکن صرف شہزادی ہی ایسی ہستی تھی جس نے جارجس کی باتوں کا کوئی اثر نہیں لیا تھا۔ اس نے اگرچہ جارجس کی بعض باتوں کی سر دربار تائید کر دی تھی لیکن اس کا دل اندر سے نہیں مان رہا تھا۔ اس کے اندر سے آپ ہی آپ یہ آواز اٹھتی تھی۔

''یہ سب فریب ہے۔ جارجس شیطان ہے اس سے بچ کر رہنا۔''

اس آواز نے شہزادی ارمانوس کے دل میں یہ خیال واضح کر دیا تھا کہ جارجس نے واقعی کوئی گہری چال چلی ہے۔ اس کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ شہزادی کی دونوں کنیزیں اس کی رازدار اور وفادار تھیں۔ وہ اپنے بجرے کے ملاح پر بھی اعتماد کر سکتی تھی۔ کیونکہ اس نے اس کے قاسم کو نہایت احتیاط اور خفیہ طریقہ سے دریا پار کروایا تھا۔ آخر شہزادی نے طے کیا کہ وہ اصل حقیقت معلوم کرنے کیلئے اپنے وفاداروں سے کام لے۔

سب سے پہلے اس نے تلشا اور دوسری کنیز سے گفتگو کی۔

''تلشا! کیا تجھے یقین ہے کہ نیل میں چڑھتا ہوا پانی سیلابی صورت اختیار کر لے گا۔''

شہزادی ارمانوس نے غمگین آواز میں سوال کیا۔

''شہزادی عالیہ! یہ تو ظاہر ہے کہ نیل کی سطح کچھ اونچی ہوگئی ہے۔''

تلشا نے ادب سے جواب دیا۔

''لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ دریا میں دوبارہ سیلاب آئے گا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے؟''

شہزادی نے متفکر نظروں سے دوسری کنیز کو دیکھا۔

''میں تلشا کی بات سے متفق ہوں۔ شہزادی عالیہ!''

دوسری کنیز نے کہا۔

''اگر شہر مصر میں دوبارہ سیلاب آیا تو پھر اس کا نقشہ بدل جائے گا اور دیوتا کسی ملک کا نقشہ اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک اس کی کوئی خاص وجہ نہ ہو۔''

شہزادی نے سر اٹھا کر متفکر نظروں سے کنیزوں کو دیکھا۔

''لیکن جارجس تو کہتا ہے کہ سیلاب اس لئے بھیجا گیا ہے کہ حملہ آور آسانی سے دریائے نیل پار نہ کر سکیں گے اور دریا کی طغیانی دیکھ کر واپس چلے جائیں گے۔''

''وہ جھوٹ بولتا ہے، بکواس کرتا ہے۔''

تلشا تڑپ کر بولی۔

''جارجس ہمارے دیوتاؤں کو بدنام کر رہا ہے اگر دیوتاؤں کو مصر کو بچانا ہوتا تو رومی فوجوں کو فرما میں شکست کیوں ہوتی۔''

''بالکل ٹھیک۔''

دوسری کنیز نے اس کی تائید کی۔

''نیل میں صرف ایک مرتبہ طغیانی آتی ہے مگر اس میں بھی دریا کناروں سے نکل کر زیادہ دور نہیں پھیلتا اور نہ ہی زیادہ تباہی آتی ہے۔ اگر ہر دو مہینے بعد طغیانی آنے لگے تو کاشتکاری کیسے ہو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر طرف تباہی پھیل جائے گی۔ نہروں کا نظام بگڑ جائے گا۔''

''یہ تو ٹھیک ہے لیکن پانی تو ہر صورت چڑھ رہا ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔''

شہزادی افسردگی سے بولی۔

''اگر یہ واقعی نیل کی دوسری طغیانی ہے تو پھر دو ماہ تک پانی چڑھتا رہے گا پھر دو ماہ پانی کم ہونے میں لگیں گے۔''

تلشا نے بڑی سنجیدگی سے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

''مجھے یقین ہے کہ نیل کا چڑھنا ایک اتفاق ہے اور دریا چند ہی دنوں میں اپنی پرانی سطح پر واپس آجائے گا۔''

شہزادی کوئی جواب نہ دے سکی اور دوبارہ سر جھکائے خیالوں میں گم ہوگئی۔

دوسرے کنیز نے ایک بار پھر تلشا کی تائید کی۔

''تلشا ٹھیک کہہ رہی ہے شہزادی! اگر پانی اس طرح چڑھتا رہا اور سیلاب کی کیفیت پیدا ہوگئی تو بس فائدہ ہمارا ہی ہوگا۔ ممکن ہے اس وقت تک دشمن دریا تک پہنچ جائے اور اس صورت میں اسے بھی دوسرے کنارے ٹھہر کر پانی کے اترنے کا انتظار کرنا ہوگا۔''

''تمہاری یہ سوچ غلط ہے۔''

شہزادی نے ٹوکا۔

''آنے والے مسلمان مجاہدین ہیں اور مجاہد کسی طوفان سے نہیں ڈرتے۔ ان کے قدم جس طرف اٹھتے ہیں بس آگے ہی بڑھتے جاتے

ہیں۔ جارجس اس وقت قلعہ میں بیٹھا ڈینگیں مار رہا ہے اور اپنی بزدلی کو چھپانے کیلئے طرح طرح کے بہانے تراش رہا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دریا کا پانی کچھ چڑھ گیا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ نیل کا سیلاب مسلمانوں کے قدم روک دے گا ایک خام خیال سے زیادہ نہیں ہے۔''

شہزادی نے آنکھیں بند کر لیں۔ جس کا مطلب تھا کہ اب وہ مزید گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔ تلشا اور دوسری کنیز نے یہ اشارہ پا کر شہزادی کو تنہا چھوڑ دیا۔

☆

شہر مصر ابھی ڈیڑھ منزل دور تھا کہ قاسم نے مسلم سپہ سالار عمرو بن العاص کو جا لیا۔ قاسم اور عمرو بن العاص کی ملاقات اگلی منزل پر پہنچنے سے پہلے ہوئی تھی۔ اس لئے عمرو بن العاص نے اس سے زیادہ گفتگو نہ کی تھی۔ پھر جب اگلی منزل پر پہنچ گیا تو عمرو بن العاص نے قاسم کو حکم دیا۔

''قاسم کھانے کے بعد تم مجھ سے گفتگو کرنے کیلئے آؤ گے۔ اس وقت تمہاری کارگزاریوں کی تفصیل معلوم کروں گا۔''

چنانچہ رات کے کھانے کے بعد قاسم سیدھا سپہ سالار کے خیمہ پر پہنچا۔ عمرو بن العاص اس کا انتظار کر رہے تھے۔ اطلاع ملتے ہی انہوں نے قاسم کو اندر بُلا لیا۔ عمرو بن العاص کے پاس اس وقت نائب سپہ سالار بھی بیٹھے تھے۔ قاسم کے داخل ہوتے ہی انہوں نے چاہا کہ وہ باہر چلے جائیں تا کہ جاسوس اور سپہ سالار کی گفتگو میں ان کی ذات حائل نہ ہو لیکن عمرو بن العاص نے ان کا ارادہ بھانپ لیا۔

''تم بیٹھے رہو۔''

سپہ سالار نے نائب سے کہا۔

''قاسم کو ایک اہم فرض سونپا گیا ہے۔ وہ جو کچھ بیان کرے گا اس کا جاننا اور سمجھنا تمہارے لئے بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا میرے لئے۔''

پھر سپہ سالار نے سر گھما کر قاسم کو دیکھا جو کہ سلام کر کے ابھی تک خاموش کھڑا تھا۔

''ہاں قاسم! تم بھی بیٹھ جاؤ اور اطمینان سے بیان کرو کہ تم اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوئے ہو؟''

قاسم نے ٹھہر ٹھہر کر اپنی کارگزاری بیان کرنا شروع کی۔ سپہ سالار اور نائب اس کی باتوں کو بڑے غور سے سُن رہے تھے۔ جب قاسم نے بتایا کہ وہ شہزادی ارمانوس کو دریا کی سیر کرتے دیکھنے کے شوق میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا جہاں اس کی چھوٹی سی کشتی ایک بڑی اور بے قابو کشتی سے ٹکرا گئی۔ تو سپہ سالار عمرو بن العاص چونک پڑے۔

عمرو بن العاص نے سوال کیا۔

''وہ بڑی کشتی واقعی بے قابو تھی یا اس نے جان بوجھ کر تمہاری کشتی کو ٹکر ماری تھی تا کہ تمہاری کشتی الٹ جائے اور تمہیں نقصان پہنچے؟''

''میرے خیال میں یہ محض اتفاق تھا۔''

قاسم نے بتایا۔

''بے قابو کشتی سے میری کشتی کے علاوہ اور بھی کئی کشتیاں الٹ گئی تھیں۔''

عمرو بن العاص پریشان ہو گئے۔

''تمہاری کشتی بھی الٹ گئی تھی تو پھر تم کیسے.........؟''

''میں تیرنا جانتا ہوں سالار۔''

قاسم نے کہا۔

''کشتی الٹنے پر میں نے حواس برقرار رکھے اور تیرنے کی کوشش کی لیکن سر میں چوٹ آنے کی وجہ سے میں بے ہوش ہو گیا تھا۔''

''پھر کیا ہوا؟''

عمرو بن العاص نے بڑی بے چینی سے پوچھا۔

''مجھے شہزادی ارمانوس کے ملاحوں نے بچا لیا تھا۔''

قاسم نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

''شہزادی نے مجھے پانی میں ڈبکیاں کھاتے ہوئے دیکھ کر اپنے ملاحوں کو میری مدد کیلئے بھیجا تھا۔ انہوں نے مجھے بچا کر ساحل پر پہنچا دیا۔ اس دوران میں بے ہوش رہا اور جب مجھے ہوش آیا تو مجھے بتایا گیا کہ میں شہر مصر کے قلعے قصر الشمع میں شہزادی ارمانوس کے محل میں ہوں اور شہزادی کی کنیزیں میری تیمارداری کر رہی ہیں۔''

سپہ سالار عمرو بن العاص کے متفکر چہرے پر رونق آ گئی۔

''پھر شہزادی سے بھی تمہاری ملاقات ہوئی ہو گی؟''

اس کے ساتھ ہی عمرو بن العاص مسکرانے لگے۔

قاسم نے شرما کر نظریں نیچی کر لیں۔

''جی ہاں سپہ سالار! میں شہزادی ارمانوس کے محل کے ایک کمرے میں مقیم تھا اور میرا علاج وہیں ہوتا رہا۔ صحت یاب ہونے کے بعد شہزادی نے اپنے خاص ملاح کے ذریعے مجھے دریا پار کروایا تھا۔''

یکا یک عمرو بن العاص کا چہرہ متغیر ہو گیا اور انہوں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''تو کیا تم شہر مصر سے صرف یہی خبر لے کر ہمارے پاس آئے ہو۔''

قاسم نے گھبرا کر سپہ سالار کو دیکھا اور پھر متانت سے جواب دیا۔

''سالار! آپ نے مجھے ایک اہم فرض پر مامور کیا تھا اور میں اسی سلسلہ میں حاضر ہوا ہوں۔''

عمرو بن العاص کا کھنچا ہوا چہرہ پُرسکون ہو گیا اور کہا۔

''ہاں تو مصر اور شہر مصر کے حالات تفصیل سے بیان کرو۔''

قاسم نے ناف پر ہاتھ باندھ کر اپنی مترنم آواز میں شہر مصر اور اس کے اطراف کا نقشہ اس طرح کھینچا۔

''اے سپہ سالار لشکر اسلام! مصر کی سرزمین سیر حاصل اور بار آور درختوں سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اس کا طول ایک ماہ کی مسافت اور عرض دس روز کی مسافت ہے۔ اس کے وسط سے دریائے نیل بہتا ہے جس کا خرام سحری فرح فرجام اور روانی شام مبارک انجام ہے۔ اس کے فیضان میں کبھی بہر دو ماہ کی طرح زیادتی ہو جاتی ہے اور کبھی کمی۔ جس وقت نیل چڑھتا ہے اور اس کی موجیں سر اٹھاتی ہیں تو اس وقت تمام نہریں اور چشمے لبالب بھر جاتے ہیں اور باشندوں کیلئے ایک جگہ سے دوسری جگہ تک جانا بجز کشتیوں کی مدد سے اور کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

پھر جب اس کا جوش پورا ہو جاتا ہے تو پلٹا کھاتا ہے اور تیزی کے ساتھ اُتر کر اپنی حد پر آ جاتا ہے۔ اس وقت کاشتکار اس کے فراز اور دامنوں کے نشیب میں نکل پڑتے ہیں۔ دانے بوتے اور خرمن کے آرزومند ہوتے ہیں۔ جب دانے جمے اور کھیتیاں اُگیں اور نیچے زمین کی نمی اور اوپر بارش کی تری تو ہرے بھرے کھیت لہلہانے لگتے ہیں اور زمین کی دولت اس کی شکم سے نکل کر اس کی پشت پر آ جاتی ہے۔ مصر کی شاداب سرزمین کا کیا حال بیان ہو جو ابھی گوہر سفید ہے، ابھی عنبر سیاہ اور ابھی زمرد سبز، یہ قدرت الٰہی کے کرشمے ہیں۔''

''عروس نیل کے عقیدے کے بارے میں بھی ہم نے سنا ہے۔''

سپہ سالار نے کہا۔

''بحیثیت ایک مسلمان ہم ایسی باتوں پر قطعی یقین نہیں رکھتے۔ لیکن خود ہی تو کہہ رہے ہو کہ دریائے نیل میں دوبارہ سیلاب آ گیا ہے اور کیا تم اپنی بات کی تردید کرنا چاہتے ہو۔''

قاسم کو اپنی عقل پر رونا آ گیا۔ وہ اب تک سپہ سالار کو اصل بات نہ بتا سکا تھا۔ جس کی وجہ سے طرح طرح کے سوالات اٹھ رہے تھے۔ اس نے کہا۔

''سپہ سالار یقین کیجئے کہ دریائے نیل میں سیلاب نہیں آیا بلکہ اس کا پانی اتفاقیہ طور پر کچھ بڑھ گیا ہے۔ میرے اس یقین کا ثبوت یہ ہے کہ اس افواہ کے گرم ہونے کے بعد میں ایک ہفتہ تک مسلسل مطالعہ کرتا رہا اور مجھ پر یہ عقدہ کھلا کے دریائے نیل کی سطح پہلے دن جس قدر بلند ہوئی تھی اس میں ایک ہفتہ گزرنے کے بعد بھی رتی برابر اضافہ نہیں ہوا اور یہی وہ بات ہے جسے کہنے کیلئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ افواہ لشکر اسلام کے سپاہیوں کے کانوں میں پہنچے اور ان کے دلوں میں کوئی وسوسہ پیدا ہو۔''

سپہ سالار عمرو بن العاص نے مسرت کا اظہار کیا اور قاسم کو شاباش دی۔

''میں تمہاری کارگزاری کی داد دیتا ہوں۔ تم نے بہت اچھا کیا کہ ہمیں ان باتوں سے قبل از وقت آگاہ کر دیا۔ اب تم شہر مصر واپس جاؤ اور دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھو۔ اگر کوئی خاص بات محسوس کرو تو اس کی اطلاع یہیں روانہ کر دو یا خود آؤ۔ ہم بھی تمہارے پیچھے شہر مصر پہنچ رہے ہیں۔''

☆

قاسم سپہ سالار کے حکم کے مطابق پھر مصر واپس چلا گیا۔ مگر اب اسے شہر کا نقشہ کچھ بدلا ہوا لگا۔ دریا کے دونوں کناروں پر جگہ جگہ پہرہ لگا ہوا تھا اور مشکوک لوگوں کی سختی سے تلاشی لی جاتی تھی اور بہت پوچھ گچھ ہوتی تھی۔ قاسم کا دل شہزادی سے ملنے کو بہت چاہتا تھا۔ مگر اب حالات بدل چکے تھے اور اس وقت دریا عبور کرنا تو الگ رہا دریا کے کنارے جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس لئے وہ چُپ ہو کر بیٹھا رہا۔ سرائے میں کیرات کی صرف ایک ایسی ذات تھی جسے علم تھا کہ قاسم مسلمان ہے۔ لیکن کیرات کو آج تک معلوم نہ ہو سکا تھا کہ قاسم اتنے دنوں تک شہر مصر میں کیوں ٹھہرا ہوا تھا۔ قاسم نے اسے یہ تاثر دیا تھا کہ اسے مصر اور شہر مصر سے بچپن سے ہی محبت ہے اور اس نے اپنے باپ سے مصر کی پُر اسرار سرزمین ابوالہول اور پہاڑ قامت اہراموں کے بارے میں بہت کچھ سُن رکھا تھا۔

قاسم نے مصر کے بارے میں اپنی والہانہ دلچسپی کا کچھ اس انداز سے ذکر کیا تھا کہ کیرات کو اس کی ذات سے ایک خاص تعلق پیدا ہو گیا تھا اور وہ قاسم کا گہرا دوست بن گیا تھا۔ شہر مصر میں جب مسلمانوں کی آمد کا بہت غلغلہ اٹھا تو کیرات نے قاسم کو مشورہ دیا۔

''قاسم تمہارا باہر گھومنا پھرنا تمہارے حق میں خطرناک ہو سکتا ہے۔''

قاسم خود اس سے گفتگو کرنا چاہتا تھا اس لئے موقع ملا تو فوراً جواب دیا کہ

''میرے دوست کیرات، تمہارا خیال درست ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم پر کوئی آفت آئے۔ اس لئے تم مجھ کو اجازت دو تا کہ میں کسی اور طرف نکل جاؤں۔ پھر جب یہاں کے حالات درست ہوں گے تو میں یہاں واپس آ کر یہاں کے اہرام اور دوسرے عجائبات دیکھوں گا۔''

کیرات کو شاید قاسم کی جُدائی منظور نہ تھی اس لئے اس نے کہا۔

''تم نے مجھے دوست کہا ہے اور میں بھی تمہیں دوست سمجھتا ہوں۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ تم شہر کے بگڑتے ہوئے حالات کے تحت کہیں اور چلے جاؤ۔ تمہاری حفاظت کی ذمہ داری میں لیتا ہوں لیکن تمہیں اپنی حفاظت خود بھی کرنا ہوگی۔''

''مگر میں اس پردیس میں اپنی حفاظت کس طرح کر سکتا ہوں؟''

قاسم نے گھبرا کر پوچھا۔

کیرات مسکرایا اور بولا۔

''تمہیں کسی سے جنگ نہیں کرنی ہے قاسم! بس یہ کرو کہ دن میں باہر نکلنا چھوڑ دو اور رات کو میرے کپڑے پہن کر تم جا سکتے ہو۔ تمہاری صورت پر تو نہیں لکھا کہ تم مسلمان ہو اور پھر ہم قبطیوں اور مسلمانوں کا کیا جھگڑا۔ لڑائی ہوگی تو مسلمانوں اور رومیوں میں ہوگی۔ ہمیں اس سے کیا مطلب۔ اگر رومی جیت گئے تو ہماری غلامی پر دائمی مہر لگ جائے گی اور اگر مسلمان فتحیاب ہو گئے تو ممکن ہے کہ ہمارے حالات کچھ بدل جائیں اور اناج کی لوٹ کھسوٹ ختم ہو جائے۔''

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے کہ مصر پر رومیوں کے طویل قبضہ نے اس شاداب سرزمین کے باشندوں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ دریائے

نیل کے سیلاب کی وجہ سے یہاں کثرت سے غلہ پیدا ہوتا تھا لیکن یہ تمام غلہ مصریوں کو ملنے کی بجائے روم کے بازاروں میں بکتا تھا اور مصر والے اکثر فاقے کرتے تھے۔

قاسم نے کیرات کو کوئی جواب نہ دیا۔ اس کیلئے یہی غنیمت تھا کہ کیرات ان بگڑے ہوئے حالات میں بھی اسے پناہ دیئے ہوئے تھا۔ پس وہ دن بھر سرائے کے کمرے میں چھپا رہتا تھا اور رات ہوتے ہی کپڑے بدل کر شہر کی سیر کو نکل جاتا تھا۔ قاسم کا مقصد قلعہ عین الشمس میں فوجیوں کی صحیح تعداد معلوم کرنا اور دریائے نیل کے دفاعی انتظامات کو دیکھنا تھا۔ رات کے وقت بھی دریا کے دونوں کناروں پر سخت پہرہ رہتا تھا لیکن دریا کی سیر کرنے والوں کیلئے کافی تعداد جمع ہو جاتی تھی اور پہریداروں کو کچھ لے دے کر کرائے کی کشتیاں حاصل کر لیتے تھے اور پھر رات گئے تک دریا میں کشتیوں کی دوڑ بھاگ ہوتی رہتی تھی۔ ایسے موقعوں سے قاسم بھی فائدہ اٹھاتا تھا اور کرایہ کی کشتی کے ذریعہ اکثر اس مقام تک پہنچ جاتا تھا جہاں سے وہ شہزادی کے محل سے واپس جاتے ہوئے کشتی میں سوار ہوا تھا۔ اس جگہ اگرچہ سخت پہرہ تھا لیکن قاسم کو سوائے پہریداروں کے فوج کہیں بھی نہ دکھائی دی۔ فوج کا پہرہ صرف قلعہ کی فصیل اور برجیوں پر تھا۔ گھاٹ کی طرف کھلنے والے قلعہ کے دروازہ کے اوپر کی برجیوں میں بھی فوجیوں کے سر نظر آتے تھے۔ رات کے وقت فصیل پر خوب آگ روشن کی جاتی تھی۔ پتہ نہیں یہ آگ جنگی نقطہ نظر سے جلائی جاتی تھی یا فوجی اس کی روشنی میں رنگ رلیاں مناتے تھے۔

اس زمانہ میں قاسم کے لیل و نہار بڑے بے کیف گزر رہے تھے۔ گرفتاری کے خطرے کے پیش نظر اس نے اپنے ساتھیوں کو رخصت کر دیا تھا جو پورے مصر میں بکھر گئے تھے۔ انہوں نے دور دراز کے علاقوں میں رہنا شروع کر دیا تھا اور اپنے روپ تبدیل کر لئے تھے۔ رات کو جب قاسم بھیس بدل کر نکلتا تھا تو اسے کوئی نہ کوئی ساتھی مل جاتا تھا جس کی ملاقات سے اسے بڑا اسہارا ملتا تھا۔

کچھ ہی دن گزرے تھے کہ شہر میں یہ خبر گرم ہوئی کہ مسلمانوں کا لشکر فتوحات حاصل کرتا ہوا شہر مصر کے قریب پہنچ گیا ہے اور ایک دو روز میں شہر پر حملہ ہوگا۔ اس خبر کے پھیلتے ہی شہر سنسان ہو گیا۔ لوگ گھر بار چھوڑ کر جنگلوں اور ویرانوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے یا پھر دور کے دیہاتوں میں چلے گئے تھے۔

ایک شام کیرات بہت افسردہ افسردہ قاسم کے پاس آیا اور اس کے گلے سے لگ گیا۔

''قاسم! مجھے افسوس ہے کہ اب میں تمہاری حفاظت نہیں کر سکتا۔ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ دیہات جا رہا ہوں۔ سرائے میں تم اپنی ذمہ داری پر رہ سکتے ہو۔''

قاسم نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ شہر بڑی تیزی سے خالی ہو رہا ہے۔ لوگوں پر مسلمانوں کی اس قدر دہشت طاری ہے کہ انہیں شہر میں ایک ایک لمحہ کاٹنا مشکل ہو رہا ہے۔

پس اس نے کیرات سے پوچھا۔

''تم تو کہتے تھے کہ مسلمانوں اور قبطیوں کا کوئی جھگڑا نہیں تو پھر تم یہ شہر چھوڑ کر کیوں جا رہے ہو؟''

''پہلے میرا خیال یہی تھا لیکن اب معلوم ہوا کہ مسلمان انسان نہیں ہیں۔ جن، بھوت اور دیو ہیں۔ وہ نہ تو موت سے ڈرتے ہیں اور نہ ہی

ان پر تلوار اثر کرتی ہے اور تو اور لوگ تو یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ مسلمان لشکری اپنے دشمن کو بھون کر کھا جاتے ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی کیرات کا چہرہ خوف سے سفید ہو گیا۔

"لاحول ولاقوۃ۔"

قاسم کو غصہ آ گیا۔

"کس قدر بکواس ہے یہ سب۔ کیرات مجھے دیکھو۔ کیا تم مجھے آدم خور سمجھتے ہو؟"

"نہیں نہیں تمہارا ان سے کیا مقابلہ۔ تم تو ایک سچے دوست ہو۔"

"صرف سچا ہی نہیں بلکہ میں تمہارا ایک قابل اعتماد دوست ہوں۔"

قاسم نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

"وقت آنے پر میں تمہیں دکھاؤں گا کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اسے پورا بھی کر سکتا ہوں۔"

کیرات کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ منہ پھاڑے قاسم کو دیکھ رہا تھا۔

قاسم نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

"میری بات کا یقین کرو کیرات! تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ مسلمان تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ تم ہی نہیں کسی بھی قبطی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ مسلم لشکر میں میرے بہت سے جاننے والے ہیں۔ تم بالکل کوئی فکر نہ کرو اور اگر کوئی ادھر آیا بھی تو میں اس سے بات کروں گا۔ سرائے میں جس قدر لوگ پناہ لیں گے انہیں کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔"

کیرات اسے اِک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔

"سچ بتاؤ۔ قاسم تم کون ہو؟ تمہاری باتوں سے ایسا اعتماد جھلکتا ہے جیسے تم حملہ آور لشکر کے بڑے افسر ہو۔"

قاسم نے اپنے اوپر قابو رکھا کیونکہ وہ کیرات کو فی الحال اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا تھا۔

"میرے دوست کیرات!"

آخر کار قاسم نے کہا۔

"یہ تو وقت بتائے گا کہ میں کون ہوں۔ لیکن تمہارے لئے میں قاسم اور صرف قاسم ہوں۔ جاؤ اطمینان سے بیٹھو اور جتنے لوگوں کو جی چاہے بُلا لو کیونکہ شہر مصر کی جنگ کی ہولناکیوں میں سب سے زیادہ پُر امن جگہ صرف تمہاری یہ سرائے ہو گی۔"

یہ کہتا ہوا قاسم سرائے سے نکل گیا۔ وہ اصل حالات معلوم کرنے کیلئے جلد از جلد لشکر اسلام تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن قاسم کو زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ اس کے کئی ساتھی اسے خبر دینے کیلئے سرائے کی طرف آ رہے تھے۔ قاسم انہیں لے کر سرائے میں واپس آ گیا۔ قاسم نے ساتھیوں کو بتایا کہ سپہ سالار لشکر اسلام عمرو بن العاص قلعہ پر قلعہ اور شہر پر شہر فتح کرتے ہوئے شہر مصر میں داخل ہو گئے ہیں۔

شہر حمفس کی فتح کے سلسلے میں جو لڑائیاں ہوئی ہیں ان میں تاریخی حیثیت سے بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ ایک مورخ کے مطابق مصر کے سرحدی شہر فرما میں بڑی خوفناک جنگ ہوئی تھی۔ دوسرے کے بیان کے مطابق بلبیس میں انتہائی سخت معرکہ ہوا تھا اور اسی طرح ایک مورخ کہتا ہے کہ ام دنین میں ایک ماہ تک رومیوں اور مسلمانوں میں جنگ ہوتی رہی تھی تب مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔

بہرحال اس بات پر تمام مورخ متفق ہیں کہ لشکر اسلام نے جب شہر مصر کے مشرقی حصہ میں قلعہ عین الشمس پر قبضہ کیا تو اس وقت تک ان کے پاس وہی چار ہزار سواروں کا لشکر تھا جس کے ساتھ وہ مصر جیسے عظیم اور مضبوط ملک کو فتح کرنے کیلئے نکلے تھے۔ یہاں پر یہ بات پیش نظر رہے کہ مسلمانوں کو قدم قدم پر چھوٹی بڑی لڑائیوں میں الجھنا پڑا تھا مگر اس کے باوجود ان کے جذبہ اور جوش کا یہ عالم تھا کہ وہ بغیر کمک کے دریا پار کر کے قلعہ الشمع پر حملہ کرنے کیلئے آمادہ تھے۔ گو کہ قلعہ کے اندر ایک لاکھ سے زیادہ رومی لشکر تھا اور عمرو بن العاص کے چار ہزار سواروں میں سے بہت سے پہلے ہی شہید ہو چکے تھے۔

لشکر اسلام اور رومیوں اور قبطیوں کے سب سے بڑے اور مشہور قلعہ الشمس (قصر الشمس) کے درمیان صرف دریائے نیل حائل تھا۔ وہی دریائے نیل جس نے حکم خداوندی کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام اور قوم بنی اسرائیل کو راستہ دیا تھا اور ان کا تعاقب کرنے والے فرعونی لشکر کو غرق کر دیا تھا۔ وہی نیل آج پھر مسلمانوں کا سدراہ تھا۔ دریائے نیل کا چڑھتا ہوا پانی ایک بلندی پر پہنچ کر رُک گیا تھا۔ پھر اس میں روز بروز کمی واقع ہونے لگی۔ دریا کی طوفانی موجوں میں بھی ٹھہراؤ پیدا ہو گیا تھا۔ اگر چہ بظاہر تمام آثار مسلمانوں کے حق میں تھے لیکن سپہ سالار لشکر اسلام عمرو بن العاص دریا پار کرنے میں تکلف محسوس کر رہے تھے۔ یہ وجہ نہ تھی کہ وہ رومیوں سے مرعوب ہو گئے تھے یا مسلمان لشکر تھکن محسوس کر رہا تھا۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ایک تو اسلامی لشکر کے پاس دریا پار کرنے کیلئے کشتیاں نہ تھیں اور پورے لشکر کے ساتھ گھوڑوں پر سوار ہو کر اتنے چوڑے دریا کو پار کرنا خطرے سے خالی نہ تھا۔ جبکہ عمرو بن العاص خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے وعدہ کر چکے تھے کہ وہ ایک مسلمان کو بھی بلاوجہ ضائع نہ کریں گے۔

حضرت عمرو بن العاص کا مصر کے سلسلے کا یہ آخری معرکہ تھا۔ اس کے بعد اسکندریہ بھی اگر چہ ایک زبردست قلعہ تھا جسے بحری جہازوں کے ذریعہ یورپ سے مدد ملا کرتی تھی۔ لیکن عمرو بن العاص قلعہ قصر الشمس کو اسکندریہ سے زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اس لئے انہوں نے خلیفہ کے پاس ایک قاصد بھیجا اور ان سے درخواست کی تھی۔ مصر سے مدینہ منورہ پہنچنا اور وہاں سے کمک لے کر آنے میں کافی وقت لگتا تھا۔ ادھر یہ کیفیت تھی کہ دریا پار قلعہ قصر الشمس اور اسکندریہ کے درمیان رابطہ قائم تھا اور اسکندریہ کا رومی جرنیل قصر الشمس کے جنرل جارجس کو حتی الامکان کمک پہنچا رہا تھا مگر یہ کمک اتنی نہ تھی کہ جو ضرورت کے مطابق ہو۔ اسکندریہ کے رومیوں کو معلوم تھا کہ زیریں مصر کی فتح کے بعد مسلمان اسکندریہ کا ضرور رخ کریں گے۔

عمرو بن العاص نے قاسم کو ایک بڑے دستے کے ساتھ دریائے نیل کے مشرقی ساحل کی حفاظت اور دیکھ بھال کیلئے مقرر کیا اور خود دریا سے ذرا ہٹ کر ایک اونچی جگہ اپنے لشکر کے ساتھ مقیم ہوئے تھے۔ قاسم کو کیرات کے ساتھ دوستی نبھانے کا اچھا موقعہ ہاتھ آ گیا تھا۔ اس نے کیرات سے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کر دکھایا۔ پہلی بار جب قاسم اپنے فوجی دستے کے ساتھ کیرات کی سرائے میں پہنچا تو کیرات کا رنگ فق ہو گیا تھا مگر قاسم نے

اسے جلدی تسلی دے کر مطمئن کر دیا تھا۔ قاسم اور کیرات کی روزانہ ملاقات ہوتی تھی۔ قاسم اپنے ایک دو ساتھیوں کو لے کر کیرات کے پاس پہنچ جاتا اور اسے گفتگو سے مطمئن کر دیتا تھا۔ ادھر قلعہ کے اندر کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ دریا کا پانی تیزی سے اتر رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی قلعہ قصر الشمع پر حملہ کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک شام قاسم تنہا کیرات سے ملنے گیا۔ کیرات نے اسے ایسی دھما کہ خیز خبر سنائی کہ قاسم سناٹے میں آ گیا۔ کیرات نے بڑے یقین کے ساتھ قاسم کو بتایا۔

''میرے دوست قلعہ کے گورنر نے ایک عجیب اعلان کیا ہے۔''

''اس نے پھر کوئی جھوٹ بولا ہوگا۔''

قاسم نے ہنستے ہوئے اس کی بات کاٹی۔

''آپ نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔''

کیرات نے قاسم کے ساتھ گفتگو میں تکلف پیدا کر دیا تھا اور اسے آپ جناب سے مخاطب کرتا تھا۔

''اچھا کیا جھوٹ بولا ہے جارجس نے؟''

قاسم نے دلچسپی سے پوچھا۔

''اس نے اعلان کیا ہے کہ وہ دریائے نیل کو تیسری قربانی پیش کرے گا۔''

قاسم نے زور کا قہقہہ لگایا۔

''پاگل کہیں کا۔ دوسری قربانی سے اسے کیا حاصل ہوا ہے جو وہ تیسری قربانی سے حاصل ہوگا۔''

''لیکن میرے دوست!''

کیرات نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''اس واقعہ میں وہ شہزادی ارمانوس کو عروس نیل بنا رہا ہے۔''

''ارے......؟......''

اور قاسم کے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ اس کا منہ کھل گیا اور وہ حیران نظروں سے کیرات کو دیکھنے لگا۔

''کیرات کیا تمہیں یقین ہے کہ شہزادی عروس نیل بننے پر تیار ہو جائے گی؟''

قاسم نے کیرات کے جواب کا انتظار نہیں کیا بلکہ فوراً ہی اپنے سوال کا جواب دیا کہ

''ارمانوس ایک سمجھدار شہزادی ہے وہ جارجس کے فریب میں نہیں آئے گی۔''

''شہزادی ارمانوس مجبور ہے قاسم!''

یہ آواز ایک اجنبی خاتون کی تھی جو کیرات کے کمرے میں سے جھانک رہی تھی۔

قاسم اور کیرات دونوں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ قاسم نے اسے فوری شناخت کر لیا تھا۔

''تلشا تم...... تم نے دریا کیسے پار کر لیا؟''

شہزادی ارمانوس کی رازدار کنیز تلشا دروازے سے آگے بڑھی اور قاسم کے پاس پہنچی اور جلدی جلدی کہا۔

''مسلم سردار! کل صبح شہزادی ارمانوس کو عروس نیل بنا کر کشتی میں سوار کر دیا جائے گا۔ گورنر جارج نے قلعہ والوں کو یقین دلایا ہے کہ اگر شہزادی ارمانوس کو قربان کر دیا جائے تو دریا میں زبردست طغیانی آ جائے گی اور مسلمان دریا پار نہ کر سکیں گے۔''

''یہ غلط ہے بالکل غلط تلشا!''

قاسم چیخ پڑا۔

''مسلمان تو اس وقت بھی دریا پار کر سکتے ہیں اور قلعہ پر حملہ کر سکتے ہیں لیکن وہ ایک خاص وجہ سے حملہ نہیں کر رہے ہیں۔''

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی سردار قاسم!''

تلشا نے فوراً سوال کیا۔

قاسم گھبرا گیا۔ وہ کیسے بتاتا کہ مسلمان مدینہ سے کمک آنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ ایک فوجی راز تھا جسے سوائے عمرو بن العاص اور چند خاص سرداروں کے اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ پس قاسم نے فوراً خود کو سنبھالتے ہوئے اور ٹالتے ہوئے کہا۔

''خیر چھوڑو ان باتوں کو اور یہ بتاؤ کہ شہزادی نے میرے لئے کوئی پیغام بھیجا ہے؟''

''ہاں سردار قاسم! اس لئے میں اپنی جان پر کھیل کر تمہارے پاس پہنچی ہوں۔ تمہارے سپاہیوں نے ساحل پر اترتے ہی مجھے حراست میں لے لیا تھا اور جب میں نے انہیں بتایا کہ میں سردار قاسم کیلئے شہزادی کا پیغام لائی ہوں تو وہ مجھے لے کر یہاں پہنچے ہیں۔''

☆

آتش پرست

وجیہہ سحر کے کہنہ مشق قلم سے ایک اور سنسنی خیز اور دلچسپ ناول۔ ماہرین آثار قدیمہ ایک چار ہزار سال پرانی ممی دریافت کرتے ہیں۔ جسے اس انداز میں حنوط کیا گیا تھا کہ وہ آزاد ہوتے ہی زندہ ہو جائے۔ چار ہزار سال پرانی ممی کے ہنگامے، خوف و ہراس اور قتل و غارت۔ آج کی دُنیا کو اس منحوس ممی سے کیسے چھٹکارا دلایا گیا، جاننے کے لیے پڑھیے...... **آتش پرست**

جسے جلد ہی کتاب گھر پر **ایکشن ایڈونچر مھم جوئی ناول** سیکشن میں پیش کیا جائے گا۔

عمرو بن العاص اپنے لشکر کے ساتھ دریائے نیل سے قدرے پیچھے کی جانب پڑاؤ کئے ہوئے تھے انہوں نے اپنی کوشش سے اسکندریہ کا اس طرف سے سارے علاقے سے راستہ کاٹ دیا تھا اور ہر قسم کی رسد وغیرہ بھی شہر میں پہنچنے سے روک دی گئی تھی چونکہ اسکندریہ والوں کو سمندر کے راہ سے مدد حاصل تھی اس لئے شہر میں وہ صورتحال پیدا نہ ہو سکی جس کے خواہاں حضرت عمرو بن العاص تھے۔

ادھر جب قاسم کو شہزادی کے عروس نیل بنا کر دریائے نیل کی بھینٹ کا علم کنیز تلشا سے ہوا تھا اس کی دنیا ہی اجڑ گئی ایک طرف وہ شدید کشمکش کا شکار تھا دوسری طرف وہ محبت کی زنجیر کے ہاتھوں مجبور تھا۔ بالآخر دل کڑا کر کے اس نے ساری بات عمرو بن العاص کو جا بتائی اور کنیز تلشاء کو بھی ان کے حضور پیش کر دیا جس سے انہوں نے یہ بے بہا معلومات اکٹھی کیں اور اسے دلاسا دیا کہ اس دن کے آنے سے پہلے پہلے شہزادی کو اس مصیبت سے نجات دے دی جائے گی وہ جا کر شہزادی کو حوصلہ اور ہمت دلائے کنیز جس طرح آئی تھی اسی طرح بڑی مشکل سے دریا پار کر کے محل میں پہنچی اور شہزادی کو عمرو بن العاص اور قاسم کے ساتھ ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا اور ان کی طرف سے پوری طرح یقین دہائی کروائی کہ اس وقت سے پہلے پہلے قاسم اسے کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکال کر لے جائے گا۔

اے میری پیاری دلنواز تلشا!

مجھے سچ سچ بتا کہ قاسم نے کیا کہا ہے اور اس نے میرے لئے کیا خاص پیغام دیا ہے؟ شہزادی نے محبت سے کہا۔

تلشا! میری پیاری سہیلی اور شہزادی! تلشا نے جواب دیا۔

قاسم کی حالت یہ خبر سن کر دیدنی تھی اس کا بس نہ چلتا تھا کہ وہ اڑ کر تمہارے پاس پہنچ جائے پھر بھی اس نے اپنے سپہ سالار عمرو بن العاص کے آگے ساری بات رکھی مسلمان ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے وہ ایسی خرافات کی بجائے اللہ واحدہ پر یقین کامل رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے اظہار تفکر ضرور کیا اور اپنے سالاروں سے مجلس مشاورت کی جس میں یہ سارا مسئلہ زیر بحث آیا مجھ سے بھی ساری تفصیلات پوچھی گئیں اور بالآخر یہ طے ہوا کہ وہ ایک مظلوم لڑکی کی مدد کے لئے وقت سے پہلے ضرور پہنچیں گے۔

دوسری جانب قاسم کی حالت سے اس بات کا بخوبی علم ہوتا تھا کہ وہ اپنی جان کی بازی لگا کر بھی تمہیں اس چنگل سے نکال لے جائے گا اس نے اپنے اللہ تعالیٰ کی قسم کھا کر کہا ہے کہ شہزادی کو عروس نیل نہیں بننے دے گا اور نہ ہی اسے نیل کی بھینٹ چڑھنے دے گا۔

شہزادی ارمانوس کی آنکھوں میں اس بات کو سن کر خوشی کے آنسو تیرنے لگے اور اسکے دل کو سکون ملا۔ اب اس نے بھی اپنی کنیز تلشا کے ساتھ آئندہ کی صورت حال پر راز و نیاز کرنے شروع کر دیے اور کوشش کی کہ کوئی بات بھی اس کے کمرے سے باہر نکل کر جار جس تک نہ پہنچے اور وہ خبردار نہ ہو جائے۔

مدینہ سے بھی ایک قاصد بڑا سخت مراسلہ امیر المومنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جانب سے لے کر پہنچا جس میں عمرو بن العاص سے باز پرس کے علاوہ انہیں حکم دیا گیا تھا کہ جمعہ کے روز بعد از نماز جمعہ اسکندریہ پر حملہ کیا جائے اور اسے ہر حال میں فتح کیا جائے۔

عمرو بن العاص نے اپنے سالاروں کے سامنے سارا مسئلہ رکھا اور بالآخر ایک محفوظ لیکن خطرناک منصوبہ طے پایا جس کے مطابق فوج کو تیاری کا حکم ملا۔

جمعہ کی نماز میں عمرو بن العاص نے اللہ تعالیٰ عزوجل کے حضور خشوع وخضوع سے مجاہدین کی کامیابی کے لئے دُعا مانگی جس پر اللہ تعالیٰ عزوجل نے اپنا کرم کیا اور رومی جو گزشتہ دس ماہ سے قلعہ بند ہو چکے تھے اور باہر نکل کر مقابلے کا نام ہی نہ لے رہے تھے اچانک اپنی کثیر سپاہ کے ساتھ مقابلے کے لئے باہر نکلے اور دریائے نیل کے اس طرف آن دھمکے۔

مسلمانوں نے فی الفور نعرہ تکبیر بلند کیا اور اس قدر زوردار جوابی حملہ کیا کہ رومیوں کے لئے سنبھلنا مشکل ہو گیا اور وہ جان بچا کر بھاگ نکلے ہزاروں کی تعداد میں رومی دریائے نیل میں غرق ہو گئے طے شدہ منصوبے کے مطابق اسلامی سپاہ کے بعض دستوں نے دریا کو تیزی سے عبور کیا اور قلعے کے کھلے دروازں تک مارتے کاٹتے پہنچ گئے جہاں سے رومی فوج باہر نکل رہی تھی اور باہر سے بھاگ کر واپس آنے والی فوج اندر جانے کے لئے زور لگا رہی تھی اسی کشمکش میں اسلامی سپاہ نے بھرپور حملہ کر کے قلعہ کے دروازوں پر قبضہ جما لیا اور بالآخر نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے قلعہ کے اندر داخل ہو گئے اور بھرپور جنگ کے بعد رومیوں کو مجبور کر دیا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں چونکہ شہری پہلے سے تنگ آئے ہوئے تھے اس لئے انہوں نے فوری طور پر اطاعت قبول کر لی۔

ادھر قاسم کا شہزادی ارمانوس کے لئے بہت بُرا حال تھا وہ اپنی محبت کو بچانے کے لیے رومی دستوں اور شہریوں سے بچتا بچاتا شہزادی ارمانوس کے کمرے تک جا پہنچا۔

اس کو اپنے سامنے دیکھ کر شہزادی ارمانوس جو اس وقت نیل کی بھینٹ چڑھنے کے لئے دلہنِ نیل بنی بیٹھی تھی کھل کھلا اٹھی اور فوری طور پر اپنے حصار کو توڑ کر قاسم کے سینے سے آن لگی جار جس کے مقرر کردہ جوانوں نے ان کو قتل کرنے کی کوشش کی لیکن قاسم اور اس کے ساتھیوں نے پلک جھپکنے میں ہی ان کا خاتمہ کر دیا اور یوں قاسم شہزادی ارمانوس کو لے کر اپنے پڑاؤ میں پہنچا اور اسے عمرو بن العاص سپہ سالار کے سامنے پیش کر دیا جہاں شہزادی نے اسلام قبول کر لیا اور اس کا اسلامی نام عائشہ رکھا گیا اور اس کا نکاح قاسم سے کر دیا گیا اور اس طرح بنت نیل جو عروس نیل بن رہی تھی اب عروس قاسم بن کر خوشی اور مسرت کے سمندر میں غوطے کھانے لگی۔

اسکندریہ کی فتح سے مکمل سلطنت مصر اسلامی سلطنت کے زیر آ گئی اور مصر پر اسلامی پرچم لہرانے لگا اور اس طرح یہ داستانِ محبت بھی ایک لازوال داستان بن گئی۔

ملکوتی حسن......ایک تعارف

افغانستان کے شہر ہرات سے تعلق رکھنے والی ایک الھڑ اور حسین شہزادی کی داستان جو دیکھنے میں شہزادی کم لیکن ہرنی زیادہ نظر آتی تھی جس کی مست خرام نگاہیں ہر ایک کا دل موہ لینے میں ایک لمحہ بھی نہ لگاتی تھیں جس کی رگوں میں افغان خون کے ساتھ ساتھ تاتاری خون بھی شامل تھا جن دونوں کے امتزاج نے اس کے حسن کو لازوال بنادیا تھا ہر انسان کو اس کی طرف دیکھتے ہی اس کے حسن کا دل سے شیدا و والہ ہوجاتا تھا۔

وہ جس خانوادے سے تعلق رکھتی تھی وہ افغانوں کے قبیلہ ارغون سے تعلق رکھتی تھی اس کا باپ جو والی ہرات معزالدین حسن کا چھوٹا بھائی تھا فوت ہو چکا تھا اور اس کو معزالدین حسن نے اپنی بیٹیوں کی طرح پالا پوسا تھا اس کی ماں جو کہ والی سمرقند قزغن کی بڑی بھاوج تھی جس کو قزغن نے اپنی چالاکیوں کی بناء پر اس کے شوہر کو قتل کر کے سمرقند سے بے دخل ہونے پر مجبور کر دیا تھا اور جس کو والی ہرات معزالدین حسن نے نہ صرف پناہ دی تھی بلکہ اپنے چھوٹے بھائی سے بیاہ دیا تھا جن کے بطن سے ملکوتی نے جنم لیا تھا اور وہ بے پایاں حسن کی بدولت واقعی ملکوتی کہلانے کی حقدار تھی۔

والی سمرقند اور والی ہرات میں اکثر جنگیں ہوتی رہتی تھیں اس لئے اکثر تاتاری اور افغان ایک دوسرے سے کسی نہ کسی بات پر لڑتے جھگڑتے رہتے تھے ایسے ہی پیش نظر میں اس دور کے نو ابھرتے سردار امیر تیمور کے دو سفیر والی سمرقند کی طرف سے ایک سفارت لے کر والی ہرات کے دربار میں پہنچے اور سفارت پیش کی ان دو سفیروں میں سے ایک سفیر والی ہرات کا پیغام لے کر واپس سمرقند چلا گیا جبکہ دوسرے سفیر کو بطور یرغمال بنا کر روک لیا گیا اور اس طرح عبداللہ نامی قاصد والی ہرات کے محل میں محصور ہو کر رہ گیا۔

ملکوتی جو اپنی والدہ کے منہ سے تاتاریوں کی بے پناہ تعریفیں سنا کرتی تھی۔ تاتاری دیکھنے کے شوق میں عبداللہ قاصد تک پہنچی جہاں وہ اس سولہ سالہ عبداللہ کا حسن اور معصومیت دیکھ کر اس پر اپنا دل نچھاور کر بیٹھی جبکہ تیر عشق نے دوسری جانب عبداللہ کو بھی گھائل کر دیا اور اس طرح وہ دونوں ہی ایک کشتی کے سوار بن گئے۔ چونکہ افغانوں اور تاتاریوں کی دشمنی بہت زیادہ مشہور تھی اس لئے دونوں ہی اس خطرے سے دوچار رہتے تھے کہ کہیں ان کی خفیہ ملاقاتوں کا راز افشاء نہ ہوجائے اور دونوں ہی قتل نہ کر دیے جائیں۔

ایسے میں والی سمرقند امیر قزغن کے حکم سے امیر تیمور نے ہرات پر حملہ کر دیا اور ہرات کا کافی بڑا حصہ فتح کرتا ہوا قلعہ ہرات کو اپنے محاصرے میں لے لیا ایسے میں والی ہرات معزالدین حسن کو مجبوراً اپنی اور اپنے خاندان کی جان بخشی کے لئے اس معمولی قاصد عبداللہ ک بعد از منت سماجت آسرا ڈھونڈنا پڑا اور اسی جوش میں اس نے ملکوتی کو اپنے ہاتھوں سے عبداللہ کی دلہن بنادیا اور امیر تیمور سے پناہ حاصل کر لی۔

رومانس کی ایک ایسی داستان جو اپنی ادلتی بدلتی فضاؤں میں پروان چڑھتی ہوئی بالآخر اپنے وصال کے انجام تک پہنچی عاشق اور معشوق یکجائے ہوئے دنیائے حسن نے ان پر اپنی جانیں قربان کر دیں۔

ملکوتی

ملکوتی ہرات کی شہزادی تو نہ تھی لیکن اسے شہزادیوں جیسا مقام ملا تھا۔ وہ والیٔ ہرات کے مرحوم بھائی ملک اعزاز الابن کی بیٹی تھی۔ ملکوتی باپ کی طرف سے افغان اور ماں کی جانب سے تاتاری تھی۔ ملکوتی کی ماں کی پہلی شادی تاتاریوں کے قبیلہ اوجاتی بونماتی کے سردار سے ہوئی تھی۔ شادی ہوتے ہی سردار کے چھوٹے بھائی نے بغاوت کردی تھی اور سرداری کا دعویدار ہوا تھا۔ بڑا بھائی نیک نفس اور صلح پسند تھا۔ وہ قبیلہ کی سرداری سے دست بردار ہوگیا اور نئی نویلی دلہن کو ساتھ لے کر ترک وطن کر کے ہرات میں پناہ گزیں ہوا۔ ہرات بھی اسے راس نہ آیا اور ایک ہی سال کے اندر حسین وجمیل اور گلاب جیسی بیوی کو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔

جوان جہاں عورت' خوبصورت ایسی کہ دیکھنے والا دیکھتا ہی رہ جائے۔ وہ سخت پریشان تھی کہ کہاں جائے۔ اپنا وطن چھوٹ چکا تھا۔ دیار غیر میں کس سے فریاد کرتی۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو روتی پیٹتی والیٔ ہرات کے دربار میں پہنچ گئی۔ والی ہرات ملک معزالدین نے اس کے شوہر کو پناہ دی تھی۔ اس نے اس پناہ کی لاج رکھی اور اپنے چھوٹے بھائی سے اس کی شادی کردی۔ ملکوتی اسی بھائی کی بیٹی تھی۔ کہتے ہیں کہ مصیبت ٹلنے کے لئے نہیں آتی۔ ملکوتی کی ماں شاہی خاندان کی بہو بن کر دو سال بھی نہ گزار سکی تھی کہ دوسرا شوہر بھی داغ مفارقت دے گیا۔ ملکوتی کی ماں نے ملکوتی کو سینے سے لگا کر قسم کھائی کہ اب وہ شادی نہ کرے گی جب سے وہ اب تک بیوگی کی زندگی گزار رہی تھی۔ حتیٰ کہ وہ بوڑھی ہوگئی اور ملکوتی جوانی کی حدوں میں داخل ہو چکی تھی۔

والی ہرات ملک معزالدین حسین کے درجنوں بیٹے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے بیٹی ایک بھی نہ دی تھی۔ ملک معزالدین نے ملکوتی کی شہزادیوں کی طرح پرورش کی اور وہ اسے بیٹی کی طرح چاہتا تھا۔ ملکوتی واقعی ملکوتی حسن کا نمونہ تھی۔ ہنستا چہرہ' ہر دم مسکراتی رہتی تھی۔ شوخ وشنگ' بذلہ سنج' حاضر جوابی میں تو جواب نہ رکھتی تھی۔ مسیحا مریض کا علاج کرتا ہے لیکن ملکوتی غم کا علاج تھی۔ غمزدہ سے غمزدہ اس سے باتیں کرتا تو غم بھول جاتا۔ والیٔ ہرات جس دن آزردہ خاطر ہوتا تو فوراً ملکوتی کو بلواتا۔ ملکوتی سے باتیں کرتے ہی اس کا آدھا غم دور ہو جاتا۔ ملک معزالدین حسین نے ان ماں بیٹی کو ایک الگ محل دے رکھا تھا۔ لونڈی' غلام کسی بات کی کمی نہ تھی۔

☆

والیٔ سمرقند امیر قزغن کی پوتی الجائی خاتون کی تیمور سے شادی کیا ہوئی کہ اس کے لئے ترقی کی راہیں کھل گئیں۔ بوڑھا امیر قزغن ایک جوہر شناس حاکم تھا۔ اس کی عمر لڑائیاں لڑتے گزری تھی۔ بڑے بڑے سرداروں اور بہادروں کو اس نے زیر کیا تھا۔ لڑائی کے دوران ہی اس کی ایک آنکھ ضائع ہوئی تھی۔ حکومت سمرقند کے اصل حاکم بلادِ شمال کے چغتائی منگول تھے۔ منگول خان اعظم نے اپنی طرف سے امیر قزغن کو سمرقند کا حاکم

مقرر کیا تھا لیکن خانِ اعظم کے لالچی سردار اکثر سمرقند میں لوٹ مار کرنے گھس آتے تھے۔ یہ صورت حال امیر قزغن اور دوسرے تاتاریوں کے لئے بڑی پریشان کن تھی۔

سمرقند کی حکومت کئی تاتاری سرداروں میں بٹی ہوئی تھی۔ خجند پر بایزید جلائر کی حکومت تھی۔ بلخ کا حاکم سلووز او جائی بونمائی تھا۔ شبرخان میں محمد خواجہ اپروی کی علمداری تھی۔ بدخشاں کے پہاڑوں کا سردار ختلان تھا اور ارہنگ پر کیخسرو کا قبضہ تھا۔ یہ سب بڑے جنگجو اور بہادر تاتاری سردار تھے۔ ہر سردار کے پاس دس دس سواروں کی فوج ہر وقت تیار رہتی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ ان میں اتفاق نہ تھا وہ ہر وقت ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار رہتے تھے۔ تاتاری سرداروں کے آپس کے اختلاف سے شمال کا خان اعظم خوب فائدہ اٹھاتا اور جب چاہتا کسی علاقے کو تخت و تاراج کرنا شروع کر دیتا اور دوسرے سردار تماشہ دیکھتے رہتے۔

امیر قزغن بڑا جہاندیدہ سردار تھا۔ اس نے تمام تاتاری سرداروں کو خفیہ پیغام بھیجا کہ اگر مغلوں کے آئے دن کے حملوں سے بچنا چاہتے ہو تو میرا ساتھ دو کیونکہ تاتاریوں کا متحدہ لشکر' مغلوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا ہے۔ یہ بات تاتاری سرداروں کے دماغ میں بیٹھ گئی۔ ان سب نے اپنے جھگڑے دفن کر کے امیر قزغن کو اپنا سردار اعلیٰ تسلیم کر لیا۔ امیر قزغن نے فوراً خان اعظم کے خلاف بغاوت کر دی۔

مغلوں اور تاتاریوں میں بڑی زبردست جنگ ہوئی۔ دونوں طرف کے ہزاروں آدمی کام آئے۔ تاتاری اس قدر جم کے لڑے کہ مغلوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس دوران خانِ اعظم مر گیا۔ نئے خانِ اعظم نے امیر قزغن کو صلح کا پیغام دیا اور اسے سمرقند کا خود مختار حاکم تسلیم کر لیا۔ اس طرح امیر قزغن نہ صرف سمرقند کا حاکم ہو گیا بلکہ تمام تاتاریوں نے بھی اُسے اپنا حاکم چن لیا۔ تاتاریوں میں یہ صفت تھی کہ بڑی مشکل سے کسی کو اپنا حاکم تسلیم کرتے تھے مگر جب وہ کسی کو حاکم تسلیم کر لیتے تو پھر اس کے لئے اپنی جان لڑا دیتے تھے۔

امیر قزغن کو مغربی صحرا کی طرف سے اطمینان ہوا تو اب اس کی نظر ہرات پر پڑی۔ ہرات کے حاکم معزالدین اور اس میں دیرینہ دشمنی چلی آ رہی تھی۔ دونوں میں کئی معرکے ہو چکے تھے۔ کبھی سرحدی جھڑپیں ہوتیں تو کبھی کھلے میدان میں بے مقصد مقابلہ ہوتا۔ حملہ آور کا مقصد محض تخت و تاراج ہوتا ہے۔ مخالف کے گھوڑے پکڑے جاتے۔ سامان لوٹا جاتا پھر دونوں طرف خاموشی چھا جاتی۔ ملک گیری یا دوسرے کے علاقہ پر قبضہ کرنے کا وہ تصور بھی نہ کرتے تھے ادھر لڑائی ختم ہوئی اُدھر دونوں فریق اپنے اپنے علاقوں میں واپس چلے گئے۔

پھر ایک دن ہرات کی سرحد سے ملنے والے سمرقندی علاقے کے کچھ سردار امیر قزغن کے دربار میں آئے۔ انھوں نے دربار میں بڑا واویلا مچایا۔ ان کے دوسو گھوڑے اور بہت سا سامان ہرات والے لوٹ کر لے گئے تھے۔ امیر قزغن اگر پہلے جیسا تنہا ہوتا تو شاید وہ ضبط کر لیتا اور انہیں کچھ لے دے کر رخصت کر دیتا لیکن اب یہ اس کی انا کا مسئلہ بن گیا۔ ہرات کتنا ہی مضبوط سہی لیکن امیر قزغن ہر صورت اس سے زیادہ طاقتور تھا۔

امیر قزغن نے فریادیوں کو مہمان خانے میں ٹھہرایا اور اپنے چند خاص خاص سرداروں کو مشورے کے لئے طلب کیا۔ ایک ہفتہ کے اندر سب بڑے بڑے سردار معہ تیمور کے سمرقند پہنچ گئے۔ اس اچانک طلبی پر سب ہی حیران تھے۔ سمرقند پہنچ کے انہیں اس کی بھنک تو پڑ گئی کہ والئ ہرات نے کچھ شرارت کی ہے لیکن تفصیل انہیں قزغن کی زبانی معلوم ہوئی۔

امیر قزغن نے بڑے بارعب لہجے میں اپنے سرداروں کو مخاطب کیا۔

''تم ہی نے بلد شمال کے خان اعظم کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ آج پھر انہیں للکارا گیا ہے۔ دشمن اپنی محفوظ سرحدوں اور محفوظ قلعوں پر نازاں ہے لیکن تاتاری اب پہلے جیسے کمزور نہیں۔ اب ان میں انتشار نہیں۔ وہ ایک جھنڈے تلے جمع ہو چکے ہیں۔ یہ ہمارے اتحاد اور اتفاق کی برکت ہے کہ ہم نے چنگیزی خان اعظم کو اس کی شمالی سرحدوں میں محدود کر دیا ہے۔ ہم آنکھ دکھانے والے کی آنکھ پھوڑ سکتے ہیں۔ ہاتھ اٹھانے والے کے ہاتھ توڑ سکتے ہیں۔

قزغن نے اپنی پر جوش تقریر ختم کی۔ اپنے سرداروں کے چہروں کا ایک طائرانہ جائزہ لیا اور نظریں نیچی کر کے ان کے ردعمل کا انتظار کرنے لگا۔ امیر قزغن کی اس ولولہ انگیز تقریر پر تاتاری سرداروں نے شدید ردعمل کا اظہار کیا۔

علاقہ سرپول کے سردار امیر خطر نے کھڑے ہو کر تلوار ہوا میں لہرائی اور گرج کے بولا۔

''امیر قزغن ہمیں دشمن کا نام بتائیں ہم اس کے سر کا نذرانہ امیر کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔''

بدخشاں کے سردار نے اور زیادہ سخت رویہ اختیار کیا۔ اس نے کہا۔

''ہم دشمن کا صرف سر ہی نہیں لائیں گے بلکہ اس کے علاقے کو اس طرح پامال کریں گے کہ آبادیوں کا نام ونشان تک مٹ جائے گا۔''

تیمور بھلا کیوں پیچھے رہتا۔ اس نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ امیر قزغن کا اشارہ ملک معزالدین حسین والیٔ ہرات کی طرف ہے۔ اس کے لشکری ہماری سرحدوں میں داخل ہو کر اکثر لوٹ مار کرتے رہتے ہیں اگر میرا خیال درست ہے تو مجھے اجازت دی جائے کہ میں اسے گرفتار کر کے دربار سمرقند میں لاؤں تاکہ دنیا دیکھ سکے کہ حاکم سمرقند سے گستاخی کرنے والے کا کیا انجام ہوتا ہے۔''

امیر قزغن نے اطمینان کا سانس لیا اور بولا۔

''ہاں میرے بہادر سردار! والیٔ ہرات کی حرکتیں حد سے زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ ہماری سرحدی بستیاں اس کے لشکریوں کے ظلم وستم کا نشانہ بن رہی ہیں۔''

علاقہ شبر خان کا سردار محمد خواجہ بڑا جوشیلا تھا۔ چیخ کے بولا۔

''ہرات کو تاراج کرنے کا پروانہ میرے نام لکھا جائے۔ میں ملک معزالدین کو ایسی سزا دوں گا کہ اس کی سات پشتیں یاد رکھیں گی۔''

امیر قزغن نے جواب دیا۔

''میں اپنے سرداروں کے جوش اور جذبے سے بہت خوش ہوں لیکن اب تاتاریوں نے سمرقند میں ایک مرکزی حکومت قائم کر لی ہے اس لئے حکومت کا کام حکومت کی سطح پر ہونا چاہیئے تاکہ والیٔ ہرات یہ نہ کہہ سکے کہ اس پر اچانک حملہ کیا گیا۔ ہم دشمن کو للکار کر مارنا چاہتے ہیں۔ جنگ، ہرات کی سرزمین پر ہونی چاہیئے۔

''ہم امیر قزغن کے حکم کے منتظر ہیں۔'' کئی سرداروں نے یہ جملہ بیک وقت ادا کیا۔

امیر قزغن نے اپنے تیار کردہ منصوبے سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''کئی سال پہلے ہم نے ہرات سے صلح کا معاہدہ کیا تھا۔ ہم اس معاہدہ کی پابندی کرتے ہوئے پہلے والئ ہرات سے دوسو گھوڑوں اور لوٹے ہوئے سامان کا مطالبہ کریں گے جن لوگوں کے گھوڑے اور سامان ہرات والے زبردستی لے گئے ہیں وہ سمرقند میں فریاد لے کر آئے ہیں۔ اگر والئ ہرات نے گھوڑے اور سامان واپس کر دیا اور لٹیروں کو ہمارے دربار میں گرفتار کر کے بھجوا دیا تو ہم سمجھیں گے کہ ہرات کو ہماری طاقت کا اندازہ ہے اگر اس نے انکار کیا تو پھر ہرات کا فیصلہ تلوار سے ہوگا۔''

امیر قزغن کی اس رائے سے ہر سردار نے اتفاق کیا۔ امیر نے سرداروں کو اپنے اپنے علاقوں میں جانے کی اجازت دے دی تاکہ وہ جنگ کی تیاری کر سکیں۔ پھر امیر قزغن نے تیمور سے دو معتبر آدمی طلب کئے جو اس کا پیغام ہرات لے جانے کے اہل ہوں۔ تیمور نے اپنے وفادار غلام عبداللہ اور ایک دوسرے جوان کو جس کا نام بھی عبداللہ تھا' اس خدمت کے لئے پیش کیا۔

امیر قزغن نے ان دونوں کے ذریعے والئ ہرات کو زبانی پیغام بھجوایا۔ دونوں قاصد یا سفیر ہرات جانے لگے تو امیر قزغن نے تیمور سے کہا۔

''والئ ہرات ہمارے پیغام کا جو جواب دے گا اس کا ہمیں علم ہے۔ تم کوچ کی تیاری کرو۔ ہرات کا معرکہ تم کو سر کرنا ہے۔''

اور تیمور جنگی تیاریوں میں مصروف ہو گیا۔

☆

کرن کا مقبول ترین ناول

مڑ کے آئے مول نہ جائیں

شگفتہ بھٹی

قیمت: 350

☆ ایک ایسی معصوم اور سادہ دل لڑکی کی داستان۔ جو ایک ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی جو حسن پرست ہی نہیں حسن کا سوداگر بھی تھا۔
☆ دولت اور شہرت کے نشے نے اس کے قدم ڈگمگا دیے۔ جب آنکھ کھلی تو وہ تہی داماں تھی۔
☆ خوابوں کی اس راہ گزر کی داستان جہاں قدم قدم پر آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیاں بکھری ہوئی ہیں مگر اس کے اختتام پر ایک گہری، اندھیری اور ہولناک دلدل ہے۔ جس میں معصوم اور سادہ دل لڑکیوں کی شرم و حیاء اور عصمت نایاب کے گہر گم ہو جاتے ہیں۔
☆ ''شوبزنس'' کے چمکیلے اور روپہلے راستوں کی داستان، جہاں ہر سو ''حسن'' کی آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیاں بکھری ہیں دولت اور شہرت جہاں قدم قدم پر نچھاور ہونے کو تیار رہتی ہیں۔
☆ ان بندگلیوں کی کہانی، جہاں آگے کوئی منزل ہوتی ہیں نا پھر پیچھے کوئی راستہ بچتا ہے۔

حاکم ہرات نے حکم دیا۔

''سفیروں کو پیش کیا جائے۔''

دونو جوان قلعہ ہرات کے اس کمرے میں لائے گئے جہاں ہرات کا خودسر خودمختار حاکم معزالدین حسین اپنے سرداروں کے ساتھ بڑی شان سے بیٹھا تھا۔ یہ نوجوان حکومت سمرقند کے امیر قزغن کا ایک ضروری پیغام لے کر آئے تھے۔ ان نوجوانوں کی عمریں تقریباً برابر اور صورتیں بھی ایک دوسرے سے ملتی تھیں۔ سفیروں نے حسب دستور حاکم ہرات کو کورنش (تعظیم) پیش کی اور پھر نظریں جھکا لیں۔

ملک معزالدین نے ایک سفیر سے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

''عبداللہ!'' اس نے ادب سے جواب دیا۔

پھر دوسرے سفیر سے پوچھا گیا۔

''عبداللہ'' دوسرے نے بھی یہی جواب دیا۔

والیٔ ہرات کی تیوریاں اک دم چڑھ گئیں۔ گرج کے بولا۔

''بدتمیز۔ ذلیل کتو!......تم والیٔ ہرات سے مذاق کر رہے ہو۔''

ایک عبداللہ نے کہا۔

''اے والیٔ ہرات! یہ مذاق ہرگز نہیں ہے۔ ہم دونوں عبداللہ ہیں اور حاکم سمرقند امیر قزغن کا ایک اہم پیغام لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے ہیں۔ آپ ہماری توہین نہ کیجئے۔ سفیر کی توہین سفارت بھیجنے والے کی توہین ہوا کرتی ہے اس کے نتائج خراب بھی نکل سکتے ہیں۔

والیٔ ہرات کو اور زیادہ طیش آ گیا وہ بولا:

''تم ہمیں دھمکی دے رہے ہو۔ ہم تمہارے ٹکڑے اڑا دیں گے۔ دیکھیں گے کہ تمہارا امیر ہمارا کیا بگاڑتا ہے۔''

دوسرا اسفارتکار عبداللہ جواب دینے والا تھا کہ قلعہ ہرات کا قاضی تاج الملک جو والیٔ ہرات معزالدین کے برابر بیٹھا تھا بول پڑا۔

''اے ملک ہرات کے خودمختار تاجدار! یہ دونوں سفارت کار ہیں۔ ان کا کام اپنے آقا کا پیغام پہنچانا اور جواب لے جانا ہے۔ انہیں نہ تو مذاق کرنے کا حق ہے اور نہ رعب ڈالنے کا حکم۔ ملکی اور سیاسی دستور کے مطابق سفیروں کا پیغام سننا اور اس کا جواب دینا ضروری ہے جو حاکم سفیروں کو قتل کرتے ہیں وہ اپنے ملک کو خود ہی بدنام کرتے ہیں۔''

قاضی تاج الملک ہرات کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا تھا۔ دربار میں سوائے اس کے اور کوئی اس وقت تک گفتگو نہ کر سکتا تھا جب تک ملک معزالدین اُسے خود اجازت نہ دے۔ ملک انتہائی اجڈ اور بددماغ قسم کا افغان حکمران تھا۔ مغلوں کی جہالت اور تاتاریوں کی سرکشی اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی لیکن وہ ان باتوں کے ساتھ ساتھ ایک بہت بڑا شمشیر زن اور جاہ و جلال کا حکمران تھا۔ جبھی تو وہ نہ شمال کے مغل خانِ اعظم کی

پیروی کرتا اور نہ سمرقند کے امیر قزغن کو خاطر میں لاتا تھا۔

قاضی کی باتوں کا اُس پر تھوڑا بہت تو اثر ہوا لیکن اسے غصہ آ جائے تو اس پر قابو پاتے پاتے بھی دیر لگتی تھی۔ منہ بنا کر بولا۔

''ملکی اور سیاسی دستور کا خیال تو بعد میں رکھا جائے گا پہلے یہ بتایا جائے کہ دو سفیروں کا ایک نام کیوں رکھا گیا؟''

ظاہر ہے کہ یہ انتہائی جاہلانہ سوال تھا۔ ایک نام کے کتنے ہی آدمی ہوتے ہیں۔ یہ تو محض اتفاق تھا کہ سمرقند کے دونوں سفیروں کا ایک ہی نام تھا۔ ان میں ایک عبداللہ تو امیر تیمور کا خانہ زاد غلام تھا اور دوسرا عبداللہ تیمور کے رسالہ کا ایک کم سن سوار تھا۔ جس وقت سمرقند کے حاکم امیر قزغن نے تیمور سے سفارت پہنچانے والے دو قابلِ اعتماد آدمی طلب کیے تو تیمور نے ان دونوں کو پیش کر دیا۔ تیمور کو بھی یہ سفارت پیش کرتے وقت یہ خیال نہ گزرا کہ ان دونوں کے نام، عمریں اور کسی حد تک صورتیں یکساں ملتی جلتی ہیں۔ پہلی نظر میں دونوں عبداللہ آپس میں جڑواں بھائی دکھائی دیتے تھے۔

قاضی نے دیکھا کہ ملک معزالدین کا غصہ اب بھی ٹھنڈا نہیں ہوا اور اس نے ایک اور الٹا سوال کر دیا ہے تو وہ بات کو ختم کرنے کے لئے بولا۔

''اے تاجدار! یہ ہمارے سفیر ہیں۔ ایک نام کے دو آدمیوں کو بھیجنے کی غلطی تو ان کے آقاؤں سے ہوئی ہے اس کا جواب تو وہی دے سکتے ہیں۔''

ملک معزالدین کو قاضی کے جواب سے اطمینان نہ ہوا۔ ایک سفیر سے پوچھا۔

''تیرا آقا کون ہے؟''

جس سفیر سے ملک نے سوال کیا تھا وہ تیمور کا خانہ زاد غلام عبداللہ تھا۔ اس نے بڑے فخر سے جواب دیا۔

''میرا آقا۔ شہر سبز کا سردار تیمور گورگانی ہے۔''

ملک کے جیسے آگ لگ گئی۔ بولا:

''کون تیمور؟ وہ طراغائی کا نالائق بیٹا۔ قبیلہ برلاس کا آوارہ گرد امیر قزغن کا داماد بن جانے سے اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ میں اس کی گردن مروڑ دوں گا۔''

عبداللہ اپنے آقا کی توہین نہ برداشت کر سکا۔ بگڑ کر بولا:

''والیٔ ہرات میرے آقا کی توہین کر رہے ہیں۔ میں بغیر پیغام دیئے واپس جانا چاہتا ہوں۔''

''تو واپس نہیں جا سکتا۔'' ملک دانت کٹکٹاتے ہوئے بولا۔ میں تجھے قید میں رکھوں گا۔ تیرے آقا میں ہمت ہو تو چھڑانے آئے۔''

قاضی ہرات اپنی جگہ بہت جز بز ہو رہا تھا اسے معلوم تھا کہ یہ حاکم سمرقند کے سفیر ہیں۔ ان کے ساتھ ذرا بھی زیادتی ہوئی تو امیر قزغن، ہرات کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا۔ ہرات اگرچہ افغان قبائل کی ایک مضبوط ریاست تھی لیکن امیر قزغن تمام تاتاری قبائل کا حاکم اعلیٰ تھا۔ اس سے ٹکر لینا ہرات کے لئے کسی طرح مناسب نہ تھا۔

قاضی نے ملک کو سمجھانے کی کوشش کی۔اس نے کہا۔

''اے والیٔ ہرات!ایک آزاد اور خود مختار تاجدار کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ معمولی سفیروں سے بحث کرے۔ان سے پوچھا جائے کہ وہ کس کا پیغام اور کیا پیغام لائے ہیں۔''

قاضی ہرات کا یہ حربہ کام کر گیا۔ملک معزالدین فوراً بولا۔

''قاضی صاحب آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ان ادنیٰ اور ذلیل آدمیوں سے ہمیں بحث نہیں کرنی چاہیے۔یہ تو واقعی بڑی ذلت کی بات ہے۔آپ نے ہمیں یہ پہلے ہی کیوں نہ بتایا؟''

قاضی صاحب دل میں بہت خوش ہوئے کہ چلو کسی طرح ملک معزالدین کا غصہ تو ٹھنڈا ہوا۔

وہ بولے۔:

''والیٔ ہرات کی کوئی ذلت نہیں ہوئی۔آپ نے ان سے گفتگو کر کے ان کی عزت افزائی کی ہے۔یہ آپ کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے کہ آپ نے انہیں بات کرنے کا اعزاز بخشا۔

''اچھا۔اچھا۔یہ بات ہے۔'' کہتے ہوئے ملک معزالدین نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔قہقہے کی گونج ختم ہوئی تو بولا۔

''ہاں قاضی صاحب!اب ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟''

قاضی نے جواب دیا۔:

''ان کو حکم دیجئے کہ یہ پیغام سنائیں۔اگر پیغام خط کی صورت میں ہے تو خط پیش کریں۔''

عبداللہ نے کہا۔:

''پیغام زبانی ہے اور جواب بھی زبانی مانگا گیا ہے۔یہ پیغام حاکم سمرقند امیر قزغن کی طرف سے ہے جو تمام تاتاری قبائل کا سردار اعلیٰ ہے۔جس کی سلطنت ایران سے ماوراء النہر،بخارا اور ترکستان تک پھیلی ہوئی ہے۔جسے بلادشمال کے خان اعظم نے حکومت کا پروانہ دیا ہے وہ امیر قزغن،والیٔ ہرات ملک معزالدین حسین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے۔''

والیٔ ہرات غرور سے اکڑ گیا۔بولا۔:

''امیر قزغن واقعی ایک بڑا حاکم ہے۔میں بھی اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔''

دوسرے عبداللہ نے فوراً لقمہ دیا۔

''والیٔ ہرات۔ابھی امیر قزغن کا پیغام مکمل نہیں ہوا۔''

''ہاں۔پیغام پورا سنایا جائے۔'' ملک معزالدین اور اکڑ کے بیٹھ گیا۔

پہلے عبداللہ نے کہنا شروع کیا۔

''امیر قزغن حاکم سمرقند نے ملک معزالدین حسین والئ ہرات کو مطلع کیا ہے کہ حکومت ہرات کے کچھ لٹیرے' حکومت سمرقند کی سرحد میں گھس کر دو سو گھوڑے اور کچھ سامان زبردستی لے آئے ہیں۔ اس لیے امیر سمرقند مطالبہ کرتا ہے کہ چوری کیا ہوا سامان فوراً واپس کیا جائے اور ان لٹیروں کو گرفتار کر کے سمرقند کے دربار میں بھیج دیا جائے۔''

یہ پیغام نہ تھا بلکہ کھلا الٹی میٹم تھا۔ ملک معزالدین حسین کے دربار میں بیٹھے ہوئے تمام سرداروں کے چہرے غصے سے سرخ ہو گئے۔ وہ بار بار اپنی تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھتے۔ یہ اشارہ تھا اس بات کا کہ وہ اس الٹی میٹم کا جواب تلوار سے دینا چاہتے ہیں۔ پھر بھی کسی سردار نے نیام سے تلوار نہیں نکالی۔ افغان جاہل ضرور تھے لیکن ان کے دربار کے کچھ اصول تھے جس کی وہ سختی سے پابندی کرتے تھے۔ افغان قبائل بڑی مشکل سے متحد ہوتے لیکن جب وہ متحد ہو کر کسی ایک کو اپنا حاکم تسلیم کر لیتے تو پھر اس کے سامنے دم نہ مارتے اور اس کے صحیح اور غلط حکم کی تعمیل کرنا اپنا فرض سمجھتے۔ دربار میں کوئی اس وقت تک تلوار نہ نکال سکتا تھا جب تک والئ ہرات خود تلوار نکال کر اعلانِ جنگ نہ کرتا۔

والئ ہرات ملک معزالدین حسین نے دربار میں بیٹھے ہوئے تمام سرداروں کے چہرے فرداً فرداً دیکھے۔ ملک کا چہرہ خود بھی غصہ سے تمتما رہا تھا۔ اس کے سردار بھی غصے سے کانپ رہے تھے اور ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔

والئ ہرات آہستہ آہستہ اپنے قریب رکھی ہوئی تلوار پر ہاتھ لے گیا۔ تلوار اٹھائی۔ نیام سے باہر نکالی اور پھر تلوار ہوا میں لہراتا ہوا اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ تمام سرداروں نے اس کی تقلید کی۔

ملک معزالدین سفیروں کو گھورتے ہوئے بولا:

''ہمارا جواب تلوار ہے۔ امیر قزغن سے جا کر کہہ دو کہ ملک معزالدین اُس سے کئی بار پہلے بھی نبرد آزما ہو چکا ہے۔ اسے حوصلہ ہو تو پھر مقابلہ پر آئے۔ حکومت ہرات کے افغان جوان اُسے سرحد پر موجود ملیں گے۔''

قاضی تاج الدین کو علم تھا کہ امیر قزغن اور ملک معزالدین حسین میں کئی بار معرکے ہو چکے ہیں۔ جن میں ملک معزالدین کا پلہ بھاری رہا تھا' لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب امیر قزغن محض ایک تاتاری سردار تھا اور اس کے قبضے میں صرف تھوڑا سا علاقہ تھا' اور اب تو امیر قزغن حاکم سمرقند تھا۔ تمام تاتاری سردار اسے اپنا امیر اور بادشاہ سمجھتے تھے' اس کی طاقت پہلے سے دس گنا زیادہ ہو گئی تھی۔ اگر خدانخواستہ یہ ٹکراؤ ہوا تو ہرات کو یقیناً شکست ہو گی۔

قاضی ہرات نے جنگی بخار اتارنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا۔

''تاجدار ہرات کا فیصلہ' افغان فوج کا فیصلہ ہے۔ امیر سمرقند کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک خود مختار حاکم کو چور اور چوری کا مال برآمد کرنے کا حکم دے۔ دو سو گھوڑے اور کچھ مال کے لئے جنگ کا پیغام بھیجنا اس کے لئے کسی طرح مناسب نہ تھا۔ اتنے گھوڑے تو ہرات کے ایک معمولی آدمی کے پاس بھی ہوتے ہیں۔ اگر امیر سمرقند کو گھوڑوں ہی کی ضرورت تھی تو اس نے کہلا بھیجا ہوتا۔ ہم دو سو کے بجائے چار سو گھوڑے بھیج دیتے۔''

قاضی ہرات کی باتیں ملک معزالدین بڑے غور سے سنتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ قاضی سے زیادہ عقل مند اور ذہین انسان دنیا کے پردے

میں موجود نہیں۔ اس لئے وہ قاضی کی اتنی عزت کرتا اور اسے اپنے پاس بٹھایا کرتا تھا۔ قاضی کی باتوں نے اس پر اثر کیا۔ بلکہ بہت اثر کیا۔

والیٔ ہرات نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''قاضی تم کس قدر ذہین اور عقل مند ہو! اگر تم سمرقند کے دربار میں ہوتے تو امیر قزغن محض دو سو گھوڑوں کے لئے ہم سے جنگ نہ کرتا۔ تم اسے سمجھا کے اس حماقت سے ضرور باز رکھتے۔''

قاضی ملک کی باتوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بولا:

''یہ تاجدار عادل کی کرم نوازی ہے جو ایک حقیر قاضی کو اتنی عزت دیتے ہیں۔ دو سو گھوڑوں کے لئے ہزاروں افغانوں یا تاتاریوں کا خون بہانا نہ تو امیر قزغن کے لئے مفید ہے اور نہ والیٔ ہرات کے لئے۔ اگر والیٔ ہرات پسند فرمائیں تو اس کی بہترین ترکیب یہ ہے کہ امیر قزغن کو تین سو گھوڑے بطور تحفہ ادا کر دیے جائیں تاکہ وہ شرمندہ ہو جائے اور والیٔ ہرات کی فیاضی اور اعلیٰ ظرفی کی تعریف کرے۔''

''لیکن گھوڑے واپس کرنے سے کیا امیر قزغن افغانوں کو بزدل نہ سمجھے گا۔'' ملک معزالدین نے سوال اٹھایا۔

''ہرگز نہیں والیٔ ہرات'' قاضی نے بات بنانے کی کوشش کی۔

''تحفہ بھیجنا بزدلی نہیں بلکہ اظہارِ دوستی ہے۔ اپنے طاقتور پڑوسیوں سے دوستی رکھنا عقل مندی کی دلیل ہے۔''

ملک معزالدین غصہ میں آ کر تلوار تو بلند کر چکا تھا لیکن قاضی کی باتوں میں اسے بڑا وزن محسوس ہوا۔ وہ امیر قزغن کی بڑھتی ہوئی طاقت سے خائف تھا مگر جنگ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ قاضی کی باتیں اس کے موٹے دماغ میں بیٹھ گئیں۔ اس کا غصہ جاتا رہا اور جنگ کے امڈتے ہوئے بادل چھٹ گئے۔

ملک معزالدین نے حکم دیا۔

''تین سو اعلیٰ قسم کے گھوڑے امیر قزغن کو بطور تحفہ روانہ کئے جائیں۔ ایک سفیر تحفہ لے کر سمرقند جائے دوسرا سفیر ہمارا اس وقت تک مہمان رہے جب تک سمرقند سے جواب نہیں آ جاتا۔''

والیٔ ہرات کی تلوار کے ساتھ تلوار بلند کرنے والے سرداروں میں سے بعض افغان سردار ایسے بھی تھے جو اس جنگ کے خلاف تھے لیکن دوسروں کی دیکھا دیکھی انہیں بھی تلوار بلند کرنا پڑی تھی۔ ملک کے اس فیصلے سے وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے۔ سب سے زیادہ خوشی قاضی تاج الملک کو تھی۔ اس نے اپنی فراست سے جنگ کے خطرے کو فی الحال ٹال دیا تھا۔

☆

ملکوتی کی ماں کو خبر ملی کہ والیٔ ہرات کے دربار میں دو تاتاری سفیر آئے ہیں تو وہ تڑپ اٹھی۔ جی چاہا کہ تاتاریوں سے ملے۔ کچھ اپنی کہے کچھ ان کی سنے۔ پوچھے کہ اب بلخ کا حاکم کون ہے۔ وہاں کے لوگ کیسے رہتے بستے ہیں۔ تاتاری سفیروں سے کس طرح ملا جائے۔ کوئی ترکیب سمجھ میں نہ آئی۔

اس ادھیڑ بن میں تھی کہ اسے ملکوتی کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی تاتاریوں سے ملنے کی ایک ترکیب بھی سوجھی۔ اس نے ملکوتی کو آواز دی اور تیرہ چودہ سال کی الھڑ ملکوتی مسکراتی ہوئی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

ماں نے بیٹی کو پاس بٹھایا۔ اس کا ماتھا چوما پھر بولی۔:

''ملکوتی تو نے کبھی تاتاری دیکھے ہیں؟''

''نہیں امی!!'' اور ملکوتی نے ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''میں نے تو کبھی ہرات سے باہر قدم ہی نہیں رکھا۔ جب آپ ملک تاتار کا ذکر کرتی ہیں تو مجھے سب کچھ ایک خواب سا لگتا ہے۔''

''تو تاتاریوں کو دیکھے گی۔'' ماں نے بیٹی کو ٹٹولا۔

''ضرور دیکھوں گی امی!...... بھلا تاتاری کیسے ہوتے ہیں۔'' اور ملکوتی کے دل میں تاتاریوں کو دیکھنے کے شوق نے انگڑائی لی۔

''بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ افغانوں سے زیادہ خوبصورت''

''کہاں ہیں وہ۔ امی میں انھیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی''

ملکوتی سوال کر کے بڑی بے چینی سے ماں کے جواب کا انتظار کرنے لگی۔

اس کی ماں کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کی سوچ ہرات سے نکل کر بلخ کے کوچہ و باغات میں گردش کر رہی تھی۔

ملکوتی سے زیادہ انتظار نہ ہو سکا۔ بولی۔ ''امی آپ بھی تو ان سے مل کر خوش ہوں گی۔ آپ تو تاتاری ہیں۔''

ماں نے ایک سرد آہ بھری اور کہا۔:

''ہاں بیٹی۔ میں تاتاری تھی۔ وہ ایک خواب تھا جو ادھورا رہ گیا۔''

''مجھے ملاؤ نا امی تاتاریوں سے۔'' ملکوتی نے ضد کی۔

وطن کی یاد آنسو بن کے ملکوتی کی ماں کی آنکھوں سے چھلک پڑی۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

''والیٔ ہرات اجازت دے تو ہم تاتاریوں سے مل سکتے ہیں۔ دربار میں دو تاتاری سفیر سمرقند سے آئے ہوئے ہیں۔

ملکوتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ چٹکی بجاتے ہوئے بولی۔ ''والیٔ ہرات سے ابھی اجازت لے کے آتی ہوں۔''

اور وہ ملک معزالدین حسین کے محل میں جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

ماں نے کہا:

''سن بیٹی!...... اگر ملک اجازت دے دیں تو تاتاریوں کی دعوت کی بھی اجازت مانگ لینا۔ میں انھیں تاتاری کھانے پکا کر کھلاؤں گی۔''

''اچھا'' ملکوتی نے کہا اور پھر مٹکتی، اٹھلاتی ہوئی چلی گئی۔

ملکوتی محل میں پہنچی تو دیکھا کہ ملک معزالدین حسین کھانا کھا رہے ہیں۔ وہ ہنستی ہوئی قریب جا کر بیٹھ گئی۔ کئی شہزادے ملک کے ساتھ

کھانے میں مشغول تھے۔ انہوں نے نظر اٹھا کر بھی ملکوتی کو نہیں دیکھا۔ سب ہی ملکوتی سے جلتے تھے۔ ملک معزالدین کی تمام تر نوازشیں اور مہربانیاں ملکوتی پر تھیں۔ شہزادوں کو تو جلنا ہی تھا۔ باپ اپنے بیٹوں کو چھوڑ کر بھتیجی پر مہربان ہو تو انہیں کوفت ہونا لازمی تھا۔

ملکوتی کھانے میں شریک ہوگئی۔ کھاتے ہوئے رک کر بولی۔

''سمرقند کے تاتاری آئے ہوئے ہیں؟''

''ہاں۔ تمہیں کیا تاتاریوں کا اچار ڈالنا ہے۔'' ملک نے ہاتھ روکتے ہوئے کہا اور اس زور کا قہقہہ لگایا کہ اسے اچھو ہوگیا۔

ملکوتی پہاڑی بکری کی ٹانگ چھوڑتے ہوئے بولی۔

''میں نے تاتاری کبھی نہیں دیکھے۔''

''ہوں۔ تو ان سے ملنا چاہتی ہے۔'' اور ملک معزالدین نے اس کے ہاتھ سے ٹانگ چھین لی۔

ملکوتی پٹ سے بولی۔:

''ہاں!......اگر آپ اجازت دے دیں۔''

''تجھے کون روک سکتا ہے ملکوتی! تُو تو میری بیٹی ہے۔''

پھر کچھ رک کے پوچھا۔:

''لیکن ایک بات سچ سچ بتانا ہوگی؟''

''آپ سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔'' ملکوتی نے ایک نظر شہزادے پر ڈالی جو اُسے نفرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

''تو یہ بتا۔ تاتاریوں سے تو ملنا چاہتی ہے یا یہ تیری ماں کی خواہش ہے۔'' ملک نے تحقیق کی۔

ملکوتی گڑبڑا گئی۔ جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ پھر ہنس کے بولی

''میں یہ نہیں بتاؤں گی۔''

''اب بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔ میں جانتا ہوں تیری ماں تاتاری ہے۔'' معزالدین نے ٹانگ کی ہڈی بس یونہی اچھال دی۔ ہڈی کھڑکی سے ٹکرائی اور باہر جاگری۔

افغان ہوں یا مغل، عرب قبائل ہوں یا تاتاری۔ وحشیانہ جبلت سب میں قدر مشترک تھی۔ بلادِ شمال کا چنگیزی شہزادہ تغلق تمور خاں، آج بھی نمدے پر بیٹھتا اور سفید گھوڑی کا دودھ پیتا تھا۔ افغان اور تاتاری قبائل اسلام قبول کر چکے تھے مگر ان کا وحشی پن کم نہ ہوا تھا۔ بڑے بڑے محلوں میں رہتے مگر محل کے کھڑکی دروازے روز ٹوٹتے اور روز بنائے جاتے تھے۔

ملکوتی ہاتھ چاٹتے ہوئے بولی۔:

''میں اُن کی دعوت کروں گی۔''

''یہ بات بھی تیری ماں نے کہی ہوگی۔'' ملک معزالدین نے اس کی دوسری چوری پکڑی۔

ملکوتی کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

ملکوتی ماں کے پاس پہنچ کے اپنی اور ملک معزالدین حسین کی باتیں بتارہی تھی کہ ایک کنیز ہانپتی کانپتی اس کے پاس آئی۔ اس کی حالت دیکھ کر دونوں گھبرا گئیں۔

کنیز سانس روکتے ہوئے بولی۔

شہزادی ایک جوان' بڑا خوبصورت' کہیں کا شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔

''فراجی! کیا بکواس کررہی ہے۔'' ملکوتی کی ماں ڈپٹ کے بولی۔

فراجی سنبھل گئی۔ سر جھکا کے بولی۔

''ملک حضور نے کسی کو بھیجا ہے دعوت کھانے۔''

ملکوتی کی ماں کو غصہ آ گیا۔ چیخ کے بولی۔

'فراجی تیرا دماغ تو ٹھکانے ہے۔ کیسی دعوت؟...... کس کو بھیجا ہے ملک حضور نے......؟''

ملکوتی بات کی تہہ کو پہنچ گئی۔ مسکرائی اور بولی۔

''امی!!...... ناراض نہ ہوں۔ ملک حضور نے تاتاری سفیروں کو بھیجا ہوگا۔ میں نے دعوت کی اجازت بھی لے لی تھی۔ میں دیکھتی ہوں جا کے۔''

ملکوتی دروازے کی طرف چلی تو ماں نے کہا:

''تاتاری سفیر ہوں تو ذرا عزت سے لائیو ان کو۔ مذاق نہ اڑانے لگنا ان کا۔''

ملکوتی دروازے کے باہر آ گئی۔ ایک شکیل' دراز قامت جوان نظر آیا۔ سولہ سترہ سال سے زیادہ عمر نہ ہوگی۔ مسیں ابھی بھیگ رہی تھیں۔ داڑھی میں صرف دو چار بال تھے۔ دونوں کی نظریں ملیں اور ملی رہ گئیں۔ پتہ نہیں وہ ایک دوسرے کو کن نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ بس دیکھے چلے جارہے تھے۔

فراجی کنیز' ملکوتی کے پیچھے پیچھے باہر آ گئی تھی۔ اس نے دونوں کو اس قدر انہماک سے ایک دوسرے میں گم پایا تو کنکھار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔ ملکوتی گڑبڑا گئی۔ فراجی مسکرانے لگی۔

ملکوتی نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''شاید تم تاتاری سفیر ہو''

''جی...................اور شاید آپ کوئی شہزادی ہیں۔'' نوجوان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''دوسرا سفیر کیوں نہیں آیا؟'' ملکوتی کو اس کے اکیلے آنے پر قدرے تعجب ہوا۔

شہزادی نے نوجوان کو جواب دینے کی بجائے دوسرا سوال کر دیا۔ نوجوان کچھ پریشان ہوگیا۔ اس کو خیال ہوا کہ اس کا سوال شاید شہزادی کو ناگوار گزرا ہے۔ اس لئے سنبھل کے بولا۔

''میرے ساتھی عبداللہ کو والئ ہرات نے سمرقند بھیجا ہے۔ میں تنہا رہ گیا ہوں۔''

''تمہیں لوگ کس نام سے پکارتے ہیں۔'' ملکوتی نے بہت مہذب انداز میں پوچھا۔

''عبداللہ............'' اس نے مختصر سا جواب دیا۔

شہزادی کو زور کی ہنسی آئی۔ وہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔:

''جو تاتاری جوان ایک لڑکی کو دیکھ کر اپنے حواس کھو بیٹھے وہ بھلا میدان جنگ میں کس طرح لڑتا ہوگا؟''

عبداللہ سمجھ تو کچھ نہ سکا لیکن اسے اس گہرے طنز پر غصہ آ گیا۔ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''اگر آپ کا اشارہ میری طرف ہے تو یقین کیجئے کہ میں بالکل حواس میں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''

''میں نے تمہارا نام پوچھا تھا نوجوان۔'' ملکوتی نے چڑ کے کہا۔

''آپ نے نام پوچھا۔ میں نے بتا دیا۔''

''کیا نام بتایا تھا تم نے۔'' ملکوتی کو غصہ آ گیا۔

''عبداللہ۔ یہی نام میں نے پہلے بھی بتایا تھا۔'' عبداللہ بھی ذرا تن گیا۔

''تمہارا جو ساتھی سمرقند گیا ہے۔ اس کا نام کیا ہے؟'' ملکوتی نے اپنی طرف سے تاتاری جوان کو لاجواب کرنے کی کوشش کی۔

عبداللہ فوراً سمجھ گیا کہ سب ناموں کی گڑبڑ ہے۔ ہنس کے بولا۔

''میں سمجھ گیا۔ درباروالی غلط فہمی آپ کو بھی ہوئی۔ یہ غلط فہمی بڑی حسین اور دلچسپ ہے۔ میرا جو ساتھی سمرقند گیا ہے اس کا نام عبداللہ ہے اور عجیب اتفاق ہے کہ میرا نام بھی عبداللہ ہے۔ والئ ہرات کے دربار میں بھی اس پر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ آپ کے سامنے بھی یہی گڑبڑ ہوئی۔ بہر صورت یہ غلطی میری تھی۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔''

ملکوتی اور فراجی بھی اس انکشاف پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکیں۔

ملکوتی نے ہنس کے کہا۔

''غلطی میری بھی تھی۔ میں بھی اس بات کو سمجھ نہ سکی۔ تمہیں پہچاننے میں تو لوگوں کو بڑی دقت ہوتی ہوگی؟''

عبداللہ نے شہزادی کو کھل کر بات کرتے دیکھا تو اسے حوصلہ ہوا۔

وہ بولا۔:

''ہم دونوں کا نام تو ایک ہے لیکن ہم میں ایک بڑا فرق بھی ہے، جس کی وجہ سے ہم فوراً پہچان لئے جاتے ہیں۔''

''وہ کیا فرق ہے؟'' ملکوتی نے دلچسپی سے پوچھا۔

''سمرقند جانے والے عبداللہ کی شادی ہو چکی ہے اور میں ابھی..................'' اور کہتے کہتے عبداللہ نے نظریں نیچی کر لیں۔

شوخ وشنگ ملکوتی کی کنیز فراجی بھی بڑی زبان دراز تھی۔ وہ فوراً بولی۔

''اے ہے۔ تم تو لڑکیوں کی طرح شرمار ہے ہو۔ کہتے کیوں نہیں کہ ابھی تک تمہیں کسی لڑکی نے منہ نہیں لگایا۔''

ملکوتی سے ہنسی ضبط نہ ہوسکی۔ وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ عبداللہ بھی ہنسنے لگا۔

اندر سے آواز آئی۔

''ملکوتی بیٹی مہمانوں کو اندر لے آؤ۔''

ملکوتی۔ عبداللہ کو لے کر اندر آ گئی۔ ملکوتی نے عبداللہ کو بتایا۔

''یہ میری ماں ہیں اور..................''

ماں نے ملکوتی کو اشارہ کیا۔ ملکوتی خاموش ہوگئی۔ عبداللہ نے بڑی بی کو سلام کیا۔

''یہ عبداللہ ہے امی! تاتاری سفیر۔'' ملکوتی پھر بولی۔

ملکوتی کی ماں تاتاری جوان کو بڑے غور سے دیکھ رہی تھی۔ پھر انہوں نے پوچھا۔

''آپ کے دوسرے ساتھی کہاں ہیں۔''

''وہ سمرقند والئ ہرات کا پیغام لے کر گئے ہیں۔''

عبداللہ نے جواب دیا۔

''تم تاتاری ہو؟''

عبداللہ نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کس قبیلے کے ہو بیٹے؟'' ماں نے تیسرا سوال کیا۔

''ہمارا قبیلہ اوجائی بونمائی ہے چچی جان۔'' عبداللہ نے موقعہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فوراً رشتہ جوڑ لیا۔

ملکوتی کی ماں چونک پڑی۔ اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

اوجائی بونمائی قبیلہ کا سردار سلووز تھا۔

عبداللہ اُس کی زبان سے سلووز کا نام سن کر بڑا حیران ہوا۔ پھر بولا:

''چچی جان! سلووز ہمارے قبیلے کا سردار ہے۔ آپ اُسے جانتی ہیں؟''

''ہاں بیٹا! میں سلووز کو جانتی ہوں۔ سلووز بھی مجھے جانتا ہے۔'' بڑی بی نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔

''بیٹے عبداللہ!......ذرا میرے قریب آ......''

عبداللہ بڑی بی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

بڑی بی بولیں۔

''میں بھی اوجائی بونمائی قبیلے کی ہوں''

یہ کہتے ہوئے بڑی بی نے اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔عبداللہ بے جھجک ان کے گلے لگ گیا۔ بڑی بی عبداللہ کو سینے سے چمٹا کر رونے لگیں۔ملکوتی اور فراجی انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

کچھ دیر آنسو بہانے کے بعد بڑی بی نے عبداللہ کو سینے سے الگ کیا۔آنسو پونچھتے ہوئے بولیں۔

تجھے دیکھ کر اپنا گھر بار اور بچپن یاد آ گیا۔

پھر پوچھا۔:

''سردار سلووز کے کتنے بچے ہیں؟''

''انہیں اللہ تعالیٰ نے کوئی اولاد نہیں دی۔'' عبداللہ نے بتایا۔''اسی غم میں دونوں گھل گھل کے بوڑھے ہو گئے ہیں۔ کہتے ہیں جوانی میں سردار سلووز بڑے ظالم تھے۔آپ نے انہیں کب دیکھا تھا چچی جان؟''

''میں نے.............میں نے اُسے اس وقت دیکھا تھا جب اس کا ظلم انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔'' پھر بڑی بی کراری آواز میں بولیں۔

''خدا ہر ظالم کو سزا دیتا ہے۔''

ملکوتی کھڑی کھڑی الجھ رہی تھی۔بولی:

''امی!......آپ بھی کہاں کی پرانی باتیں لے بیٹھیں۔کچھ کھانے دانے کا انتظام کیجئے۔میں نے عبداللہ کو دعوت پر بلایا ہے۔''

جوانی کی باتوں نے بڑی بی کو جوان بنا دیا تھا۔ملکوتی نے یاد دلایا تو وہ ماضی سے پھر حال میں آ گئیں اور پھر بوڑھی ہو گئی۔دھیمی آواز میں بولیں۔:

''عبداللہ کی دعوت ضرور ہو گی۔میں اپنے بیٹے کو اپنے ہاتھوں سے اُزبکی پکا کر کھلاؤں گی۔''

ازبکی' تاتاریوں کا من بھاتا کھانا تھا۔ یہ ایک طرح کا سالن تھا جس میں تمام ترکاریاں سالم شکل میں گوشت کے ٹکڑوں کے ساتھ ڈالی جاتیں۔اس سالن میں پانی کے بجائے پھٹا ہوا دودھ ڈالا جاتا۔ازبکی کا نام سن کر عبداللہ کے منہ میں پانی بھر آیا۔

بڑی بی کھانے کا انتظام کرنے چلی گئیں۔ملکوتی' عبداللہ کو اپنے کمرے میں لے آئی۔ کمرہ بڑے سلیقے سے آراستہ کیا گیا تھا۔عبداللہ نے کمرے کو دیکھ کر ملکوتی کی نفاست پسندی کا اندازہ لگا لیا۔ملکوتی کی خوش شگفتگی سے اس کا دل بہت خوش ہوا۔ وہ ملکوتی کو تو پہلی ہی نظر میں دل دے بیٹھا تھا لیکن یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا کہ کہاں دس سواروں کا سالار عبداللہ اور کہاں ملک ہرات کی شہزادی ''ملکوتی''

عبداللہ نے پوچھا۔:

''والیٔ ہرات سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟''

''وہ میرے چچا ہیں۔''ملکوتی نے ایک انداز معشوقانہ سے جواب دیا۔

''والیٔ ہرات تو افغان نسل سے ہیں لیکن آپ کی والدہ اوجائی بونمائی قبیلے کا نام لے رہی تھیں۔''عبداللہ نے دوٹوک سوال کیا۔اس نے سوچا کہ بات بڑھنے سے پہلے ہی فیصلہ ہوجائے تو بہتر ہے۔اگر ملکوتی اس کی دسترس سے باہر ہے تو وہ پھر خواہ مخواہ اپنا دل کیوں جلائے۔

ملکوتی جواب دینا چاہتی تھی کہ اس کی نظر''فراجی''پر پڑی۔وہ ان کے ساتھ ہی کمرے میں آ گئی تھی اور کچھ دور کھڑی بڑے غور سے ان کی باتیں سن رہی تھی یا پھر ان کی نظریں پڑھ رہی تھی۔

''تو یہاں کیا کر رہی ہے؟''ملکوتی نے فراجی کو ڈانٹ پلائی۔

وہ بے چاری چپ چاپ کمرے سے نکل گئی۔

ملکوتی نے کہا۔:

''میری امی تمہاری طرح تاتاری ہیں۔امی کی داستان بڑی دردناک ہے۔ان کے پہلے شوہر قبیلہ اوجائی بونمائی کے بڑے سردار تھے۔ سلووزان کا چھوٹا بھائی ہے۔اس نے بڑے بھائی کے خلاف بغاوت کر دی۔میری امی اپنے شوہر کے ساتھ ہجرت کر کے ہرات آ گئیں۔یہاں امی کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور والیٔ ہرات نے اپنے بھائی کے ساتھ میری امی کی شادی کر دی۔یوں میں والیٔ ہرات کی بھتیجی ہوئی۔باپ کی طرف سے افغان اور میری ماں تاتاری ہے۔''

عبداللہ یہ باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔اس نے کہا۔

''یہ باتیں میں نے اپنے باپ سے سنی ہیں۔بلخ کا ہر بوڑھا آدمی جانتا ہے کہ سلووز نے اپنے بھائی کو بلخ سے نکال دیا تھا لیکن یہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس نے ہرات میں پناہ حاصل کی تھی۔''

عبداللہ اور ملکوتی پہلی ہی ملاقات میں ایسے گھل مل گئے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ان کی باتیں ختم ہونے کا نام نہ لیتی تھیں۔کھانا تیار ہو گیا۔عبداللہ نے بڑے مزے لے لے کر کھانا کھایا۔ازبکی تو اسے بہت پسند آئی۔

عبداللہ بولا۔:

''چچی جان!......ایسی ازبکی تو میں نے بلخ میں بھی نہیں کھائی۔''

بلخ کے نام پر بڑی بی پھر آبدیدہ ہو گئیں۔بولیں:

''بلخ تو اب میرے لئے خواب ہے۔ایک بار اپنا شہر،اپنا وطن دیکھنے کی آرزو ہے لیکن مجھے وہاں کون لے جائے گا؟''

''چچی جان۔بلخ دکھانے کا تو میں وعدہ نہیں کرتا لیکن بلخ کے تاتاری یہاں بہت جلد آنے والے ہیں۔''یہ بات بے ساختہ عبداللہ کے منہ سے نکل گئی۔یہ کہنے کے بعد اسے افسوس ہوا لیکن اب تو تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

ملکوتی اوراس کی ماں نے حیرت سے عبداللہ کو دیکھا۔ یہ جملے ایسے تو نہ تھے جو اثر نہ کرتے۔

ماں نے پوچھا:

''بیٹا! تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ بلخ کے تاتاریوں کو کیا پڑی ہے جو مجھ غریب کو دیکھنے اتنی دور کا سفر کر کے آئیں۔ پھر میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میرا ذکر سلووز سے کیا جائے۔ میری عمر تو کٹ چکی ہے۔ جو باقی ہے وہ بھی رو دھو کے کٹ جائے گی۔ اب گڑے مردے اکھاڑنے سے کیا فائدہ؟''

عبداللہ جذبات میں آ کے ایک ایسی بات کہہ بیٹھا جس کا اظہار خطرے سے خالی نہ تھا اب ملکوتی کی ماں کو مطمئن بھی کرنا تھا۔ وہ ملکوتی کی نظروں میں بھی گرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر وہ بات ٹالنے کی کوشش کرتا تو اس پہلی ہی ملاقات میں اس کے وقار کے مجروح ہونے کا خطرہ تھا۔ وہ خود تو ملکوتی کے پاس پہنچ ہی گیا تھا لیکن ملکوتی نے اس سے جس بے تکلفی اور لگاوٹ سے باتیں کی تھیں اس سے محسوس ہونے لگا تھا کہ شاید ملکوتی بھی اس کے قریب آنے کی کوشش کر رہی ہے۔

عبداللہ نے مجبوراً زبان کھولی مگر ڈرڈر کے۔ اس نے کہا:

چچی جان! یہ ایک راز کی بات ہے اگر آپ وعدہ کریں کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کریں گی تو میں کچھ باتیں آپ کو بتاؤں۔

ماں بولی۔:

''عبداللہ تم تاتاری ہو میرے بیٹے کے مانند۔ اگر راز کھولنے سے تمہیں نقصان پہنچ رہا ہو تو میں وعدہ کرتی ہوں کہ راز ہمیشہ راز ہی رہے گا۔ میں یا ملکوتی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیں گی۔''

عبداللہ نے رازدارانہ انداز میں کہا۔:

''چچی جان! سمرقند اور ہرات میں جنگ ہونے والی ہے۔ سمرقند کا لشکر لڑائی کی تیاری کر رہا ہے۔ ہرات والوں نے ہماری سرحد میں گھس کر لوٹ مار کی ہے۔ مجھے اور عبداللہ کو والئ ہرات کے پاس اس لئے بھیجا گیا ہے کہ لوٹ کے مال کا مطالبہ کریں۔ والئ ہرات نے لوٹ کا مال واپس کرنے کے بجائے امیر سمرقند کو تین سو گھوڑوں کا تحفہ بھیجا ہے۔ امیر قزغن اسے قبول نہ کرے گا اور جنگ شروع ہو جائے گی۔

ملکوتی اور اس کی ماں اس خبر سے بہت خوفزدہ ہوئیں۔ ماں نے کہا:

''بیٹا! کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ یہ جنگ رک جائے۔ ذرا سی بات پر ہزاروں بندگان خدا کا خون بہہ جائے گا۔''

''چچی جان!...... جنگ تو ضرور ہو گی اسے کوئی نہیں روک سکتا۔'' عبداللہ نے صاف صاف کہہ دیا۔

''آپ فکر نہ کریں۔ میں آپ لوگوں پر آنچ نہ آنے دوں گا۔''

''مگر بیٹا۔ کیا پتہ کسے شکست ہو۔'' ماں نے ایک اصولی بات کہی۔ ہو سکتا ہے کہ تاتاری ہرات پر قبضہ کر لیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ ہرات کے افغان سمرقند تک پہنچ جائیں۔''

''نہیں چچی جان!...... ایسا نہیں ہوگا۔'' عبداللہ نے زور دے کر کہا۔ ''والیٔ ہرات کو سمرقند کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔ اس وقت سمرقند کے دربار میں ایک ایسا تاتاری سردار موجود ہے جو ہرات تو کیا پورے ایران اور افغانستان کو فتح کر سکتا ہے۔

''کیا وہ سمرقند کے حاکم کا بیٹا ہے؟'' ماں نے دلچسپی سے پوچھا۔

''بیٹے سے بھی بڑھ کے چچی جان'' عبداللہ نے جواب دیا۔

''اس کا نام تیمور گورگانی ہے۔ سمرقند کے حاکم نے اپنی پوتی کی شادی اس سے کر دی ہے۔ اس وقت وہ ایک ہزار تاتاری جوانوں کا سردار ہے۔ اس نے بڑے بڑے تاتاری سرداروں کے سر جھکا دیئے ہیں۔ ہرات کی مہم کا وہی سردار ہوگا۔ اس کی سرداری فتح کا نشان سمجھی جاتی ہے۔''

عبداللہ نے اپنی باتوں سے ماں بیٹی کو سخت ہراساں کر دیا۔ ان کے چہروں کا رنگ اڑ گیا۔

عبداللہ نے فوراً کہا:

''آپ بالکل پریشان نہ ہوں چچی جان!...... ہرات میں داخل ہوتے ہی میں اپنے آدمیوں کے ساتھ آپ کے مکان پر آ جاؤں گا۔ آپ کی طرف کوئی آنکھ بھی نہ اٹھا سکے گا۔''

عبداللہ اپنی رو میں اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے ہرات فتح ہو چکا ہے اور وہ فاتح کی حیثیت سے قلعہ ہرات کے بڑے پھاٹک سے ابھی داخل ہونے والا ہے۔ افغان، شجاعت اور بہادری میں تاتاریوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔ اُن کی فوجی طاقت بھی ایسی نہ تھی کہ ہرات پر آسانی سے قبضہ کیا جا سکے۔ والیٔ سمرقند کو افغانوں پر صرف اس وجہ سے فوقیت حاصل تھی کہ اس وقت تمام بڑے بڑے تاتاری سردار حاکم سمرقند کے جھنڈے کے نیچے جمع تھے ورنہ اس سے پہلے والیٔ ہرات تقریباً تمام تاتاری سرداروں کو فرداً فرداً شکست دے چکا تھا یا کم از کم اُن سے اپنی طاقت کا لوہا منوا چکا تھا۔

دعوت ختم ہوگئی لیکن عبداللہ کی باتوں نے ملکوتی اور اس کی ماں کو اس قدر خوفزدہ کر دیا کہ اب وہ خاموش خاموش اور فکر مند رہنے لگیں۔ عبداللہ جب تک ہرات میں رہا وہ تیسرے روز ان سے ملنے جاتا لیکن اس نے اپنی غلطی سے ان کا سکون چھین لیا تھا۔ عبداللہ انہیں لاکھ تسلیاں دیتا لیکن ملکوتی کچھ بجھی بجھی سی رہتی۔

☆

ہرات سے ابھی جواب نہ آیا تھا کہ امیر قزغن نے تیمور کے ایک ہزاری دستے کو تاتاری لشکر کا مقدمتہ الجیش بنا دیا۔ مقدمتہ الجیش یا ہراول دستہ لشکر کے آگے آگے چلتا تھا۔ اس دستے کی سرداری امیر تیمور کے سپرد کی گئی۔ تیمور کے دستہ میں جو سوار شامل تھے وہ تمام کے تمام نوعمر تھے۔ تیمور خود بھی جوان تھا۔ اس لئے اس نے اپنے دستے میں چھانٹ چھانٹ کے جوانوں کو شامل کیا۔ وہ نئے خون پر زیادہ اعتماد کرتا تھا اس کا کہنا تھا کہ اگر سازشوں سے بچنا چاہو تو فوج میں نوجوانوں کو بھرتی کرو۔ وہ اپنے ایک ہزار جوانوں کے نام کی ایک فہرست اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ یہ جوان بھی تیمور پر جان نچھاور کرنے پر آمادہ رہتے۔ تیمور کھانے پر بیٹھتا تو چار سواروں کو ضرور اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھاتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنے جوانوں کی ضیافت بھی کرتا۔ قصرِ سینہ میں شاندار ضیافتیں دینا اسے بہت پسند تھا۔

امیر قزغن کے پیغام کے جواب میں تیمور کا خانہ زاد غلام عبداللہ گھوڑا کا تحفہ لے کر سمر قند گیا۔ امیر قزغن کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ بہت چراغ پا ہوا۔

امیر قزغن نے کہا۔:

''ملک معزالدین نے ہماری توہین کی ہے کیا ہم فقیر ہیں جو گھوڑوں کا تحفہ قبول کریں؟''

تیمور نے جواب میں کہا۔:

''میں پوری طرح تیار ہوں صرف آپ کا حکم چاہئے۔''

امیر قزغن سوچ میں پڑ گیا۔ پھر سر اٹھا کر پوچھا۔

''گھوڑے لے کر کیا ان کا کوئی سردار آیا ہے۔ اسے بلاؤ اس سے شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔''

''ہرات سے کوئی سردار نہیں آیا ہے۔'' امیر تیمور نے بتایا۔

''ہم نے دو قاصد بھیجے تھے۔ والیٔ ہرات نے ایک کو روک لیا ہے اور دوسرے کے ساتھ یہ تحفہ بھیج دیا ہے۔ گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والے مزدور اور سائیں ساتھ آئے ہیں۔''

''یہ تو اور زیادہ توہین ہے تیمور''

امیر قزغن غصہ سے لال پیلا ہو گیا۔ کسی دربار میں تحفہ بھیجا جاتا ہے تو کوئی معزز سردار تحفہ پیش کرنے کے لئے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ملک نے صرف گھوڑے بھیجے ہیں۔ ہم اس کے گھوڑوں کے بھوکے نہیں۔ ہم نے اپنے گھوڑے منگوائے تھے۔''

تیمور خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔

امیر قزغن نے فیصلہ کیا۔ بولا۔:

''پانچ ہزار سواروں کے ساتھ ہرات کا رخ کرو۔ ضرورت پڑنے پر مزید کمک روانہ کر دی جائے گی۔ ہم لشکر لے کر تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔ ملک ہرات اگر ہتھیار ڈال دے تو اسے گرفتار کر کے لایا جائے۔ ہرات میں لوٹ مار ہرگز نہ کی جائے۔''

تیمور نے امیر قزغن کے حکم کا ایک ایک لفظ غور سے سنا۔ اپنے ساتھ لے جانے والے پانچ ہزار سواروں کی تفصیل پوچھی۔ تمام باتیں پوچھنے اور مطمئن ہونے کے بعد تیمور نے اپنے رسالہ کا رخ کیا۔

☆

عبداللہ کو ہرات سے سمر قند گئے جب ایک ماہ سے زیادہ گزر گیا تو والیٔ ہرات کو فکر ہوئی۔ اسے معلوم تھا کہ امیر قزغن بڑا ضدی سردار ہے۔ اگر وہ پکڑے ہوئے گھوڑوں کی واپسی کے مطالبہ سے دست بردار نہیں ہوا تو یقینی جنگ ہوگی۔ ایک خوفناک جنگ۔ اس نے بھی چپکے چپکے جنگی تیاریاں شروع کر دیں۔ سرحدی راستوں پر محافظوں کی نفری میں اضافہ کر دیا گیا اور سرحد کے قریب تازہ دم فوج تعینات کر دیں۔ اسے اب اپنی اس غلطی کا

احساس ہوا کہ اس نے گھوڑوں کے تحفہ کے ساتھ اپنے ایک دوسرداروں کو کیوں نہ بھیجا جو سمرقند میں ہونے والے واقعات سے اسے آگاہ کر سکتے۔

بہر حال اس نے خود کو کیل کانٹے سے پوری طرح لیس کر لیا اور متوقع حملے کے پیش نظر قلعہ ہرات سے نکل کر معہ لشکر کے سرحد کے قریب اس سڑک کے کنارے خیمہ زن ہو گیا جو سمرقند اور ہرات کو ملاتی تھی۔ نقل و حرکت کے لئے دونوں شہروں میں یہی واحد راستہ تھا۔

ایک ماہ کی مسلسل رفاقت نے ملکوتی اور عبداللہ کو ایک دوسرے کے بہت قریب کر دیا۔ ملکوتی کی ماں اور عبداللہ ایک ہی تا تاری قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے اس کا جھکاؤ فطرتاً عبداللہ کی طرف ہو گیا۔ بڑی بی جہاندیدہ اور زمانہ کے گرم و سرد سے گزر چکی تھیں۔ انھوں نے ملک معز الدین حسین کے بیٹوں کی نظریں بھی دیکھی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ ہرات کا کوئی شہزادہ ملکوتی کو پسند نہیں کرتا محض باپ کی خاطر وہ ملکوتی کو برداشت کرتے تھے۔ ان کا اختیار ہوتا تو وہ ان ماں بیٹی کو ہرات سے نکال باہر کرتے۔ انھیں تا تاریوں سے نفرت تھی اور ملکوتی کی ماں تا تاری تھی۔

عبداللہ میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ہر عورت اپنے داماد میں ڈھونڈتی ہے۔ عبداللہ تمام دن اور رات کا زیادہ وقت ان کے ہی محل میں گزارتا تھا۔ ملکوتی بہت شوخ و شنگ لڑکی تھی مگر یہ شوخی محض دکھاوا تھا۔ اس کا دل بھی اندر سے دکھا ہوا تھا۔

ایک دن اس نے آہستہ سے عبداللہ سے کہا۔

عبداللہ۔ میں نے مسکراہٹ اور شوخی کا یہ لبادہ اپنی ماں کی وجہ سے اوڑھ رکھا ہے ورنہ رات کی تنہائیوں میں، میں اکثر روتی ہوں۔

عبداللہ پریشان ہو گیا۔ پوچھا۔

''ملکوتی تمہیں کس بات کی کمی ہے۔ یہ محل، نوکر چاکر۔ والئ ہرات تم سے محبت کرتا ہے۔ تمہاری ہر جگہ عزت ہے۔''

''نہیں عبداللہ'' ملکوتی افسردگی سے بولی۔

''سوائے والئ ہرات کے اور تمام لوگ مجھ سے اس لئے نفرت کرتے ہیں کہ میری ماں تا تاری ہے حالانکہ باپ تو انہی میں سے ہے لیکن تا تاری ہونا یہاں ایک گالی ہے۔ میری ماں صدمے برداشت کرتے کرتے موت کے قریب پہنچ گئی ہے۔ اُسے سب سے زیادہ میرا غم کھائے جا رہا ہے میں خود جانتی ہوں کہ میرا مستقبل تاریک ہے۔ والئ ہرات کی آنکھ بند ہوتے ہی میں یہاں سے نکال دی جاؤں گی۔ میں یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی مسکراتی ہوں اور قہقہے لگاتی ہوں۔ اگر میں بھی ماں کے ساتھ بیٹھ کے قسمت پر آنسو بہانے لگوں تو اس طرح حالات نہیں بدلیں گے لیکن ماں کا ضرور خاتمہ ہو جائے گا۔''

عبداللہ نے کہا۔:

''تو کیا تمہیں ہرات کا باشندہ نہیں سمجھا جاتا؟''

''باشندہ کیسا؟ ہمیں تو یہ کتے سے زیادہ بدتر سمجھتے ہیں۔''

''لیکن تمہارا باپ تو ملک حسین کا سگا بھائی تھا۔ نام تو باپ کی طرف سے چلتا ہے۔'' عبداللہ نے کہا۔

''تمام شہزادے میرے باپ کو بھی بُرا سمجھتے ہیں۔'' ملکوتی کی آنکھیں بھر آئیں۔

''امی کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ وطن واپس چلی جائیں لیکن یہ کس طرح بھی ممکن نہیں۔ والئ ہرات تو تاتاریوں کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے۔''

''اللہ نے چاہا تو میں چچی جان کو ایک دن بلخ ضرور لے جاؤں گا۔'' عبداللہ نے بڑے عزم سے کہا۔ پھر ملکوتی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔ ''خوشی سے ہمیں کوئی جانے نہ دے گا اور زبردستی کرنے کی ہم میں ہمت نہیں۔''

عبداللہ جذباتی ہوگیا۔ ''ملکوتی تم کم از کم مجھ سے یہ وعدہ کرلو کہ اگر قدرت نے حالات پیدا کردئے تو تم بھی چچی جان کے ساتھ وطن چلوگی۔''

''میں وعدہ کرتی ہوں۔'' ملکوتی کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''لیکن ایک ناممکن بات کا وعدہ کس کام کا۔'' ملکوتی نے کہا۔

یہ عبداللہ کی محبت کا کھلا ہوا اعلان تھا۔ عبداللہ نے چاہا کہ اس خوشی میں وہ ملکوتی کو گلے لگالے لیکن ملکوتی کی کنیز فراجی گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

فراجی نے ہانپتے ہوئے بتایا۔

غضب ہوگیا شہزادی غضب۔ ''ظالم تاتاری فوج لے کر ہرات پر چڑھ آئے ہیں۔ خبر آئی ہے کہ سرحد پر جنگ شروع ہوگئی ہے۔ تمام فوجی ادھر بھاگے جارہے ہیں۔''

''عبداللہ کے لئے یہ دوسری خوشی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ امیر قزغن نے والئ ہرات کا تحفہ قبول نہیں کیا اور چڑھائی کردی ہے۔''

فراجی اتنا بتا کر ملکوتی کی ماں کو خبر دینے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

ملکوتی نے پریشان نظروں سے عبداللہ کو دیکھا۔ عبداللہ کے لبوں پر بڑی پُراسرار مسکراہٹ تھی۔

ملکوتی نے ناگوار انداز میں کہا۔

''عبداللہ تم مسکرارہے ہو۔ کیا یہ خوشی کا موقع ہے؟''

''ہاں ملکوتی۔'' عبداللہ اطمینان سے بولا۔ ''صرف خوشی کا موقعہ نہیں بلکہ خوشی ہرات کی سرحدوں تک پہنچ گئی ہے۔ اب میں چچی جان کو لے کر بلخ جاؤں گا۔''

''کیا کہہ رہے ہو عبداللہ۔ کس طرح لے جاؤ گے انہیں۔'' ملکوتی نے حیرت سے پوچھا۔

''سرحد پر لڑنے والی تاتاری فوج کے سردار میرے آقا تیمور ہوں گے۔'' عبداللہ نے ملکوتی کو بتایا۔ ''تمام اہم لڑائیوں کی سرداری ان ہی کو دی جاتی ہے۔ جب وہ لڑتے ہوئے اس قلعہ تک پہنچیں گے تو چچی جان آزاد ہوں گی۔ انہیں بلخ جانے سے کوئی نہ روک سکے گا۔''

ملکوتی کو اطمینان نہ ہوا۔ بولی۔

''تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ تاتاری فتح یاب ہوں گے۔ والئ ہرات خود اپنے لشکر کی کمان کررہے ہیں۔ ہرات کی فوج کو شکست دینا بڑا

مشکل ہے۔"

یہ ملکوتی کا اندازہ اور خیال تھا۔ اس میں شک نہیں کہ والئ ہرات بہادر اور تجربہ کار تھا۔ اسے ہرات سے تازہ دم کمک مل سکتی تھی لیکن اس کے مقابلہ پر تاتاریوں کی کمان خود تیمور کر رہا تھا۔ جواں عمر تیمور اس کی عمر کم تھی مگر فوجی حکمت عملی میں اپنی نظیر آپ تھا۔

تیمور کو امیر قزغن نے صرف پانچ ہزار کا لشکر دیا تھا۔ اس کا ذاتی دستہ ایک ہزار جانبازوں پر مشتمل تھا۔ اس طرح ہرات جیسی مضبوط طاقت کو زیر کرنے کے لئے اس کے ساتھ صرف چھ ہزار سوار تھے۔ امیر قزغن نے مزید کمک کا وعدہ بھی کیا تھا اور دو ہزار کا لشکر تیمور کے پیچھے پیچھے کمک کی صورت میں آ رہا تھا۔ امیر قزغن کو تیمور پر اس قدر اعتماد ہو گیا تھا کہ وہ جس مہم پر تیمور کو بھیجتا اس کی فتح کی خوشخبری لوگوں کو پہلے ہی سنا دیتا۔ اب تک ہوا بھی ایسا ہی تھا۔

تیمور سمرقند سے فوج لے کر چلا تو اس نے وہ گھوڑے بھی ساتھ لے لئے جو ملک معزالدین حسین نے تحفہ کے طور پر امیر قزغن کو بھیجے تھے۔ اس کے جاسوس پہلے ہی ہرات میں داخل ہو چکے تھے۔ جاسوسوں نے تیمور کو خبر بھیج دی تھی کہ سرحد کے ساتھ والئ ہرات اپنا لشکر لئے شاہراہ سمرقند پر نظریں جمائے بیٹھا ہے۔

تیمور نے ہرات آنے کے لئے وہی راستہ اختیار کیا جو سیدھا ہرات کو آتا تھا لیکن ہرات کی سرحد کے پاس پہنچ کر اس نے پانچ پانچ سو کے بارہ دستے بنائے اور انہیں دائیں بائیں بیس میل تک پھیلا دیا۔ اس نے اپنے ساتھ صرف دو ہزار سوار رکھے۔ ان میں ایک ہزار سوار تو اس کے خاص دستے کے تھے اور ایک ہزار دوسرے بہادروں کا دستہ تھا۔ اب جو اس نے لشکر کو آگے بڑھایا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بیس میل تک ایک عظیم الشان لشکر ہرات کی طرف پیش قدمی کر رہا ہے۔

والئ ہرات کے جاسوس تیمور کی اس حکمت عملی کو نہ سمجھ سکے۔ انہوں نے بھاگ کے والئ ہرات کو خبر دی کہ بیس میل تک سمرقندی لشکر پھیلا ہوا ہے جس کی تعداد کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ ہر طرف لشکر ہی لشکر دکھائی دیتا ہے۔ والئ ہرات اس خبر سے بہت پریشان ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ تاتاری لشکر سیدھی سڑک سے آئے گا اور ایک ہی میدان میں جنگ کا فیصلہ ہو گا لیکن اب میدان بیس میل تک وسیع ہو گیا تھا۔

تیمور نے اپنی رفتار آہستہ رکھی تا کہ دشمن پر اعصابی دباؤ پڑا رہے۔ آخری حربہ اس نے یہ استعمال کیا کہ سر پر پہنچ کے اس نے ساتھ لائے ہوئے گھوڑوں کا رخ ہرات کی طرف کر دیا اور پھر انہیں چابکیں مار مار کر بھگایا۔ تین سو گھوڑوں کا یہ گروہ ایک بلائے ناگہانی کی طرح ملک معزالدین کے لشکر میں گھس گیا اور خیموں اور لشکریوں کو روندتا ہوا گزر گیا۔ اس سے ایک طرف تو سامان برباد ہوا تو دوسری کئی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔ ہرات کے لشکریوں نے بڑی مشکل سے ان گھوڑوں پر قابو پایا۔

تیمور بڑھتا ہوا آخر ہرات کے لشکر کے سامنے پہنچ گیا۔ یہ سہ پہر کا وقت تھا۔ تیمور نے لشکر کو روک کر خیمے لگانے کا حکم دیا۔ ملک معزالدین کا خیال تھا کہ تاتاری فوراً حملہ کریں گے لیکن تیمور نے حملے سے گریز کیا اور اطمینان سے دشمن کے سامنے خیمے ڈیرے لگا دیئے۔

ملک معزالدین گھبرایا ہوا تھا۔ خیمے لگاتے انہیں دیکھا تو اطمینان ہوا۔ اور اُمید بندھی کہ شاید صلح کی بات چیت کریں گے۔ اس نے بھی

حملہ میں پہل نہ کی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ انہیں حملہ کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ دراصل ملک معزالدین تاتاری لشکر کی آن بان دیکھ کر ذہنی طور پر شکست کھا گیا تھا اور چاہتا تھا کہ اگر لڑائی کی بجائے صلح ہو جائے تو زیادہ بہتر ہے۔

رات کو تیمور نے ایک اور غضب دکھایا اس نے اپنے دستوں میں سے پانچ سو سواروں کو ہرات کے لشکر پر شب خون مارنے کا حکم دیا۔ تیمور نے شب خون کی خود قیادت نہ کی بلکہ باقی سواروں کے ساتھ رات بھر جاگتا رہا کہ اگر جوابی حملہ ہو تو پوری مدافعت کی جائے۔ تاتاریوں کے شب خون نے ہرات کے لشکر پر قیامت ڈھا دی۔ انہیں یہ خیال بھی نہ تھا کہ تھکا ہوا لشکر شب خون کی جرأت کر سکتا ہے۔ شب خون میں بے شمار ہراتی مارے گئے اور صدہا خیموں میں آگ بھڑک اٹھی۔

تیمور نے ملک معزالدین کو سنبھلنے کا موقعہ نہ دیا۔ وہ ابھی رات کے نقصان کا اندازہ لگا رہا تھا کہ تیمور نے صف بندی کر کے عام حملے کا حکم دیا۔ نقاروں پر چوٹ پڑی اور تاتاری سواروں نے بیس میل کے لمبے محاذ پر حملہ شروع کر دیا۔ تیمور کے برق رفتار سوار مارتے کاٹتے تیزی سے صفوں کو درہم برہم کر کے اندر گھس جاتے پر دائرہ بنا کر ہراتیوں کو گھیر لیتے جو ان کے دائرے میں آ جاتا وہ بچ کر نہ نکل پاتا۔

ملک معزالدین اس قسم کی جنگ کے لئے تیار نہ تھا۔ بیس میل کے طویل محاذ پر اس کے لئے کمک پہنچانا ناممکن ہو گیا۔ دوسری طرف تیمور کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا کہ وہ بیس میل کے پورے محاذ پر ایک گھنٹے میں دو بار چکر لگاتا اور اپنے سواروں کے حوصلے بلند کرتا۔ ہر سپاہی اور ہر گروہ یہی سمجھتا کہ تیمور ان کے ساتھ ہی لڑ رہا ہے۔

دوپہر سے پہلے ہی ملک معزالدین نے پسپائی اختیار کی۔ اس کوشش میں اس کی فوج کا بیشتر حصہ کام آیا۔ جب وہ اپنی جان بچا کر ہرات کے قلعہ میں پہنچا تو اس کے ساتھ صرف چوتھائی فوج رہ گئی تھی باقی یا تو میدان جنگ میں ماری گئی تھی یا ادھر ادھر بھاگ کھڑی ہوئی تھی۔

والیٔ ہرات کو بڑی عظیم شکست کھا کر قلعہ بند ہونا پڑا۔ پہلے تو قلعہ میں واویلا مچا۔ سب نے اپنے اپنے طور پر شکست پر آنسو بہائے اور افسوس کیا پھر ہر ایک کو اپنی جان کی فکر پڑ گئی۔ ظاہر تھا کہ تاتاری قلعہ فتح کئے بغیر واپس نہ جا سکتے تھے اور قلعہ بچتا نظر نہ آتا تھا۔

شام ہوتے ہوتے تیمور اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ ہرات کے سامنے نمودار ہوا اور اس نے آتے ہی محاصرہ کر لیا۔

ملک معزالدین صلح پر مجبور ہو گیا۔ اس نے اپنے سرداروں سے مشورہ کیا۔ سب کا دل ٹوٹ چکا تھا۔ مقابلہ میں ٹھہرنے کی کسی میں طاقت نہ تھی۔ سب نے ملک کی رائے سے اتفاق کیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ صلح کی گفتگو کس طرح اور کس کے ذریعہ شروع کی جائے۔ ملک کو قلعہ ہرات میں کوئی ایسا شخص نظر نہ آتا تھا جو اس کام کے لئے موزوں ہو۔ صرف ایک قاضی سیف الملک تھے جن پر اعتماد کیا جا سکتا تھا لیکن وہ سیدھے سادھے مسلمان تھے۔ فوجی قسم کے جھگڑوں کو نپٹانا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔

سوچتے سوچتے ملک کو اس سمرقندی کا خیال آیا جسے اس نے یرغمال کے طور پر قلعہ ہرات میں روک لیا تھا۔ ملک کو امید کی ایک ہلکی سی کرن نظر آئی۔ اس نے قاصد کو بلا کر گفتگو کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ضرورت مند دیوانہ ہوتا ہے۔

ملک نے بجائے عبداللہ کو اپنے پاس بلانے کے خود اس کے پاس جا کے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح وہ عبداللہ پر اخلاقی دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔

دریافت کرنے پر ملک کو بتایا گیا کہ سمرقند کا قاصد ملکوتی کے محل میں ہے۔ عبداللہ کا زیادہ وقت ملکوتی اور اس کی ماں کے پاس ہی گزرتا تھا۔ جب سے لڑائی کا غلغلہ اٹھا تھا وہ رات کو بھی وہیں رہنے لگا تھا۔ ملکوتی اور اس کی ماں نے خود اسے وہیں رہنے کا کہا تھا۔ ان کی امیدوں کا واحد سہارا اب عبداللہ ہی رہ گیا تھا۔

ملک معزالدین والئ ہرات تمام آداب امارت اور ریاست بالائے طاق رکھ کر بغیر اطلاع دیے ملکوتی کے محل میں پہنچ گیا۔ سب سے پہلے اس کی ملاقات ملکوتی کی ماں سے ہوئی۔ ملکوتی کی ماں والئ ہرات کو اپنے محل میں دیکھ کر سخت خوفزدہ ہوئی۔ وہ سمجھی کہ کسی نے اس کی شکایت کی ہے اور اب اس پر اور اس کی بیٹی پر کوئی بلا نازل ہونے والی ہے۔

ملک اس سے انتہائی خلوص اور مروّت سے ملا۔ ملکوتی کی ماں کو اس پر بڑی حیرت ہوئی اور خوف دُور ہو گیا۔ ملک نے پہلے ملکوتی کی خیریت دریافت کی پھر عبداللہ کے بارے میں پوچھا۔ اسی وقت عبداللہ اور ملکوتی لرزاں ترساں ملک کے سلام کو حاضر ہوئے۔

ملک نے بڑے پیار سے عبداللہ کو اپنے پاس بٹھایا۔ عبداللہ پھٹی پھٹی نظروں سے ملک کو دیکھ کر رہ گیا۔

ملک نے بات شروع کی۔

''ہم بڑے خلوص کے ساتھ تاتاری قاصد کو تاتاریوں کی فتح کی مبارکباد دیتے ہیں۔''

عبداللہ کو پسینہ آ گیا۔ وہ سمجھا کہ ملک معزالدین اس پر طنز کر رہا ہے۔ بس اسے اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔

ملک نے زرا رک کر کہا۔

''تم تاتاری ہو۔ ہماری بھاوج بھی تاتاری ہے۔ امید ہے کہ ہماری بھاوج نے تمہاری خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی ہوگی۔''

''میں بڑے آرام سے ہوں اور آپ کا شکرگزار ہوں والئ ہرات۔''

عبداللہ نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

ملک بولا۔

''عبداللہ ہمیں بتایا گیا ہے کہ تمہارا آقا امیر تیمور ہے؟''

''کسی نے ٹھیک بتایا ہے اے والئ ہرات'' عبداللہ کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ ملک آخر کیا کہنا چاہتا ہے۔

''کیا تمہیں علم ہے کہ امیر تیمور اس وقت کہاں ہے۔'' ملک نے پوچھا۔

عبداللہ کو علم نہ تھا۔ چنانچہ اس نے سادگی سے جواب دیا۔

''مجھے اس کے متعلق کوئی خبر نہیں۔''

ملک بولا۔

''اگر میں یہ کہوں کہ تمہارا آقا اس وقت قلعہ ہرات کے سامنے موجود ہے تو کیا تم یہ یقین کر سکو گے؟''

''ضرور یقین کروں گا۔انھیں اس وقت ہرات ہی میں ہونا چاہیے۔''عبداللہ نے جرأت سے جواب دیا۔

ملک کو اس جواب پر حیرت ہوئی۔اس نے کہا۔

''تم یہ کیسے کہتے ہو کہ اسے اس وقت ہرات میں ہونا چاہیئے۔''

امیر تیمور کی ہرات کے قلعہ کے باہر موجودگی کی خبر نے اسے اور زیادہ بے خوف کر دیا تھا۔وہ بولا۔

''اے والئ ہرات۔مجھے اس بات کا پہلے ہی خیال تھا۔امیر سمرقند ہر اہم موقع پر میرے آقا تیمور کو بھیجتے ہیں کیونکہ تیمور اور فتح ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ہرات کا معرکہ بھی اہم ہے۔اس کی سرداری پر امیر تیمور کو مامور ہونا چاہیئے۔''

ملک کا دل بیٹھنے لگا۔اس نے کہا۔

''عبداللہ تمہارا آقا کامیاب ہوا اور ہمیں شکست ہوئی۔ہم امیر تیمور سے ایک باعزت صلح کے خواہش مند ہیں۔کیا تم اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتے ہو؟''

اصل بات اب سامنے آئی۔ملکوتی اور اس کی ماں کو بھی والئ ہرات کی حالت پر بڑا افسوس ہوا۔عبداللہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔سچ ہے غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔والئ ہرات کچھ ہی دن پہلے امیر سمرقند کو صلواتیں سنا رہا تھا اور اب وہ سمرقند کے ایک معمولی قاصد کے تعاون کے لئے خوشامد کر رہا تھا۔

عبداللہ بولا۔

''والئ ہرات مجھے جو حکم بجالانے کا اظہار کریں گے میں اس میں عذر نہ کروں گا۔اگر وہ چاہتے ہیں کہ میں اپنے آقا سے ان کے لئے مراعات کی درخواست کروں تو میں آمادہ ہوں۔میں اپنے آقا کی خوشامد کروں گا۔مجھے امید ہے کہ میرا آقا میری بات نہ ٹالے گا۔''

ملک معزالدین شکست کے صدمہ سے نڈھال ہو رہا تھا۔اس نے کہا۔

''عبداللہ!ہمیں کچھ زیادہ مراعات نہیں چاہئیں۔ہماری اور ہمارے اہل خاندان کی جان بخشی قلعہ میں قتل و غارت گری کی ممانعت کے علاوہ ہمیں اور کچھ نہیں چاہیے اس کے بدلے ہم قلعہ امیر تیمور کے حوالے کر دیں گے اور حسب طلب زرتاوان ادا کریں گے۔''

عبداللہ اپنے آقا سے ملنے پر تیار ہو گئے۔فوراً سفارت ترتیب دی گئی۔ملک معزالدین نے اس سفارت میں قاضی سیف الملک کو اپنی طرف سے شامل کر لیا اور شہزادی ملکوتی،ملک سے ضد کر کے خود اپنے طور پر شامل ہو گئی۔تین گھوڑوں پر سفید پھریرے آویزاں کیے گئے۔قلعہ ہرات کا دروازہ کھولا گیا۔عبداللہ قاضی ہرات اور ملکوتی سفید پھریرے اڑاتے لشکر کی طرف چلے۔قلعہ ہرات کا دروازہ پھر بند کر دیا گیا۔

☆

تیمور خود بھی خون ریزی کے بغیر قلعہ پر قبضہ کا خواہش مند تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ صلح کے پیغامبر آ رہے ہیں تو خیمہ سے نکل کر اس نے سفارت کا خود استقبال کیا۔ عبداللہ نے اپنے آقا کو استقبال کے لیے موجود دیکھا تو دور ہی سے گھوڑا چھوڑ کر پاپیادہ ہوگیا۔ اسے پیدل دیکھ کر قاضی اور ملکوتی بھی گھوڑوں سے اتر پڑے۔

امیر تیمور عبداللہ کو سفارت کے ساتھ دیکھ کر مسکرایا۔ عبداللہ نے قریب پہنچ کر تیمور کو سلام کیا اور سر جھکا کر خاموش کھڑا ہوگیا۔ قاضی ہرات اور شہزادی نے بھی تعظیم پیش کی۔

تیمور نے کہا۔ عبداللہ! ہمیں تمہاری بہت فکر تھی۔ تمہارا ہم نام عبداللہ بھی تمہارے لیے بہت پریشان تھا قلعہ والوں نے تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچائی۔

''بالکل نہیں میرے آقا۔''

عبداللہ ادب سے بولا۔

''اس وقت میں والئ ہرات کی طرف سے آپ کی خدمت میں صلح کا پیغام لے کر حاضر ہوا ہوں۔ میرے ساتھ ہرات کے قاضی صاحب اور شہزادی ملکوتی ہیں۔''

''شہزادی! تیمور نے حیرانی سے پوچھا'' کیا یہ والئ ہرات کی بیٹی ہیں۔''

''نہیں آقا!''

عبداللہ نے بتایا۔

''یہ والئ ہرات کے مرحوم بھائی کی بیٹی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ شہزادی ملکوتی کی ماں ایک تاتاری خاتون ہیں اور اس وقت قلعہ میں موجود ہیں۔''

''بہت خوب!''

تیمور نے شہزادی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''تو پھر اس رشتے سے یہ ہماری بھی بیٹی ہوئی۔''

ملکوتی کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ اسے ایک فاتح سردار سے اتنے محبت بھرے سلوک کی امید نہ تھی۔

عبداللہ نے کہا۔

''اے آقا! والئ ہرات اپنی شکست تسلیم کرتے ہیں۔ وہ قلعۂ ہرات آپ کے حوالے کرنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن ان کی درخواست ہے کہ والئ ہرات اور ان کے خاندان کے تمام لوگوں کی جان بخشی کی جائے۔ دوسرے یہ کہ قلعہ والوں کو عام معافی دی جائے۔ ان کا سامان نہ لوٹا جائے۔ اس کے صلہ میں جس قدر زر تاوان طلب کیا جائے گا وہ ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

صلح کی شرائط سامنے آ گئی تھیں۔ ذرا دیر سوچنے کے بعد تیمور نے اعلان کیا۔

''قلعہ والوں کو امان دی جائے گی۔ قتل و غارت یا لوٹ مار قطعی نہ ہوگی۔ ملک کے تمام خاندان والوں کی جاں بخشی کا اعلان کیا جاتا ہے سوائے ملک معزالدین حسین کے۔ ملک معزالدین حسین کی جاں بخشی کا مجھے اختیار نہیں۔ میں اپنی طرف سے ان کی جاں بخشی کرتا ہوں لیکن اس کی تصدیق امیر قزغن حاکم سمرقند کریں گے۔ اس کے لئے ملک معزالدین کو ہمارے ساتھ سمرقند چلنا ہوگا۔ انہیں باعزت طریقے سے سمرقند لے جایا جائے گا۔''

قاضی ہرات اور ملکوتی اس حسن سلوک سے بے حد خوش ہوئے۔ انہوں نے امیر تیمور کا بہت بہت شکریہ ادا کیا۔ سفارت اسی وقت قلعہ واپس گئی۔ ملک معزالدین ان کی واپسی کا کڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ قاضی ہرات نے امیر تیمور کے اعلان کے الفاظ اس کے سامنے دہرائے۔ ملک کی تمام باتیں تیمور نے تسلیم کر لی تھیں سوائے اس کی جاں بخشی کے۔ تیمور نے اپنی طرف سے اس کی جاں بخشی کر دی تھی اس لیے اس نے فوراً قلعہ کا دروازہ کھلوا دیا۔ اور اپنے سرداروں کے ساتھ قلعہ سے نکل کر امیر تیمور اور تاتاری لشکر کا استقبال کیا۔

چار دن تک قلعہ میں جشن منایا گیا۔ اس دوران عبداللہ اپنے دوست عبداللہ (لال تری کا شوہر) سے اپنے اور ملکوتی کے تعلقات کی تفصیل بیان کی اور اس سے امیر تیمور سے سفارش کی درخواست کی۔ امیر تیمور خود ملکوتی کی والدہ سے ملاقات کر چکا تھا۔ ملکوتی کی ماں کی بھی خواہش تھی کہ اس کی بیٹی کی شادی کسی تاتاری جوان سے کی جائے چنانچہ سمرقند واپسی سے قبل ملک معزالدین کی اجازت حاصل کر کے ملکوتی اور عبداللہ کا عقد کر دیا گیا۔

☆

''ہرات فتح ہو گیا۔''

یہ تھے وہ الفاظ جو تیمور کے قاصد نے حاکم سمرقند امیر قزغن کے سامنے بڑے جوش سے ادا کیے امیر قزغن حاکم سمرقند نے اپنا بڑا سا سر اور واحد چندھی آنکھ اس طرح گھمائی جیسے اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا ہو یا پھر وہ قاصد کو پاگل سمجھ رہا ہو۔

تیمور کی روانگی کے وقت امیر قزغن نے اس کے کان میں کہا تھا۔''

اے گورگانی سپوت! حوصلے سے کام لینا۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے ہرات پہنچ رہا ہوں۔''

امیر قزغن نے صرف چھ ہزار سواروں کے ساتھ تیمور کو ہرات بھیجا تھا تاکہ وہ والیٔ ہرات کو اس وقت تک الجھائے رکھے جب تک وہ خود اس کی کمک کو نہیں پہنچتا۔ لیکن ہرات کی قسمت کا فیصلہ امیر قزغن کی کمک پہنچنے سے پہلے ہی ہو گیا تھا۔ تیمور نے والیٔ ہرات ملک معزالدین کو ایک خون ریز لڑائی میں شکست دے کر قلعہ ہرات پر سمرقند کا جھنڈا لہرا دیا۔ والیٔ ہرات نے جاں بخشی کے وعدے پر خود کو تیمور کے حوالے کر دیا تھا۔

تیمور کا قاصد فتح ہرات کا مژدہ امیر قزغن کو سنا رہا تھا۔ امیر قزغن نے تین چار بار تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔ یہ امیر کے غصے کی علامت تھی۔ جب وہ غصے میں ہوتا تو کوئی حکم صادر کرنے سے پہلے اسی طرح جلدی جلدی پلکیں جھپکاتا تھا۔ قاصد پر لرزہ طاری ہو گیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

اے امیر! میں فاتح سردار تیمور گورگانی کا خاص قاصد ہوں۔ مجھے سردار نے آپ تک یہ خوش خبری پہنچانے کے لیے مقرر کیا ہے۔"

امیر قزغن کی پلکیں جھپکنا بند ہوگئیں اور اس کے خوفناک چہرے پر مسکراہٹ کی لکیریں ابھر آئیں۔

"کیا تو سچ کہہ رہا ہے قاصد؟"

"بالکل سچ امیر! تیمور گورگانی کا قاصد آپ کے سامنے کیسے جھوٹ بول سکتا ہے۔" قاصد نے امیر کے رویے میں تبدیلی دیکھی تو اسے حوصلہ ہوا۔

"تو ایک بار پھر وہی الفاظ دہرا، جو تو نے پہلے آتے ہی کہے تھے۔" امیر قزغن نے بڑی محبت کے ساتھ کہا۔

قاصد نے بلند آواز سے الفاظ دہرائے۔

"ہرات فتح ہوگیا۔"

امیر قزغن اتنا خوش ہوا کہ اس نے قاصد کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھالیا اور پوچھا۔

"تیرا نام کیا ہے۔"

"عبداللہ۔"

قاصد نے کہا۔

"میں خاتون آغا (تیمور کی بیوی) کی کنیز لال تری کا شوہر ہوں"

"خدا تیرا بھلا کرے عبداللہ۔"

امیر قزغن نے ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"میرے چھوٹے بیٹے کا نام بھی عبداللہ ہے لیکن مجھے اس سے کسی خیر کی امید نہیں۔"

عبداللہ خاموش رہا تو کچھ دیر بعد امیر نے خود پوچھا۔

"تیرا لشکر میں عہدہ کیا ہے؟"

"دس سواروں کا رسالدار ہوں۔"

"ہم تیمور سے سفارش کریں گے کہ تجھے سو سواروں کا رسالدار بنا دیا جائے۔"

امیر قزغن کی سفارش اس بات کا اظہار تھی کہ اسے اس مژدہ سے بے حد خوشی ہوئی ہے۔ پھر اس نے عبداللہ سے پوچھا۔

"تو ہرات کی جنگ میں شریک تھا۔ بتا کہ امیر تیمور کیسے لڑا؟"

"اے امیر! میرے آقا تیمور، دشمن پر اس طرح جھپٹ کر حملے کرتے تھے کہ جیسے شیر، ہرنوں کا شکار کرتا ہے۔"

عبداللہ نے کہا اور دیر تک جنگ کی تفصیل بتاتا رہا۔ امیر قزغن اتنے ہی انہماک سے سنتا رہا جس طرح عام تاتاری اپنے آباؤ اجداد کی

داستانیں پیشہ ور داستان گو سے سنا کرتے تھے۔

عبداللہ خاموش ہوا تو امیر نے چونک کر پوچھا۔

''تو نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ والیٔ ہرات کس طرح مارا گیا؟''

عبداللہ مسکرا کر بولا۔

''اے امیر سمرقند! تاتاریوں کا دشمن والیٔ ہرات سردار تیمور کے ہاتھوں گرفتار ہوا ہے اور وہ اپنی جاں بخشی کے لیے سردار تیمور کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوگا۔''

امیر قزغن نے اتنے زور کا قہقہہ لگایا کہ عبداللہ سہم گیا۔ اس قہقہے کی آواز دور دور تک پہنچی۔ جس سردار نے یہ آواز سنی۔ اس نے اس کی تقلید میں خود بھی پوری طاقت سے قہقہہ بلند کیا۔

تاتاریوں میں رواج تھا کہ جب حاکم وقت خوش ہو کر قہقہہ بلند کرے تو تمام لوگ اس کی آواز میں آواز ملائیں۔ اس طرح دیر تک قہقہوں کا ایک تار سا بندھا رہتا تھا البتہ غصے میں لگائے جانے والے قہقہے میں آوازیں نہیں ملائی جاتی تھی۔ وہ تو ایک قسم کا اعلان جنگ ہوا کرتا تھا۔ تمام سردار اسے سن کر تلواریں سونتتے اور حاکم وقت کے گرد جمع ہو جاتے تھے۔

فاتح ہرات تیمور ہے۔ اس لیے والیٔ ہرات کی قسمت کا فیصلہ بھی اسی کو کرنا چاہیے تھا۔ چاہے چھوڑتا' چاہے قتل کر دیتا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔'' امیر قزغن نے کہا۔

''اے امیر! یہ سوال وہاں بھی اٹھا تھا۔''

عبداللہ نے بتانا شروع کیا۔

''والی ہرات نے قلعہ حوالے کرنے کی یہ شرط رکھی تھی کہ اس کی جان بخشی کا وعدہ کیا جائے لیکن سردار تیمور نے جواب دیا کہ وہ سوائے والیٔ ہرات کے باقی تمام لوگوں کی جاں بخشی کر سکتے ہیں اور اسے زندہ یا مردہ امیر قزغن کے حضور پیش کیا جائے گا۔ اس لیے وہ والیٔ ہرات کو گرفتار کر کے آپ کے پاس لا رہے ہیں۔

''شاباش ہے تیمور..................... تو واقعی گورگانِ اعظم کی اولاد ہے۔'' امیر قزغن نے کہا۔

وہ اس خبر سے اس قدر خوش ہوا کہ اسی وقت اعلان کرا دیا کہ فاتح تیمور کا شایانِ شان استقبال کیا جائے۔

ہرات سے تیمور کی واپسی کی خبر سرائے سالی پہنچی تو لوگوں میں جوش و خروش پیدا ہو گیا۔ وہ تیمور کے استقبال کی تیاریوں میں لگ گئے۔ تیمور کی چہیتی بیوی الجائی خاتون' ننھے جہانگیر کو لے کر سرائے سالی آ گئی۔ اس کے ساتھ قصرِ سفید کے بہت سے لوگ' شہر سبز کے شہزادے کو خوش آمدید کہنے وہاں پہنچ گئے۔ تیمور کا انتظار ہونے لگا۔ انتظار کی گھڑیاں سخت ہوتی ہیں۔ لوگوں کو ایک ایک پل کاٹنا مشکل ہو گیا۔

ادھر تیمور نے اپنے پانچ سو جانبازوں کا دستہ ہرات کی حفاظت کے لیے چھوڑا۔ ملک معز الدین حسین والی ہرات کے تمام خاندان والوں

کوایک محل میں پہنچایا گیا تا کہ ان کی طرف سے کوئی فتنہ نہ اٹھے۔ بقیہ فوج کو تیمور اپنے ساتھ لے کر سرائے سالی کی طرف چل پڑا۔

تیمور نے ملک معزالدین کو حسب مرضی لباس زیب تن کرنے کی اجازت دی۔ اسے جسم پر اسلحہ سجانے سے بھی نہیں روکا گیا اور تیمور نے اس کا گھوڑا اپنے گھوڑے کے برابر رکھا تا کہ نہ تو ملک کو ندامت ہو اور نہ دیکھنے والے یہ محسوس کر سکیں کہ ان کا حاکم قیدی کی حیثیت سے جا رہا ہے۔

تمام راستے تیمور ملک معزالدین کی دلجوئی کرتا رہا اور اسے یقین دلاتا رہا کہ امیر قزغن ضرور اس کی جان بخشی کر دے گا۔

لشکر کے درمیان کچھ بند گاڑیاں بھی تھیں جن میں سے ایک میں ملکوتی اور اس کی والدہ سوار تھیں جبکہ باقی گاڑیوں میں ملک معزالدین کی وہ بیگمات اور کنیزیں تھیں جنہوں نے اپنے والی کو اس مصیبت کے وقت تنہا چھوڑنا پسند نہیں کیا تھا اور ضد کر کے اس کے ساتھ ہو گئیں۔ تعجب کی بات یہ تھی کہ ملک کے کسی بیٹے نے سرائے سالی جانے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ انہوں نے ہرات میں ٹھہرنے کو ترجیح دی اور باپ کو تنہا تیمور کے ساتھ بھیج دیا۔

امیر قزغن نے اپنے سرداروں کے ساتھ سرائے سالی سے ایک میل آگے بڑھ کر تیمور کا استقبال کیا۔ جہاں تک نظر جاتی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ استقبال کرنے والوں میں حاجی برلاس اور بایزید جلائر بھی تھے لیکن انہیں تیمور کا یہ عروج ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔

تیمور اور ملک معزالدین کے گھوڑے، لشکر کے آگے آگے تھے۔ ملک معزالدین کے ساتھ ہرات سے آنے والا واحد مرد ہرات کا قاضی سیف الملک تھا۔ اس نے تیمور سے ملک کے ساتھ جانے کی اجازت لے لی تھی۔

امیر قزغن کے قریب پہنچ کر تیمور اور ملک معزالدین گھوڑوں سے اتر پڑے۔ امیر قزغن نے آگے بڑھ کر فرط محبت سے تیمور کو گلے لگایا اور اس کی پیشانی کے کئی بوسے لئے۔

والئ ہرات ملک معزالدین سر جھکائے چپ چاپ کھڑا تھا۔ اس وقت قاضی سیف الملوک آگے آئے۔ انہوں نے والئ ہرات کی کمر میں لگی ہوئی تلوار اتار کر اسے بوسہ دیتے ہوئے امیر قزغن کے قدموں میں رکھ دی۔ یہ اطاعت اور فرمانبرداری کے اظہار کا روایتی طریقہ تھا۔

امیر نے معنی خیز انداز میں تیمور کی طرف دیکھا۔ تیمور نے کسی خاص ردِعمل کا اظہار نہیں کیا جس کا مطلب تھا کہ امیر قزغن چاہے تو والئ ہرات کو معاف کر دے ورنہ اس کی تلوار سے اسے قتل کر دے۔ امیر قزغن کچھ دیر اپنی اکلوتی آنکھ بند کیے سوچتا رہا۔ پھر اس نے تیمور کو تلوار اٹھانے کا اشارہ کیا۔

تیمور کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ امیر قزغن نے دشمن کی تلوار کو ہاتھ نہیں لگایا تھا یعنی اس نے ملک معزالدین کو تلوار واپس کر کے اسے معاف کر دیا تھا۔ تیمور نے فوراً وہ تلوار زمین سے اٹھائی اور امیر قزغن کے سامنے کر دی۔ امیر قزغن نے تلوار کو چھو لیا۔ یہ قبول اطاعت کی مزید تصدیق تھی۔ تیمور نے تلوار قاضی صاحب کے حوالے کر دی۔ قاضی نے تلوار کو اس جگہ سے چوما جہاں امیر قزغن نے ہاتھ لگایا تھا۔ یہی عمل ملک معزالدین حسین نے دہرایا۔ قاضی نے تلوار ملک معزالدین کی کمر میں دوبارہ لگا دی۔ اس طرح سمرقند اور ہرات کی دشمنی ختم ہو گئی۔ اور ملک معزالدین کو شاہی مہمان کا درجہ حاصل ہو گیا۔

اس رسم کی ادائیگی کے بعد یہ سب لوگ جلوس کی شکل میں سرائے سالی کی طرف چل دیے۔ اس موقع کے لیے شمال کے کوہستانی قبائل

نے تیمور کی شان میں نغمے اور گیت موزوں کیے تھے جنہیں وہ جھانجر اور تاشے کی آواز کے ساتھ لہک لہک کرگانے لگے۔

عوام کا یہ خلوص اور محبت دیکھ کر تیمور کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔لوگ اس سے ملنے اور اس کے ہاتھ چومنے کے لیے ٹوٹے پڑتے تھے۔مجبور ہوکر اس نے سواری چھوڑ دی اور اپنے شیدائیوں کے ساتھ پیدل چلتا ہوا سرائے سالی تک آیا۔

امیر قزغن نے والیٔ ہرات کو معاف کر کے جس فراخدلی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا تھا اس سے سب ہی خوش تھے سوائے چندان امیروں کے جو تیمور کے ساتھ ہراتیوں سے نبرد آزما ہوئے تھے۔عام تاتاریوں کے نزدیک لڑائی کا مقصد لوٹ مار اور دولت اکٹھا کرنا ہوتا تھا۔ایسے خیالات رکھنے والے بعض امیر تیمور کے لشکر میں بھی تھے۔اس میں شک نہیں کہ وہ ہرات کے خلاف بڑی جانبازی اور بے جگری سے لڑے تھے لیکن جنگ کے بعد صلح ہوجائے تو اس کی پابندی فرض ہوجاتی ہے۔امیر تیمور نے ہرات میں لوٹ مار کی ممانعت کردی تھی اس لیے ان امیروں کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا اور اب امیر قزغن نے والیٔ ہرات کو معافی دے دی تھی۔اس کا مطلب تھا کہ ہرات کی حکومت سے تاوانِ جنگ بھی نہیں لیا جائے گا۔

بدظن امیروں نے رات کی ضیافت پر اس کا برملا اظہار بھی کیا۔کھانے کے بعد ان میں سے ایک امیر نے امیر قزغن سے کہا۔

''اے امیر! ہرات پر فوج کشی کرنے سے ہمیں کیا حاصل ہوا۔میدان میں ہمارے کتنے ہی آدمی کام آگئے لیکن آپ نے والیٔ ہرات کو معاف کر کے اس سے تاوانِ جنگ کا بھی مطالبہ نہیں کیا۔''

دوسرے امیر کا لہجہ تلخ تھا۔

''والیٔ ہرات کا سر قلم کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرنا چاہیے۔''

بولنے والوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔

''ہرات سے زیادہ کوئی ریاست دولت مند نہیں۔ہرات کی تمام دولت لشکر میں تقسیم ہونی چاہیے۔''

تیسرے نے کہا۔

والیٔ ہرات ملک معزالدین حسین اور اس کا قاضی بھی اس دعوت میں شریک تھے۔انہوں نے امیروں کے تیور بگڑے دیکھے تو سمجھے کہ اب جان کی خیر نہیں۔

تیمور معزز مہمانوں میں موجود اپنے لالچی امیروں کی اس چھچھوری حرکت سے مارے شرم کے پانی پانی ہوا جارہا تھا اسے غصہ بھی بہت آیا تھا۔اگر امیر قزغن موجود نہ ہوتا تو تیمور بے دھڑک ایسے تمام لوگوں کی گردنیں اڑا دیتا۔

امیر قزغن بھی بڑی ندامت مگر تحمل سے امیروں کی باتیں سن رہا تھا۔کچھ اور امیروں نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔والیٔ ہرات کا سر قلم کرنے کا مطالبہ کیا اور ہرات کی دولت پر اپنا حق جتایا۔

جب سب اپنی اپنی بولیاں بول کر چپ ہوئے تو امیر قزغن نے حاضرین پر ایک نظر ڈالی اور شیر کی طرح گرج کر بولا۔

''کسی کو کچھ اور بھی کہنا ہے۔''

امیر کا لہجہ اتنا تند و تیز تھا کہ لالچی امیر لرز گئے۔ سب کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ کسی نے مزید بولنے کی ہمت نہ کی۔ اس قدر گہری خاموشی طاری ہوئی جیسے وہاں کوئی متنفس سرے سے موجود ہی نہ ہو۔ لوگوں نے جیسے اپنی سانسیں تک روک لی تھیں۔ امیر قزغن اسی کڑک دار لہجے میں بولا۔

''تم لوگ لالچی اور احسان فراموش ہو۔ تم وہ دن بھول گئے جب تم بلادِ شمال کے چنگیزی خانِ اعظم کے غلام تھے۔ تم اس کے تلوے چاٹتے تھے اور وہ تمہیں کتوں کی طرح دھتکارتا تھا۔ میں نے تم میں اتفاق پیدا کیا۔ تمہیں ایک جھنڈے کے نیچے اکٹھا کیا اور تمہارے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال کر خانِ اعظم سے ٹکرا گیا کہ میرے جسم پر زخموں کے ستر نشان ہیں۔ میری آنکھ جنگِ آزادی میں ضائع ہوگئی۔ میں نے تمہیں آزادی دلائی۔ تمہارا وقار بلند کیا۔ اور اس کا صلہ تم یہ دے رہے ہو کہ دشمن کے سامنے مجھے ذلیل کر رہے ہو۔ تم نے مجھے سمرقند اور تمام قبائل کا سردار تسلیم کیا ہے پھر مجھ سے اختلاف کیوں۔ میرے فیصلے کے خلاف تم نے آواز بلند کرنے کی کیسے جرأت کی۔ یاد رکھو ہر جنگ دولت کے لیے نہیں لڑی جاتی۔ بعض لڑائیاں عزت اور وقار کے لیے بھی لڑنا پڑتی ہیں۔ میں نے والئ ہرات کو معاف کر کے دشمنی کا وہ ناسور بند کیا ہے جو ہماری جنوبی اور مشرقی سرحدوں کے باشندوں کو کھائے رہا تھا۔ دشمن اگر دوستی کا خواہاں ہو تو اس سے انکار کرنا مصلحت کے سراسر خلاف ہے۔''

فتنہ بظاہر دب گیا۔ کسی نے امیر قزغن کو جواب دینے کی جرأت نہیں کی امیر قزغن دل میں خوش تھا کہ اس بڑھاپے میں بھی تاتاری امیروں اور سرداروں پر اس کا رعب و دبدبہ اب تک طاری ہے لیکن تیمور کی چھٹی حس تیزی سے کام کر رہی تھی۔ اس نے امیروں کے تیور دیکھ کر اندازہ لگا لیا کہ آج کی یہ چنگاری کسی وقت بھڑک کر شعلہ بھی بن سکتی ہے۔

اس نے موقع پا کر امیر قزغن سے کہا۔

''اے امیر! مجھے بکھرے ہوئے برلاس قبائل کی قیادت سنبھالنے کی اجازت دی جائے۔''

''ابھی کیا جلدی ہے؟''

امیر قزغن نے قدرے ناگواری سے جواب دیا۔

''ایک نہ ایک دن تم ہی ان کے سردار ہو گے۔''

تاتاریوں میں عبداللہ اور تمور یا تیمور نام بہت عام تھے۔ ہر قبیلے میں یہ نام کئی کئی آدمیوں کے ہوتے۔ بلادِ شمال کے چغتائی خانِ اعظم کا نام تغلق تمور خان تھا۔ تیمور کے دو چھوٹے سرداروں کے نام عبداللہ تھے۔ امیر قزغن کے چھوٹے بیٹے کا نام بھی عبداللہ ہی تھا۔ عبداللہ امیر قزغن کی بڑھاپے کی اولاد تھی۔ اس نے بڑی شکیل و جمیل صورت پائی تھی۔ عورتیں اسے یوسفِ ثانی کہتیں اور کنواریاں اسے دیکھ کر آہیں بھرتیں۔ عبداللہ کے رنگ ڈھنگ بچپن ہی سے نرالے تھے۔ اسے تلوار کے بجائے ساز پسند تھے۔ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنا اس کے لیے ایک تکلیف دہ بات تھی۔

امیر قزغن نے اس کے بچپن کی شوخیاں تو کسی نہ کسی طرح برداشت کر لیں لیکن جب اس نے جوانی میں قدم رکھا اور اس کے طور طریقوں میں تاتاری شان نہ پیدا ہوئی تو امیر قزغن کے کان کھڑے ہوئے۔ عبداللہ ہی اس کی امیدوں کا چراغ تھا۔ امیر کا بڑا بیٹا عرصہ ہوا مر چکا تھا اور پوتا یعنی الجائی خاتون کا بھائی علی حسین دور کابل میں ایک چھوٹے سے علاقے کا حاکم تھا۔ امیر قزغن عبداللہ کو اپنا ولی عہد نامزد کرنا چاہتا تھا لیکن عبداللہ کو شراب و

کباب اور شاہدانِ بازاری کی صحبتیں پسند تھیں۔ اس کی نظریں حسین چہروں کا جائزہ لیتیں اور اسے رموزِ مملکت یا امورِ سلطنت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ایک روز امیر قزغن نے اپنے بیٹے کو سمجھایا۔

''عبداللہ! وہی ہاتھ عنانِ حکومت سنبھال سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہو۔''

''ابھی میری عمر ہی کیا ہے .... صرف اٹھارہ سال۔''

عبداللہ نے ہنس کر جواب دیا۔

''اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے۔ میں ابھی سے حکومت کی فکر کیوں کروں؟''

امیر قزغن دل مسوس کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ عبداللہ سے کہے کہ اٹھارہ سال کی عمر میں توطراخائی خان کے بیٹے تیمور نے فاتحِ ہرات کا خطاب حاصل کر لیا ہے مگر وہ یہ نہ کہہ سکا بلکہ اس نے اسے بڑی نرمی سے سمجھایا۔

''تو جوان ہو گیا ہے۔ چھوٹی موٹی جنگوں میں حصہ لیا کر۔ میری زندگی کا کیا بھروسہ قبر میں پیر ہیں آج مرا کل دوسرا دن۔''

اسی وقت ایک چنچل اور شوخ ادا کنیز اٹھلاتی ہوئی شہزادے کے پاس آ کر بولی۔

''شہزادے محفل تیار ہے۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔''

شہزادہ باپ کو جواب دیے بغیر کنیز کا ہاتھ تھام کر اٹھ کھڑا ہوا اور یونہی ہاتھ پکڑے ہوئے اس فتنۂ قیامت کے ساتھ چلا گیا۔ امیر قزغن اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ پھر وہ غصے میں پیر پٹختا ہوا اٹھ گیا۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ آئندہ شہزادے کے محل میں کبھی نہیں آئے گا۔

سرائے سالی ایک کچا قلعہ تھا لیکن شہزادے نے اس کے ایک حصے میں اپنے لیے ایک عالی شان محل بنوایا تھا۔ آخر عبداللہ، حاکم سمرقند کا بیٹا تھا۔ اس کا حکم ہر جگہ چلتا تھا۔ اس کے کہنے پر اس محل کو نادر اور نایاب چیزوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ قالینوں کا فرش۔ ریشمی، گنگا جمنی ظروف۔ غرض یہ کہ آرائش کا ہر سامان موجود تھا۔ سب سے بڑھ کر اس محل کے حسن کو چار چاند لگانے والا ان ماہ لقا، دل ربا کنیزوں کا ہاتھ تھا جو اس کے حواریوں اور خوشامدیوں نے اس محل میں جمع کر دیا تھا۔ ہر شہر اور ہر قبیلے کی حسین ترین کنیز اس طائفے میں موجود تھی۔ یہ کنیزیں ہنستی اور اٹھکھیلیاں کرتی جس سمت سے گزرتیں، یوں معلوم ہوتا جیسے پریاں محو پرواز ہیں۔ کنیزیں پریاں تھیں اور عبداللہ راجہ اندر .... رات دن رقص و سرور کی محفلیں جمتیں۔ نقرئی قہقہوں سے فضا گونجتی رہتی۔ قزغن شراب نہیں پیتا تھا اور نہ ہی اس کے دربار میں کسی کو شراب پینے کی اجازت تھی لیکن عبداللہ کو کون روکتا اور اس کا ہاتھ کون پکڑتا۔ وہ تو مستقبل کا متوقع حاکم سمرقند تھا۔

عبداللہ کے اطوار بگاڑنے میں تاتاری قبائل کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ ہر قبیلے کا سردار امیر قزغن کے بعد خود کو وارث سمجھتا تھا۔ انہیں اگر خطرہ تھا تو صرف عبداللہ سے .... اس لیے ان کی اجتماعی کوشش تھی کہ کمسن شہزادے کو امورِ سلطنت اور میدانِ جنگ سے جس قدر دور رکھا جائے اتنا ہی بہتر ہے عبداللہ کو رنگ رلیاں منانے کی کھلی چھٹی ایک گہری سازش کے تحت دی گئی تھی۔ عبداللہ کے کارندے شمال سے جنوب اور مشرق سے جنوب تمام تاتاری علاقوں میں گھومتے پھرتے اور جہاں بھی انہیں کوئی حسین دوشیزہ دکھائی دیتی وہ اسے زبردستی اٹھا لیتے۔ اس قسم کے واقعے جب

مختلف علاقوں میں پیش آتے اور غریب والدین قبیلے کے سردار کے پاس شکایت لے کر جاتے تو متعلقہ سردار اس کا تدارک کرنے یا امیر قزغن کو اس ظلم اور زیادتی کی خبر پہنچانے کے بجائے کچھ لے دے کر مغویہ کے والدین کو خاموش کر دیتے۔

امیر قزغن کو بیٹے کی بے راہ روی اور عیاشیوں کا تو علم تھا لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ عبداللہ نے کنواری لڑکیوں کو ان کے گھروں سے اٹھوانے کا انتظام بھی کر رکھا ہے۔

ظلم اور زیادتی زیادہ دنوں تک نہیں چلا کرتی اور اس کا پردہ ایک نہ ایک دن فاش ہو کر رہتا ہے۔ اسی دوران ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے نہ صرف امیر کو عبداللہ کی طرف سے بالکل مایوس کر دیا بلکہ اس کے وقار کو بھی سخت دھچکا پہنچایا۔

والی ہرات کے ساتھ ملکوتی اور اس کی والدہ بھی سرائے سالی آئی تھی۔ عبداللہ نے اس کی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اس کا وطن بلخ دکھائے گا اور اگر ممکن ہو سکا تو قبیلہ اوجائی یونانی کے سردار سلووز سے بھی اس کی ملاقات کرائے گا۔ سلووز ملکوتی کی والدہ کا دیور تھا۔ ہر چند کہ سلووز نے ملکوتی کی ماں پر بڑا ظلم کیا تھا اور سرداری کے لالچ میں آ کر اسے بلخ سے ہجرت کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن اس بات کو اب تک زمانہ گزر چکا تھا اور نفرت کے جذبات ٹھنڈے پڑ چکے تھے۔

عبداللہ نے ملکوتی کی ماں کو یہ بھی بتایا تھا کہ سلووز اپنے کیے پر نادم ہے اور اب گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس لیے بھی ملکوتی کی ماں کے دل میں سلووز سے ملنے کی خواہش پیدا ہو گئی تھی۔ عبداللہ ملکوتی کا شوہر تھا اس نے سردار تیمور کو ملکوتی اور اس کی والدہ کے بارے میں تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔

تیمور کے دل میں اس بزرگ تاتاری خاتون کا بڑا احترام تھا۔ اس کی بھی خواہش تھی کہ دیور اور بھاوج کو جلد از جلد ملا کر ان کے درمیان صلح وصفائی کرادی جائے لیکن والیٔ ہرات ابھی تک امیر قزغن کا مہمان تھا اور بعض امیروں کے منہ اب تک ٹیڑھے تھے لہٰذا اس نے عبداللہ کی بات فوراً مان لی اور وعدہ کیا کہ والیٔ ہرات کے واپس جاتے ہی نہ صرف ان دونوں کی ملاقات کا بندوبست کر دے گا بلکہ خود ان کے ساتھ ہی جائے گا۔

والیٔ ہرات ملک معزالدین حسین کی مہمانداری کچھ زیادہ ہی طویل ہو گئی اور تیمور نے دیکھا کہ والیٔ ہرات کی واپسی کا مسئلہ ابھی کھٹائی میں پڑا ہے تو اس نے عبداللہ کو بلخ جانے کی اجازت دے دی۔ ملکوتی اپنی بیمار ماں کو تنہا کیسے سفر کرنے دیتی۔ وہ بھی ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی۔ عبداللہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا وہ تو دل سے یہی چاہتا تھا۔

ملکوتی شہسواری اور شمشیر زنی سے بھی واقف تھی۔ ملکوتی کی ماں کو ایک ہی گاڑی میں بٹھایا گیا۔ عبداللہ نے ملکوتی کو بھی گاڑی میں بیٹھ کر سفر کرنے پر آمادہ کرنا چاہا مگر وہ نہ مانی اور الگ گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ سفر شروع ہوا۔ عبداللہ اور ملکوتی گھوڑے سے گھوڑا ملائے آگے آگے چل رہے تھے۔ یہ لوگ دوپہر کو چلے تھے رات ہوئی تو ایک سرائے میں قیام کیا۔

تیمور نے عبداللہ سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے تو اپنے ساتھ دوسو سواروں کو بھی لے جائے مگر عبداللہ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ اپنا ملک اور دیکھے بھالے راستے تھے پھر ڈر کس بات کا۔ اور وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی تنہائی میں کوئی مخل ہو۔ عبداللہ کی اس غلط سوچ نے

بالآخر سے ایک ناگہانی مصیبت میں مبتلا کر دیا۔

رات خیریت سے گزر گئی۔

صبح کو گاڑی تیار کی گئی۔ ملکوتی کی ماں کو اس میں سوار کیا گیا۔ عبداللہ اور ملکوتی اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر گاڑی کے آگے آگے چلنے لگے۔

یہ لوگ ابھی سرائے سے سو گز دور نہیں گئے تھے کہ پندرہ سوار گھوڑے اڑاتے سامنے سے آتے دکھائی دیے وہ سب کے سب مسلح اور پلے ہوئے سانڈوں کی طرح موٹے تازہ تھے۔ انہوں نے آتے ہی عبداللہ اور ملکوتی کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ خطرہ محسوس کرتے ہی عبداللہ اور ملکوتی نے تلواریں نکال لیں۔ سواروں کا سردار گھوڑا بڑھا کر عبداللہ کے پاس آیا اور تحکمانہ لہجے میں بولا۔

''یہ لڑکی کون ہے؟''

اس کا اشارہ ملکوتی کی طرف تھا۔

''تو پوچھنے والا کون ہوتا ہے؟'' عبداللہ نے بھی اسی سختی سے کہا۔

سردار ایک مکروہ قہقہہ لگا کر بولا۔

''میں شہزادہ عبداللہ ولی عہد سمرقند کے محافظ دستے کا سردار ہوں۔ اگر مجھے نہیں جانتا تو یقیناً تاتاری نہیں تو کوئی کافر کا بچہ ہے۔''

عبداللہ کو غصہ آ گیا۔ کڑک کر جواب دیا۔

منہ سنبھال کر بول۔ ورنہ تیری زبان کھینچ لوں گا۔ تو عبداللہ کے محافظ دستے کا سردار ہے تو میں بھی فاتح ہرات امیر تیمور کی فوج کا رسالدار ہوں۔''

تیمور کے نام پر سردار چونک پڑا۔ وہ کچھ دیر عبداللہ کو گھورتا رہا۔ پھر بولا۔

''لیکن یہ لڑکی کون ہے اور تو اس کو کہاں سے بھگا کر لایا ہے۔''

ملکوتی کو سردار کی بات بہت ناگوار گزری۔ اس نے چیخ کر کہا۔

''تو کیوں بکواس کر رہا ہے۔ مجھ سے پوچھ میں اس کی بیوی ہوں۔

''میں کیسے یقین کر لوں کہ تو اس کی بیوی ہے۔''

اس وقت ملکوتی کی ماں نے دخل دیا۔ گاڑی سے گردن نکال کر بولی۔

''بھائی کیوں الجھ رہا ہے۔ میں بلخ کے سردار کی بھاوج ہوں۔ سردار سلووز سے ملنے جا رہی ہوں۔ یہ میری بیٹی ملکوتی ہے۔''

سردار نے ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔

''اتنی حسین لڑکی کی جگہ تو ہمارے شہزادے کی حرم سرا ہے۔ یہ ایک معمولی رسالدار کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے۔''

یہ کہہ کر وہ ملکوتی کی طرف بڑھا۔

ملکوتی کے ہاتھ میں تلوار تھی۔ اس نے سردار پر بھرپور وار کیا۔ وار جلدی میں کیا گیا تھا۔ ملکوتی کی تلوار سردار پر پڑنے کی بجائے اس کے گھوڑے پر پڑی اور زخمی گھوڑا سردار کو دور بھگا لے گیا۔

شہزادے کے یہ محافظ دراصل اس گروہ سے تعلق رکھتے تھے جنہیں شہزادے نے لڑکیاں پکڑنے کے لیے مقرر کیا تھا یہ لوگ بھوکے بھیڑیوں کی طرح شہر شہر منڈلاتے رہتے اور جو غریب اور بے کس لڑکی ہتھے چڑھ جاتی اسے اٹھالاتے تھے۔

سردار نے اپنے سواروں کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ سواران دونوں پر پل پڑے۔ شمشیر چلانا صرف عبداللہ جانتا تھا۔ چلتے وقت اس نے اپنی کمان بھی ساتھ نہیں لی تھی۔ ملکوتی کو تلوار چلانا بس واجبی سی آتی تھی۔ دس پندرہ منٹ کی لڑائی میں عبداللہ کو کئی زخم آ گئے اور ملکوتی کو پکڑ لیا گیا۔

ملکوتی کی ماں چیختی چلاتی رہ گئی۔ سوار ملکوتی کو لے کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ عبداللہ نے ان کا پیچھا کرنا چاہا مگر وہ زخموں سے چور تھا اس لیے غش کھا گیا۔

ایک سرائے سامنے ہی تھی اگر سرائے والے ہمت کرتے تو وہاں پندرہ بیس آدمی موجود تھے جو عبداللہ کی مدد کو آ سکتے تھے لیکن وہ ان درندہ صفت شکاریوں سے واقف تھے۔ سب لوگ سرائے میں دبکے بیٹھے رہے۔ کسی نے باہر آنے کی ہمت نہ کی۔

عبداللہ بے ہوش ہو کر کاٹھی سے لٹک گیا۔ چیختے چیختے ملکوتی کی ماں کا گلا دکھ گیا۔ سوار ملکوتی کو لے کر دور نکل گئے تو سرائے والوں کو کچھ رحم آیا اور وہ ایک ایک کر کے گاڑی کے پاس آئے۔ عبداللہ کو کاٹھی سے جدا کر کے اس پر پانی کے چھینٹے ڈالے۔ اسے ہوش آیا تو اس نے ملکوتی کے بارے میں پوچھا۔ لوگوں نے بتایا کہ ملکوتی کو شہزادے عبداللہ کے سوار لے گئے ہیں۔ ان درندوں سے اسے بچانا واپس لانا ممکن نہیں ہے۔ عبداللہ اور ملکوتی کی ماں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یکایک عبداللہ کو کچھ خیال آیا۔ اس نے سرائے والوں سے کہا۔

''بھائیو!...... میں جانتا ہوں تم شہزادے عبداللہ سے ڈرتے ہو میں نہیں چاہتا کہ تم اس کی مخالفت مول لو لیکن اگر تمہارے دل میں ذرا بھی انسانی ہمدردی ہے تو میرا ایک کام کر دو۔''

''ان سے لڑنے کے علاوہ اور کوئی خدمت ہو تو کہو میں آمادہ ہوں۔'' ایک آدمی ہمت کر کے بولا۔

عبداللہ نے کہا۔

''بھائی صرف اتنا کرو کہ ایک آدمی سرائے سالی چلا جائے وہاں میرا آقا تیمور موجود ہے اس سے جا کر صرف یہ کہہ دے کہ اس کے رسالدار عبداللہ پر راستے میں قیامت ٹوٹی ہے۔ ہرات کی شہزادی ملکوتی کو شہزادے کے آدمی زبردستی لے گئے ہیں۔ اس کی جان اور عزت کی حفاظت کی جائے۔''

تیمور کا نام سن کر کئی آدمی سرائے سالی جانے پر آمادہ ہو گئے۔ تیمور فاتح ہرات تھا۔ اس کا نام دور دور تک مشہور ہو گیا تھا اور لوگ اس سے غائبانہ طور پر محبت کرنے لگے تھے۔ ان میں سے دو آدمی سرائے سے گھوڑے لے کر آ گئے۔ اور سرائے سالی جانے کے لیے تیار ہو گئے۔

عبداللہ نے ان سے کہا۔

''بھائیو! اگر ممکن ہو تو کسی ایسے راستے سے جاؤ کہ ان کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی میرے آقا کو یہ خبر پہنچ جائے تا کہ وہ شہزادی کی حفاظت کر سکیں۔''

''میں ایسا راستہ جانتا ہوں۔''

ایک سوار نے کہا اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ دوسرا سوار بھی اس کے ساتھ ہولیا۔ دونوں سوار سرائے سالی کی طرف روانہ ہو گئے۔ باقی لوگوں نے عبداللہ اور بڑی بی کو سنبھالا۔ انہیں سرائے میں لائے اور عبداللہ کی مرہم پٹی کرائی گئی۔ ملکوتی کی ماں غموں سے پہلے ہی نڈھال تھی۔ اس تازہ غم نے اس کی حالت بالکل غیر کر دی۔

عبداللہ خدا سے دُعا کرتا رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر تیمور کو بروقت خبر ہو گئی تو کوئی ملکوتی کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ تیمور ملکوتی کو ظالموں کے پنجے سے ضرور چھڑالے گا خواہ اسے اس سلسلے میں امیر قزغن سے ہی کیوں نہ جنگ کرنی پڑے۔

جس وقت تیمور کو عبداللہ کے حادثے کی خبر ملی وہ اپنی بیوی الجائی خاتون کو سرائے سالی سے شہر سبز واپس بھیج رہا تھا۔ تیمور کو بہت کم غصہ آتا تھا اور جب آتا تھا تو وہ خود بھی اس پر قابو نہ رکھ پاتا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ہونٹ پھڑکنے لگے۔ وہ جلدی سے خیمے میں گیا۔ ڈھال بازو پر چڑھائی۔ کمان کندھے پر لٹکائی۔ تلوار نکالی۔ نیام خیمے میں ہی پھینک دی۔

الجائی خاتون کانپنے لگی۔ وہ جانتی تھی کہ تیمور کی یہ حالت' قیامت کا شاخسانہ ہے۔ نہ معلوم آج کتنے سر قلم ہوں گے اور کتنا خون بہے گا۔

تیمور نے بیوی کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ بڑھ کر گھوڑے پر بیٹھا۔ قاصدوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ الجائی خاتون نے سفر ملتوی کر دیا۔

تیمور دونوں قاصدوں کے ساتھ سرائے سالی کے اس حصے کی طرف بڑھا جہاں امیر قزغن کے رنگین مزاج بیٹے شہزادے عبداللہ نے اپنی عشرت گاہ تعمیر کی ہوئی تھی۔

تیمور سرائے سالی کے حالات سے زیادہ واقف نہ تھا اور نہ ہی اس نے عبداللہ کو اب تک دیکھا تھا اسے معلوم ہوا تھا کہ عبداللہ کمسن ہے۔ کمسن کی عمر اس کے ذہن میں دس گیارہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ لیکن قاصد نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ اس کے عشرت کدوں میں چھپی ہوئی تمام داستانیں بے نقاب کر دیں۔

تیمور' عبداللہ کے محل پہنچ کر اندر جانے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ وہ سوار دور سے آتے دکھائی دیے جو ملکوتی کو لا رہے تھے۔ ایک سوار نے زبردستی ملکوتی کو اپنے آگے بٹھا رکھا تھا۔ ملکوتی کو اس حالت میں دیکھ کر تیمور کی جو کیفیت ہوئی اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔

ملکوتی نے تیمور کو دیکھا تو اس کے آنسو نکل آئے۔ تیمور نے کمان کاندھے سے کھینچی اور پھریوں محسوس ہوا جیسے تیر خود بخود اس میں آ کر جڑ گیا ہے۔ شائیں کی آواز پیدا ہوئی اور تیر اس سوار کی پیشانی میں پیوست ہو گیا جو ملکوتی کو پکڑے ہوئے تھا۔

تیمور کی تیر اندازی کا کمال تھا کہ ملکوتی سوار کے آگے بیٹھی تھی۔ اس کا سر' سوار کے سر سے صرف چھ انچ نیچے تھا اور سوار کی پیشانی صرف تین انچ اوپر تھی لیکن تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا اور سوار لڑکھڑا کر جھول گیا۔

باقی سواروں نے تیمور کو گھیرنے کی کوشش کی لیکن وہ تو چھلاوا اور شعلہ تھا جو کبھی ادھر بھڑکتا تو کبھی ادھر ان کے لیے تو جو کچھ بھی تھا وہ شہزادہ عبداللہ تھا جو ان کا ان داتا اور مالک تھا۔ اسی کے اشارے پر وہ اودھم مچاتے تھے اور دندناتے پھرتے تھے۔ تیمور کے پاس نیام نہ تھی۔ تیر چلاتے وقت اس نے تلوار دانتوں میں دبالی تھی سوار اس کے قریب پہنچ گئے تو تیمور نے کمان کاندھے پر ڈالی اور تلوار لے کر ان پر ٹوٹ پڑا۔ چند ہی لمحوں میں سات سوار اس کی تلوار کا لقمہ بن گئے۔ پانچ گھوڑے گھما کر بھاگ کھڑے ہوئے اور تین گھوڑے چھوڑ کر محل میں گھس گئے۔

تیمور خون آلود تلوار لیے ان کے تعاقب میں محل میں داخل ہو گیا۔ کنیزوں اور غلاموں میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک کمرے میں محفلِ عیش جمی ہوئی تھی۔ ساز چھڑے ہوئے تھے اور نازک اندام لونڈیاں ساقی گری کر رہی تھیں اور رقاصائیں محوِ رقص تھیں۔ شہزادہ عبداللہ ساغر ہاتھ میں لیے ان کے درمیان راجہ اندر بنا بیٹھا تھا۔ اس نے جو شور وغل سنا تو گھبرا کر کمرے میں سے نکل آیا۔

سامنے' تیمور بھاگنے والے تینوں سواروں کو گھیرے ہوئے تھا۔ سوار اپنی جانیں بچانے کے لیے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ جدھر وہ جاتے تیمور کو سدِ راہ پاتے۔ ان میں سے ایک مارا گیا۔ پھر دوسرا اور پھر آخری سوار کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

شہزادہ عبداللہ نے یہ منظر دیکھا تو حواس باختہ ہو گیا۔ سواروں کو ختم کرنے کے بعد تیمور نے عبداللہ کا رخ کیا تو اس کا جسم اور ہاتھ کانپنے لگے۔ ساغر فرش پر گر کر چور چور ہو گیا اور اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد نظر آنے لگا۔ تیمور' خون آلود تلوار لیے عبداللہ کے قریب پہنچ گیا۔ لباس اور وضع قطع سے تیمور کو شہزادہ کو پہچاننے میں کوئی دقت نہ ہوئی۔

تیمور اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''تم ہو عبداللہ۔ امیر قزغن کے بیٹے۔''

دہشت کی وجہ سے عبداللہ کی آواز نہ نکلی۔ وہ صرف اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

تیمور گرجا۔

''ڈوب مرو چلو بھر پانی میں۔ جس کے باپ کی تلوار' تمام تاتاری سرداروں کو دبائے ہوئے ہے اس کے بیٹے کے ہاتھ میں شراب کا پیالہ۔ لعنت ہے تمہاری بدکاریوں پر۔''

عبداللہ خوف سے کانپتا رہا۔ اس کے منہ سے آواز بھی نہ نکل سکی۔ محل کی کنیزیں کمروں کے روزنوں سے باہر جھانک رہی تھیں۔ سرخی اور غازہ میں لتھڑے ہوئے رقاصاؤں کے چہرے پسینے سے تر ہو کر تمام رنگ گڈمڈ ہو گئے تھے۔ سب کو اپنی اپنی جان کی فکر تھی۔

''اگر تم میرے آقا امیر قزغن کے بیٹے نہ ہوتے تو میں تمہارا سر بھی اسی طرح قلم کر دیتا جیسے میں نے تمہارے پندرہ سواروں کے کیے ہیں افسوس وہ شہزادہ جسے تیروں کی بارش میں مسکرانا چاہیے وہ اپنی جوانی چنگ و رباب کے تاروں میں ڈھال رہا ہے۔ عبداللہ تم امیر قزغن کے ماتھے کا کلنک ہو۔ تاتاریوں کی بہادری اور شجاعت پر ایک بدنما دھبہ ہو۔''

تیمور گرج رہا تھا۔

شہزادہ عبداللہ' تیمور سے پہلے کبھی نہیں ملا تھا لیکن اس نے اس بہادر سردار کے قصے ضرور سن رکھے تھے۔ تیمور جس وقت تلوار سونتے محل میں داخل ہوا تھا اس وقت ہر طرف تیمور۔ تیمور کا شور بلند ہو رہا تھا۔

عبداللہ نے تیمور کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ یہ شخص سوائے تیمور کے اور کوئی نہیں ہو سکتا ورنہ اس محل میں داخل ہوتا تو کجا لوگ وہاں سے کترا کر نکلا کرتے تھے۔

عبداللہ نے بڑی عاجزی سے کہا۔

''بہادر تیمور! مجھے معاف کر دو۔ میں واقعی بہت بُرا ہوں۔''

''اگر تم اپنے کیئے پر نادم ہو تو ان تمام لڑکیوں کو آزاد کر دو جنہیں تمہارے آدمیوں نے زبردستی حاصل کر کے اس محل میں قید کر رکھا ہے۔ وہ غریب رعیت کی بیٹیاں ہیں لیکن وہ بھی اسی طرح عزت دار اور شریف ہیں جس طرح ہماری اور تمہاری بہنیں اور بیٹیاں۔''

عبداللہ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ سر جھکا کر بولا۔

''تمہارے حکم کی تعمیل ہوگی۔ شام ہونے تک تمام لڑکیاں آزاد کر کے ان کے گھروں کو بھیج دی جائیں گی۔''

عبداللہ نے اس پر عمل بھی کیا۔ اس نے تمام لڑکیوں کو بلا کر ان کے گھروں کے پتے پوچھے اور پھر غروب آفتاب سے قبل ہی تمام لڑکیاں' عبداللہ کے محل کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ گئیں۔

تیمور وہاں سے نکل کر باہر آیا تو دو قاصد اور ملکوتی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ تیمور انہیں ساتھ لے کر اپنے خیمے میں آیا۔ الجائی خاتون ڈری سہی اُب تک اس جگہ موجود تھی جہاں تیمور اسے چھوڑ گیا تھا۔ الجائی خاتون کو دیکھ کر تیمور کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تو الجائی خاتون بھی کھل اٹھی۔

تیمور نے اپنے سوار ملکوتی اور قاصدوں کے ساتھ کر دیے اور عبداللہ کو پیغام دیا کہ وہ سفر جاری رکھے اور ملکوتی کی ماں کو بلخ تک ضرور لے کر جائے۔ ملکوتی' تیمور کا شکریہ ادا کر کے واپس چلی گئی تو تیمور نے الجائی خاتون کو اس حادثے کی تفصیل بتائی جو ملکوتی اور عبداللہ پر گزرا تھا پھر وہ دونوں دیر تک شہزادے کی بے راہ روی پر افسوس کرتے رہے۔

الجائی خاتون شہر سبز واپس چلی گئی۔

کئی دن گزر گئے لیکن تیمور نے امیر قزغن سے اس واقعے کے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ پھر اس بات کو ایک زمانہ گزر گیا امیر قزغن نے نہ تو کبھی تیمور سے پوچھا اور نہ ہی تیمور نے اسے شہزادے کی ناشائستہ حرکتوں سے آگاہ کیا۔

امیر قزغن کا خیال تھا کہ اس کے مخالف امیروں کے جذبات وقت کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے پڑ جائیں گے اور والئ ہرات کے خلاف بھڑکتے ہوئے جذبات ختم ہو جائیں گے اسی لیے اس نے والئ ہرات کو اپنے پاس ٹھہرا رکھا تھا لیکن اس کا اندازہ غلط نکلا۔

باغی امیروں میں آہستہ آہستہ کھچڑی پکتی رہی اور نفرت کم ہونے کے بجائے بڑھتی چلی گئی۔ امیر قزغن نے ہرات جانے والے امیروں کو اپنی طرف سے کافی مال و زر سے نوازا مگر جو نفرت ان کے دل میں بیٹھ گئی تھی وہ نکل نہ سکی۔ اب تو اسے یہاں تک محسوس ہونے لگا۔ کہ یہ لوگ والئ

ہرات کی تاک میں ہیں اور موقع ملتے ہی اسے ختم کر دیں گے اسے مجبوراً والئ ہرات کی حفاظت کے انتظامات سخت کرنے پڑے۔ والئ ہرات کی زندگی اس کے وقار کا مسئلہ بن گئی تھی اور اس کی ذرا سی کوتاہی کوئی نیا فتنہ کھڑا کر سکتی تھی۔

امیر قزغن اپنے ایام سیر و شکار میں گزارا کرتا تھا۔ ہرات کے حملے کے وقت اس کا خیال تھا کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ تیمور کے قریب رہے گا تاکہ بوقتِ ضرورت اس کی مدد کر سکے پھر ہرات کا جھگڑا ختم ہونے کے بعد وہ شکار پر چلا جائے گا لیکن حالات نے کچھ اور ہی رخ اختیار کر لیا۔ تیمور نے اس کی امید سے بہت پہلے ہرات کا قصہ پاک کر دیا۔ اس فکر سے تو امیر قزغن کو چھٹکارا مل گیا لیکن شکار کا شوق پورا نہ ہو سکا۔ جس کے لیے وہ اب پہلے سے زیادہ بے چین تھا۔

ایک رات امیر قزغن نے تیمور کو اپنے پاس بلایا اور رازدانہ انداز میں بولا۔

''تیمور۔ تم ان سر پھرے امیروں کی حالت دیکھ رہے ہو۔''

''جی امیر محترم!...... مجھے تو یہ سب کچھ ایک عظیم خطرے کا پیش خیمہ نظر آتا ہے۔'' تیمور نے متانت سے کہا۔

اس وقت امیر قزغن حالات سے بے حد پریشان تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کا پورا رعب و دبدبہ محض ایک دھوکے کی ٹٹی یا ریت کی دیوار ہے۔ جوانی کے عالم میں تلوار کے زور پر جو عظمت حاصل کی تھی وہی اس کے کام آ رہی تھی ورنہ تو اب اس کے ہاتھ پیر شل ہو گئے تھے اور اس میں تاتاریوں کی کسی بغاوت کو کچلنے کی طاقت باقی نہ رہی تھی۔ ہر تاتاری سردار امیر قزغن کو ایک آڑیا بزرگ کی حیثیت سے عزت دیتا تھا۔ انہیں بھی علم تھا کہ امیر قزغن اب پہلے جیسا طاقتور نہیں تھا لیکن وہ اسے ایک ایسی آڑ سمجھتے تھے جس کے باعث وہ قبائلی جھگڑوں اور عصبیتوں سے محفوظ تھے۔ کہیں دو قبیلوں میں جھگڑا ہوتا تو امیر قزغن فوراً دونوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر ٹھنڈا کر دیتا۔ اس کا حکم مانا جاتا اور اس کا فیصلہ حرفِ آخر ہوتا لیکن عمر کے ساتھ ساتھ یہ رسی کمزور پڑتی جا رہی تھی۔

''مجھے سارا دکھ اس بات کا ہے کہ یہ کم بخت میرے دیے ہوئے قول کو جھٹلانا چاہتے ہیں۔ اگر والئ ہرات ان کے ہاتھوں مارا گیا تو میں کسی تاتاری سردار کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہ رہوں گا۔ اہل ہرات ہمیں کبھی معاف نہ کریں گے اور ہماری سرحد جنگ کا مستقل اکھاڑا بن جائے گی۔

تیمور نے امیر قزغن کی پریشانی محسوس کر لی اور ادب سے بولا۔

اے حاکم سمرقند۔ آپ بالکل دل برداشتہ نہ ہوں۔ کسی کی مجال نہیں کہ آپ کے حکم کی سرتابی کرے۔ اگر کسی نے والئ ہرات پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کی تو اسے میں ایسی سزا دوں گا کہ تمام تاتاریوں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔''

''شاباش تیمور!......''

امیر قزغن نے خوش ہوتے ہوئے بولا۔

''سچ تو یہ ہے کہ اب میں تیرے ہی بھروسے پر سلطنت کا کام چلائے جا رہا ہوں۔ ورنہ میں جانتا ہوں کہ میرے سرداردل سے نہ تو میری عزت کرتے ہیں اور نہ ہی مجھے پہلے جیسا طاقتور سمجھتے ہیں۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولا۔

''تیمور!...... !تو نے کبھی مجھ سے ایک خواہش کا اظہار کیا تھا۔''

تیمور فوراً ہی اس کی بات نہ سمجھ سکا اور بولا۔

''اے امیر! آپ کی نوازش سے مجھے سب کچھ مل گیا ہے۔ اب مجھے آپ کی زندگی سے زیادہ کوئی طلب نہیں ہے۔''

امیر قزغن کی شفقت اور محبت چھلک پڑی۔

''تیمور! تو نے ایک بار خواہش کی تھی کہ بکھرے ہوئے قبائل کی شیرازہ بندی کی قیادت میں تیرے سپرد کردوں۔ میں نے اس وقت تجھے ٹال دیا تھا لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ میں یہ اعزاز تیرے سپرد کردوں۔ میں نے تجھ میں دو خوبیاں محسوس کی ہیں جو ایک قائد اور حاکم میں ہونی چاہئیں۔''

اے امیر!...... میں نے خواہش ضرور کی تھی لیکن میں کسی کا حق نہیں مارنا چاہتا۔ آپ کا پوتا علی حسین یعنی الجائی خاتون کا بھائی کابل میں موجود ہے اور بیٹا عبداللہ سرائے سالی میں............''

امیر تیمور نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میں نے ابھی کہا تھا کہ عنانِ حکومت وہی سنبھال سکتے ہیں جو تلوار پکڑنا جانتے ہوں۔ اس وقت تلوار تیرے ہاتھ میں ہے لہٰذا عنانِ حکومت پر بھی تیرا حق ہے۔

تیمور نے کوئی جواب نہ دیا اس کا دل خوشی سے لبریز ہو رہا تھا۔

''تیمور!...... میں سب سے پہلے والئ ہرات کے عذاب سے چھٹکارا پانا چاہتا ہوں۔ یہ عزت و آبرو سے اپنے ملک پہنچ جائے تو میں سمجھوں گا کہ میرا وقار برقرار ہے۔''

''یہ خدمت آپ میرے سپرد کیجئے۔ میں ایک ایک امیر کو سمجھ لوں گا۔''

''اس طرح نہیں تیمور''

امیر قزغن نے نرمی سے کہا۔

''یہ جوش کی باتیں نہیں۔ بعض اوقات جوش کو ہوش کے تحت رکھا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔''

''جس طرح آپ مناسب سمجھیں حکم فرمائیے۔ میں تعمیل کے لیے حاضر ہوں۔''

''اس سلسلے میں میں کئی دنوں سے غور کر رہا ہوں۔''

امیر قزغن نے اپنے منصوبے کا انکشاف کیا۔

''میں جنوب میں شکار پر جانے کا اعلان کرتا ہوں تم اپنے پچاس جانبازوں کو تیار رکھو جس صبح کو ہماری روانگی ہونے والی ہوگی اس شب کو تم والئ ہرات کو اپنے ساتھ لے کر خاموشی سے سرائے سالی سے نکل جاؤ۔ تمام لوگ شکار کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے۔ والئ ہرات کی طرف کسی

کی توجہ نہ ہوگی۔ اگر تم رات بھر بخیریت سفر کر گئے تو والیٔ ہرات خطرے سے باہر ہو جائے گا اور کوئی تمہاری گرد کو بھی نہ پہنچ سکے گا باغی امیر چیخ چلا کر رہ جائیں گے۔ پھر یہ بات رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گی۔"

تیمور کو یہ بات پسند آئی اور اس نے دل میں امیر قزغن کی فراست کی داد دی اور بولا۔

"میں تو آپ کے حکم کا پابند ہوں۔ جس طرح آپ نے فرمایا ہے انشاء اللہ اسی طرح ہوگا۔"

امیر قزغن نے سرائے سالی سے جنوب کی طرف روانگی کا اعلان کر دیا۔ بہانہ شکار کا تھا۔ تاتاری خوش ہو گئے۔ وہ جنگ جدل کے عادی تھے۔ فطرتاً جنگجو تھے۔ کچھ دن لڑائی نہ ہوتی تو ان کی طبیعت مکدر ہونے لگتی۔ شکار میں انہیں مصروف ہونے کا موقع ملتا تھا اور لاشعور کی تسکین ہوتی تھی۔

خیمے اور سامانِ خورد و نوش گاڑیوں پر لاد دیا گیا۔ صبح کو روانگی تھی۔ ساتھ لے جانے والے لشکر کی نامزدگی ہو گئی تھی۔ وہ پوری طرح تیار ہو گیا تھا۔ جو تیاری باقی تھی وہ رات بھر ہوتی رہی۔

خیمہ گاہ میں لوگ تمام رات جاگتے رہے اور خوب چہل پہل رہی۔ تیمور کے پچاس جوان اس جگہ پہنچ گئے جس کی نشاندہی تیمور نے پہلے ہی کر دی تھی۔ ہر طرف گھوڑے بھاگتے پھرتے تھے۔ کسی نے توجہ نہ کی کہ یہ پچاس سوار ایک جگہ کیوں جمع ہوئے ہیں۔

نصف شب کے بعد امیر قزغن نے والیٔ ہرات کو فی امان اللہ کہا اور اسے گلے لگا کر رخصت کیا۔ تیمور والیٔ ہرات کو خیموں کے پیچھے سے اس جگہ لے آیا جہاں اس کے سوار موجود تھے۔ تیمور اور والیٔ ہرات کے لیے گھوڑے تیار تھے۔ دونوں اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور باگیں ہرات کی طرف موڑ دیں۔ پچاس محافظ سوار ایک ایک کر کے ان کے پیچھے آ گئے۔

تیمور رات بھر برق رفتاری سے سفر کرتا رہا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ تیمور کو باقی امیروں کا کوئی ڈر نہ تھا۔ اس کے ساتھ پچاس چیدہ چیدہ محافظ تھے۔ اسے امید تھی کہ اگر پانچ سو باغی امیروں نے بھی اسے گھیرنے کی کوشش کی تو وہ بچ کر نکل جائے گا۔ مگر تیمور کو والیٔ ہرات کی فکر تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ والیٔ ہرات کو خراش تک نہ آئے۔ اسی میں اس کی کامیابی اور عظمت تھی۔ لڑائی کی صورت میں والی ہرات کے زخمی ہونے کا خطرہ تھا اسی وجہ سے تیمور لڑائی سے بچنا چاہتا تھا۔

صبح ہوتے ہی سرائے سالی میں کہرام مچ گیا۔

والیٔ ہرات بھاگ گیا۔

ہر ایک کی زبان پر یہی جملہ تھا۔ باغی بپھر گئے۔ انہیں امیر قزغن پر سخت غصہ آیا۔ کئی سو سوار امیر قزغن کے دروازے پر آ گئے۔ امیر قزغن کو اس کا پہلے سے اندازہ تھا اور اس نے اس کا بندوبست بھی کر رکھا تھا۔

امیر قزغن کے باہر نکلنے سے پہلے ہی اس کا ایک ہزار سواروں کا خاص محافظ دستہ دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ امیر قزغن آنکھیں ملتا یوں باہر آیا جیسے اسے کسی بات کی خبر ہی نہ ہو۔ اسے دیکھتے ہی ایک باغی امیر آگے بڑھ کر بولا۔

"والیٔ ہرات کہاں ہے امیر قزغن۔"

امیر قزغن نے نظر گھما کر چاروں طرف دیکھا۔ اس کا محافظ دستہ تلواروں کے قبضے پر ہاتھ رکھے حکم کا منتظر تھا۔ اس نے پر سکون لہجے میں کہا۔

''والیٔ ہرات ہمارا مہمان تھا۔ تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''تم نے اسے بھگا دیا ہے امیر۔'' باغی امیر نے تند لہجہ اختیار کیا۔

امیر قزغن نے ہونٹ سکوڑے۔ آنکھ دبائی اور شیر کی طرح دھاڑا۔

''تم کون ہوتے ہو مجھ سے سوال کرنے والے۔ ملک معزالدین حسین اپنی مرضی سے سرائے سالی آیا تھا اپنی مرضی سے واپس چلا گیا۔ وہ تمہارا قیدی نہیں تھا اور نہ ہی میں تمہارا غلام ہوں۔ مہمان کو رخصت کرنے کے لیے مجھے تمہاری اجازت کی ضرورت نہیں تھی۔''

باغی امیر بڑا ڈھیٹ تھا۔ امیر کے سخت لہجے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔

''یہ تم نے اچھا نہیں کیا امیر قزغن!...... اس وقت وہ ہمارے ہاتھ سے بچ گیا ہے لیکن ہم اسے زندہ نہ چھوڑیں گے۔''

امیر قزغن کو غصہ تو بہت آیا لیکن اس نے بات کو بڑھانا مناسب نہ سمجھا۔ نرمی اختیار کرتے ہوئے بولا۔

''تم تاتاریوں کو آخر یہ کیا ہو گیا ہے تم اپنی روایات اور قبائلی قوانین کو کیوں بھول گئے ہو۔ والیٔ ہرات، ہرات سے چل کر سرائے سالی آیا تھا۔ چل کے آنے والا مہمان ہوا کرتا ہے۔ تاتاری اپنے مہمانوں کو سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ اس نے اپنی جان ہمارے ہاتھ میں دے دی۔ اگر ہم اسے قتل کر دیتے تو دنیا کیا کہتی تاتاری بدنام نہ ہو جاتے۔ سب یہی کہتے کہ مہمان کو گھر بلا کر قتل کر دیا۔''

امیر قزغن کی تقریر پُر اثر تھی۔

باغی امیر لاجواب ہو گئے۔ اٹھتا ہوا طوفان تھم گیا۔ تلواریں نیام سے باہر نہ آئیں اور تیر ترکش میں ہی رہ گئے۔

امیر قزغن نے موقع غنیمت جان کر فوراً روانگی کا نقارہ بجوا دیا۔ لوگوں کی توجہ سفر اور شکار کی طرف ہو گئی۔ تاہم بعض امرائے دربار والیٔ ہرات کی رہائی کے معاملے میں امیر قزغن کے خلاف ہو گئے اور اسی فتنے نے آگے چل کر کچھ ایسی صورت حال اختیار کر لی کہ جس سے تاتاریوں کو ناقابلِ برداشت نقصان پہنچا۔ نہ صرف فتوحات کا سلسلہ رک گیا بلکہ موجودہ حکومت کے تانے بانے میں ایسا جھول پیدا ہو گیا جس نے سمرقند کی مستحکم قوت کو ہلا کر رکھ دیا۔

امیر قزغن بے حد عقل مند حکمران تھا۔ اس نے اپنے درباری امراء کے بگڑے ہوئے تیوروں کے پیچھے چھپے ہوئے فتنے کی جھلک دیکھ لی تھی۔ دریائے آمو عبور کر کے جب وہ شکار گاہ میں داخل ہوا تو اس نے اپنی ذاتی حفاظت کی تمام تدابیر پیش نظر رکھیں کہ کہیں ایسا نہ ہو شکار کھیلتے کھیلتے وہ خود ہی کسی کا شکار ہو جائے لیکن تاتاریوں کی قسمت کھڑی مسکرا رہی تھی۔

☆

تیمور والیٔ ہرات معزالدین حسین کو لے کر خیریت سے ہرات پہنچ گیا۔ اس کا جسم تو ہرات میں تھا لیکن دل سرائے سالی میں لگا تھا۔ باغی امیروں کی طرف سے اسے اطمینان نہ تھا اگر والیٔ ہرات کو پہنچانے کی ذمہ داری نہ ہوتی تو وہ امیر قزغن کو کبھی تنہا نہ چھوڑتا۔ امیر قزغن چاروں طرف

سے دشمنوں میں گھرا ہوا تھا اور اسے تیمور جیسے وفادار رفیق کی ضرورت تھی۔

ہرات پہنچتے ہی اس نے سرائے سالی واپس جانے کا ارادہ کیا لیکن والئ ہرات اتنا بے مروت اور احسان فراموش نہ تھا کہ وہ تیمور کو واپس جانے کی اجازت دے دیتا۔ ہرات کی رعایا اور امراء اپنے والی کے لیے دعائیں مانگ مانگ کر اس کی واپسی کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ والئ ہرات یوں اچانک ہرات پہنچا تو ان کی خوشیوں کی انتہا نہ رہی۔ انہوں نے اظہارِ تشکر کے لیے ایک جشن ترتیب دے ڈالا۔

ایک ہفتے کے اس جشن میں اظہارِ مسرت کے جتنے بھی طریقے ممکن تھے۔ شامل کر لیے گئے۔ تیمور نے والئ ہرات کی خاطر تمام چیزوں میں شرکت کی مگر بجھے بجھے دل سے۔ اسے کوئی چیز اچھی نہ لگتی تھی۔ اسے رہ رہ کر خیال آتا کہ اس نے امیر قزغن کو تنہا چھوڑ کر سخت غلطی کی ہے مگر اب کیا ہو سکتا تھا جشن کے اختتام تک اسے بہر صورت ہرات میں ٹھہرنا تھا۔

والئ ہرات اس کی خاطر مدارت میں دل اور آنکھیں فرشِ راہ کر رہا تھا۔ تیمور اس کا محسن تھا اس کے ذریعے والئ ہرات کو دوسری زندگی ملی تھی ورنہ اہل ہرات تو اس کی واپسی سے ناامید ہونے لگے تھے۔ حتیٰ کہ تیسرے روز والئ ہرات کے ساتھ اپنے شہر سبز اور سرائے سالی کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا کہ اسے سرائے سالی سے آنے والے ایک سوار کی اطلاع دی گئی۔

تیمور اتنا پریشان ہوا کہ اسے اندر بلانے کی بجائے خود بھاگ کر باہر چلا گیا۔ والئ ہرات اس کے پیچھے دوڑا۔ باہر نکل کر تیمور نے دیکھا کہ اس کا خانہ زاد غلام عبداللہ اندر آنے کے لیے پہرے داروں سے جھگڑ رہا ہے۔ تیمور نے اسے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ عبداللہ کے چہرے پر گرد و غبار کے علاوہ غم کے سائے بھی لہرا رہے ہیں۔

تیمور نے دور ہی سے سوال کیا۔

''عبداللہ! خیریت تو ہے۔''

عبداللہ نے نظریں اٹھا کر تیمور کو دیکھا پھر پژمردہ لہجے میں بولا۔

''شکارگاہ میں امیر قزغن کو قتل کر دیا گیا۔''

عبداللہ کا یہ جملہ تیمور کے کانوں سے گزر کر دل میں اترتا چلا گیا۔ پھر بھی اس نے خود کو ہمت کر کے سنبھالا اور پوچھا۔

''قاتل پکڑے گئے؟''

''نہیں آقا!......وہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔''

''کسی نے انہیں پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔'' تیمور تقریباً چیخ کر بولا۔

''تعاقب جاری ہے آقا۔''

عبداللہ نے مری ہوئی آواز میں کہا۔

''کچھ سرداران کے پیچھے شمالی کوہستان کی طرف گئے ہیں۔''

PDF BY MANZOOR

تیمور نے والیٔ ہرات کو مخاطب کیا۔

''اب مجھے مت روکنا برادر۔''

والیٔ ہرات یہ خبر سن کر خود بھی پریشان ہو گیا تھا۔ امیر قزغن اس کا حلیف بن گیا تھا اس کے مرنے کے بعد تاتاری پھر ہرات پر حملہ آور ہو سکتے تھے۔ اسے اپنی اور ہرات کی فکر پڑ گئی تھی۔ تیمور نے اس کے چہرے سے اس کے خیالات کا اندازہ لگا لیا اور کہا۔

''پریشان نہ ہو ملک۔ تاتاری اب ادھر کا رخ نہیں کریں گے۔ اگر ضرورت ہوئی تو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔''

والیٔ ہرات نے متشکر نظروں سے تیمور کو دیکھا۔ پھر ایک غلام کو تیمور کا گھوڑا لانے کے لیے اشارہ کیا۔ تیمور کا گھوڑا آ گیا تو اس نے ہرات میں مقیم تاتاری سواروں کو سرائے سالی چلنے کا حکم دیا اور خود گھوڑے پر سوار ہو کے شکارگاہ کی طرف چل دیا۔ اس کے ساتھ صرف اس کا وفادار غلام عبداللہ تھا۔ والیٔ ہرات نے جشن کی باقی تقریبات منسوخ کر کے امیر قزغن کا سوگ منانے کا اعلان کر دیا۔

امیر قزغن کے قتل ہوتے ہی سرداروں نے سمجھ لیا کہ اب ایک طویل خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ قزغن کا کوئی جانشین نہیں تھا اور سوائے تیمور کے تاتاریوں میں کوئی ایسا سردار نظر نہیں آتا تھا جو تمام تاتاریوں کو زیر کر کے سمرقند کی حکومت سنبھالے۔

کچھ سرداروں نے اس سلسلے میں تیمور سے رابطہ بھی قائم کیا لیکن تیمور جانتا تھا کہ ہوا کا رخ اس کے مخالف ہے۔ حاجی برلاس اور بایزید جلائر اس کے دشمن ہیں۔ اس نے فی الحال حکومت سمرقند کا سودا اپنے سر سے نکال دیا۔

انھی دنوں اسے خبر ملی کہ تاتاری سردار اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ کے جانبازوں اور بہادروں کو اپنے اپنے جھنڈے تلے جمع کر رہے ہیں۔ انہوں نے یہ قدم حفاظتِ خود اختیاری کے لیے اٹھایا تھا لیکن پس پردہ یہ خیال بھی تھا کہ طاقت حاصل ہوتے ہی وہ دوسروں کے علاقے تاراج کریں گے۔ جیسا کہ تاتاریوں میں عام حالات میں ہوا کرتا تھا۔

تیمور نے حالات کو اس نہج پر دیکھا تو اپنے طور پر ایک نہایت دانش مندانہ قدم اٹھایا۔ وہ شہزادے کو لے کر سمرقند پہنچا اور عبداللہ کو حاکم سمرقند بنانے کا اعلان کر دیا۔

اس خبر کو سن کر تمام تاتاری سردار حیران رہ گئے۔ ان کا خیال تھا کہ تیمور خود سمرقند پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ دانشوروں کے مطابق تیمور کا یہ قدم قومی جذبے کا ترجمان تھا اور ذاتی مفاد کی ایک زبردست قربانی تھی۔ سب جانتے تھے عبداللہ ایک انتہائی کمزور حکمران ثابت ہو گا جسے وہ بڑی آسانی سے ہٹا سکتے تھے لیکن یہ اسی وقت ممکن تھا جب تمام سردار اپنے میں سے کسی ایک سردار کو اعلیٰ تسلیم کرنے پر رضا مند ہو جاتے۔ یہ اعزاز صرف تیمور کو دیا جا سکتا تھا لیکن حاجی برلاس اور بایزید جلائر کی موجودگی میں یہ بات ناممکن تھی۔ سب سے پہلے تیمور نے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا اعلان کیا۔ پھر عالقہ ارہنگ کا سردار کیخسرو اپنے دستوں کے ساتھ سمرقند پہنچ کر عبداللہ کی حاکمیت کا مطیع ہوا۔ علاقہ شبرخان کے سردار محمد خواجہ نے بھی عبداللہ کی اطاعت میں دیر نہ کی اور اپنے دستوں کے ساتھ سمرقند پہنچ گیا۔ بدخشاں کے سردار ختلان اور سرپول کے سردار خطیر کیسوری نے بھی عبداللہ کو سردار اعلیٰ اور حاکم سمرقند تسلیم کر لیا۔ بلخ کا حاکم سلوروز انتہائی بونمائی تھا۔ اس کی بھاوج' لڑکی ملکوتی اور عبداللہ بھی بلخ پہنچ گئے تھے۔ سلوروز بڑی حد تک

PDF BY MANZOOR

گوشہ نشین ہو چکا تھا۔ گم شدہ بھاوج کو پا کر اس نے اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ ملکوتی کی ماں نے دیور کو خلوصِ دل سے معاف کر دیا۔ عبداللہ اور ملکوتی اس کا سہارا بن گئے۔

سلوور کی صحت بھی اب خراب ہو گئی تھی۔ وہ سفر کے قابل بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنے قبیلے کے سرداروں کو اکٹھا کر کے حالات سے آگاہ کیا اور اپنی جگہ عبداللہ کو نامزد کر دیا۔

قبیلہ اوجائی بونمائی ایک صلح پسند قبیلہ تھا۔ اس نے بلا عذر عبداللہ کو سردار تسلیم کر لیا۔ چنانچہ عبداللہ نے دربار سمرقند میں پہنچ کر بلخ کی نمائندگی کی۔ عبداللہ، تیمور کے ماتحت رہ چکا تھا اور اس کے دل میں تیمور کا بے حد احترام تھا لہٰذا اس نے تیمور کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ جب پانچ تاتاری قبیلوں نے سمرقند کے نئے حاکم کو تسلیم کر لیا تو بایزید جلائر اور حاجی برلاس کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ وہ بھی شہزادے عبداللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیں۔ انہوں نے مصلحتاً حالات سے سمجھوتہ کیا اور اظہارِ اطاعت کے لیے سمرقند پہنچ گئے۔

PDF BY MANZOOR

ختم شد

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے، ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔

اگر آپ ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود ADs کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے، آپ کی یہی مدد کافی ہوگی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بنا سکتے ہیں۔